سہ ماہی

فیضانِ ادب

ایک بین الاقوامی علمی، ادبی اور تحقیقی جریدہ

جلدنمبر 4 شمارہ 2

اپریل تا جون 2019ء

مدیر

فیضان حیدر

ادارۂ تحقیقات اردو و فارسی، پورہ معروف، کرتھی جعفر پور، مئو، یوپی 275305

Quarterly

FAIZAN-E-ADAB

An International Refereed Research Value Journal

Vol. IV Issue: II

April to June 2019

ISSN: 2456-4001

قیمت : فی شمارہ:۱۵۰/روپے، سالانہ:۵۰۰/روپے، پانچ سال کے لیے:۲۰۰۰/روپے

نوٹ : ’فیضان ادب‘ کی سالانہ خریداری کے لیے چک یا ڈرافٹ پر صرف فیضان حیدر لکھیں۔ یہ رقم بینک ٹرانسفر یا ادارے کی ویب سائٹ www.uprorg.in کے ذریعے بھی روانہ کی جاسکتی ہے۔ تخلیقات یا مضامین faizaneadab@gmail.com پر روانہ کریں۔

آن لائن رقم ٹرانسفر کرنے کی تفصیل:

Name: Faizan Haider, Account No. 33588077649, State Bank of India, Branch: Maunath Bhanjan (Shahadatpura), IFSC: SBIN 0001671,

---

اونر، پرنٹر، پبلشر اور ایڈیٹر فیضان حیدر نے اسکرینو پرنٹرس، فاروقی کٹرہ، صدر بازار، مئو ناتھ بھنجن، مئو سے چھپوا کر ادارۂ تحقیقات اردو و فارسی، پورہ معروف، کرتھی جعفر پور، ضلع مئو، یوپی 275305 سے شائع کیا۔

فہرست

تحقیق وتنقید

عنوان	مصنف	صفحہ
مدیر کے قلم سے	فیضان حیدر	5
اردو شاعری پر فارسی شاعری کے اثرات	عراق رضا زیدی	7
نئے افسانے میں واقعات کربلا کی عکاسی	عابد حسین حیدری	15
فارسی کے جام جم ڈاکٹر سید حسن عباس	نورالسعید اختر	29
تقسیم ہند اور منٹو و بیدی کا پر درد تخلیقی بیانیہ	محبوب حسن	40
اقبال سہیل کی قصیدہ نگاری کے چند محاسن	وسیم حیدر ہاشمی	48
اردو کی موجودہ صورتِ حال: ایک جائزہ	سحر افروز	54
مزاحیہ ادب وصحافت پر 'اودھ پنچ' کے اثرات	سید الفت حسین	60
ترقی پسند ناولوں کے سماجی سروکار	محمد جاوید	72
فاخری کے افسانوں میں معاشرتی اقدار کا زوال	محمد سیف الاسلام	80
صادقہ نواب سحر عصرِ حاضر کی ایک ممتاز فکشن نگار	عشرت رسول	89
اردو ناول: سمت ورفتار	فردوس تقی	94
مرزا دبیرؔ کا فارسی نوحہ	یاسر عباس	100
فارسی شاعری پر عربی شاعری کے اثرات اور اردو شعرا کی تقلید	سید حسن سردار	106
جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد میں کشمیر میں فارسی ادب	مشتاق حسین	112
بدایوں کا ایک غیر مطبوعہ تذکرۂ صوفیہ	انوار صمدانی	120
'ندوۃ العلما' ایک دبستان ادب	محمد مشرف خان	128

عنوان	مصنف	صفحہ
ڈاکٹر شکیل اعظمی کی شاعری کا اجمالی تعارف	ظفر الاسلام	133
گیان چند جین بحیثیت محقق	معین عارف	137

نقش ہائے رنگ رنگ

عنوان	مصنف	صفحہ
معروف افسانہ نگار سلمیٰ صنم سے ایک گفتگو	محمود احمد کاوش	141
قصیدہ در منقبت فاطمہ زہرا (ص)	ارشاد حسین	147
غزلیں	ارشاد حسین	147

قند مکرر

عنوان	مصنف	صفحہ
مثنوی 'چراغ دیر'	اسداللہ خان غالبؔ / فیضان حیدر	149

طاق نسیاں سے

عنوان	مصنف	صفحہ
مثنوی 'توشۂ راہ'	مولوی انور شاہ کشمیری / فیضان حیدر	159

تعارف وتبصرہ

عنوان	مصنف	صفحہ
'پرواز سخن' (کلام عبداللہ نصرؔ)	فیضان حیدر (معروفی)	185
'سب رس'	فیضان حیدر (معروفی)	187
'یہ زمین'	فیضان جعفر علی	189
'یہ آب وہوا'	فیضان جعفر علی	189
'یہ پیڑ پودے'	فیضان جعفر علی	190
'یہ مہینے اور موسم'	فیضان جعفر علی	191
'یہ جسم وجاں'	فیضان جعفر علی	191
'یہ بدن کے حصے'	فیضان جعفر علی	192

مدیر کے قلم سے

’ادارۂ تحقیقات اردو و فارسی‘ کی یہ شروع سے ہی کوشش رہی ہے کہ ’فیضان ادب‘ میں پختہ قلم کاروں کے ساتھ نوآموز قلم کاروں کی تحریروں کو بھی شامل کیا جائے تا کہ ان میں موجود تخلیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کو نکھرنے کا بھرپور موقع فراہم ہو سکے نیز ان کا علمی و ادبی ذوق و شوق برقرار رہے۔ لیکن اس امر کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا کہ مضامین منتخب اور عمدہ ہوں نیز نئے تناظر کے پیش نظر لکھے گئے ہوں۔

تا ہم ’فیضان ادب‘ میں شائع ہونے والے مضامین کے انتخاب اور معیار سے ہنوز ادارہ مطمئن نہیں ہے۔ کیوں کہ ہزار کوششوں کے باوجود بعض مضامین کی نوعیت بالکل رسمی ہوتی ہے اور بعض ایسے فرسودہ موضوعات پر مشتمل ہوتے ہیں جن پر نئے زاویے سے غور و فکر کی ضرورت ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ہمارے نئے قلم کاروں میں تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں کا فقدان ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ ان کی سہل انگاری ان کے لیے سدّ راہ ہوتی ہے۔ ہماری یہ کوشش رہتی ہے کہ جریدے کے معیار و میزان سے کسی طرح سمجھوتہ نہ کیا جائے۔ اس لیے مضامین کے انتخاب و ترتیب میں احتیاط سے کام لیا جاتا ہے تا کہ اعتدال و توازن برقرار رہے۔

قلم کار حضرات اول تو فرسودہ اور تکراری عنوانات کو موضوع بحث نہ بنائیں اور اگر بنائیں بھی تو ان میں کوئی نہ کوئی ایسا پہلو تلاش کرنے کی کوشش کریں جو عام نظروں سے پوشیدہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کا پروف اچھی طرح دیکھ لیں، کیوں کہ بعض اقتباسات اور اشعار کے اصل متن تک رسائی میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مابعد جدیدیت کے زیر اثر شعری اور نثری تخلیقات کے ساتھ تحقیقی اور تنقیدی تحریروں میں تنوع، نئے انداز بیان، ہیئت اور اسلوب میں بھی ہمہ گیری پیدا ہوئی ہے۔ ایسے ماحول میں نئے قلم کاروں کے لیے تن تنہا مواد کے ساتھ ساتھ زبان و بیان اور اسلوب پر محنت کرنا لوہے کا چنا چبانے کے مترادف ہے۔ مگر انھیں اس چیلنج کا بہر حال مقابلہ کرنا ہے۔

تعلیم گاہوں میں زیر تعلیم طلبہ اپنے تحقیقی و تنقیدی مضامین اور تخلیقات بلا تکلف ادارے کو ارسال کریں۔ ہم ان میں سے منتخب تحریریں جریدے میں شامل کریں گے۔ تخلیقات کی اشاعت کے سلسلے میں انتخاب کا حق ادارے کے پاس محفوظ ہے۔ اس سلسلے میں کسی طرح کی کوئی سفارش قابل قبول نہ ہوگی۔

’فیضان ادب‘ کا نیا شمارہ قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔ اس میں ’تحقیق و تنقید‘ کے ضمن میں اردو اور فارسی زبان و ادب سے شغف رکھنے والوں کے ذوق کی سیرابی کے لیے قابل ذکر مواد موجود ہے۔ اسی طرح ’نقش ہائے رنگ رنگ‘ کے تحت ڈاکٹر محمود احمد کاوش کے ذریعہ سلمیٰ صنم سے لیا گیا ایک اہم انٹرویو شامل ہے۔ ’قند مکرر‘ کے تحت مرزا غالبؔ کی مشہور زمانہ فارسی مثنوی ’چراغ دیر‘ شامل کی گئی ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اس مثنوی کا صرف اصل متن تعارفی مقدمہ کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ کیوں کہ اس کے درجن بھر منظوم و منثور اردو تراجم ہو چکے ہیں اور ان میں سے اکثر بازار میں دستیاب بھی ہیں۔

’طاق نسیاں سے‘ کے ضمن میں مولوی محمد انور شاہ انورؔ کی فارسی مثنوی ’توشۂ راہ‘ مع اردو ترجمہ اور تعارفی مقدمہ شامل کی گئی ہے۔ موصوف فارسی کے ایک کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر تھے۔ یہ مثنوی ان کا منظوم سفر نامہ ہے جو زبان و بیان کی پختگی اور زور بیان کی وجہ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ امید قوی ہے کہ اس شمارے کے مشمولات بھی قارئین کو پسند آئیں گے اور ان کے علمی اور ادبی ذوق و شوق کی آبیاری میں معاون ثابت ہوں گے۔

فیضان حیدر

اردو شاعری پر فارسی شاعری کے اثرات

عراق رضا زیدی

خدا کے نام سے کرتا ہوں فکر کا آغاز
وہی ہے اعلم و اعظم، اسی سے راز و نیاز

اردو غزل فارسی زبان وادب سے منتقل ہونے والی ہر دل عزیز صنف سخن ہے۔ کہنے کو تو یہ صنف عربی زبان کے قصیدے کی تشبیب سے حاصل کی گئی ہے، لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ عربی زبان کی کوئی روایت بھی فارسی غزل پر اپنی چھاپ نہیں چھوڑ سکی۔ حالاں کہ فتح قادسیہ اور نہاوند کے بعد تقریباً دو سو سال تک عربوں نے اہل فارس کی کسی روایت کو پنپنے نہیں دیا۔ یہاں تک کہ فارسی ادب کا تمام قدیمی سرمایہ 'اوستا' کے چند حصوں اور کتبوں کے علاوہ معدوم ہو گیا۔

جب ہارون رشید کے وارثان امین رشید جس کی ماں عرب تھی اور مامون رشید جس کی ماں ایرانی تھی، میں جنگ وجدال کا بازار گرم ہوا تو یہ جنگ دوبارہ عربوں اور ایرانیوں کی جنگ کی شکل اختیار کر گئی، جس میں ایرانیوں کو کامیابی حاصل ہوئی اور ۲۰۵ھ میں طاہر یہ خاندان نے آزادانہ حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تو فارسی زبان کا بھی دوبارہ احیا ہوا۔ ایرانی شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں نے عربی زبان کے شانہ بہ شانہ فارسی زبان وادب کی آبیاری کا بیڑا اٹھایا۔ یہی وجہ ہے کہ قصیدہ، قطعہ، مرثیہ وغیرہ عربی زبان سے جوں کی توں فارسی میں داخل ہو گئیں۔ یہاں تک کہ نظام عروضی بھی عربی زبان سے ہی مستعار لیا گیا۔ اس حقیقت کے باوجود اہل فارس نے نئی نئی کاوشیں کیں جن کے نتیجے میں مثنوی، رباعی، تاریخ گوئی اور مستزاد جیسی اصناف سخن فارسی کا اپنا اثاثہ بن کر اس طرح سامنے آئیں کہ اہل عرب نے بھی فارسی شاعری کی ان اصناف کو عربی شاعری میں استعمال کرنے کی کوششیں کیں۔ ایرانیوں نے عربی غزل کو فارسیانے کی کامیاب کوشش کی اور اپنی جدت پسندی کے زور پر اس کی ہیئت میں ایک ایسا اضافہ کیا جس نے فارسی

غزل کو عربی سے جدا کر کے ایک نئی شناخت پیدا کی۔

غزل کا نام سنتے ہی ذہن میں چار عنصر غزل کو پیکر میں ڈھالتے نظر آتے ہیں۔ (۱) مطلع (۲) ہر شعر میں ایک نئے آزاد مضمون کا موزوں ہونا۔ (۳) ہر شعر کا مطلع میں استعمال کیے گئے قافیوں کے زیر اثر جداگانہ قوافی سے مزین ہونا۔ (۴) مقطع

متذکرہ چار عنصر میں سے پہلے میں تو وہی ہیں جو عربی غزل میں رائج تھے البتہ بطور مقطع فارسی کے شعرا نے ایک ایسی جدت پیش کی جس نے فارسی غزل کو عربی غزل سے بطور ہیئت بھی جداگانہ شناخت عطا کی۔ کیونکہ عربی غزل میں تخلص کے استعمال کی کوئی روایت نہیں ملتی۔ عربی میں مقطع کا مطلب ہے اب تخیل اور مضامین کی آمد کا سلسلہ قطع ہو گیا۔ اس کے برعکس فارسی غزل کے اس آخری شعر کو مقطع کہا جاتا ہے جس میں شاعر اپنے تخلص کا استعمال کرتا ہے۔ یہی مقطع کی روایت اردو غزل کا ایک اہم سرمایہ بھی ہے۔

غزل روز اول سے ہی جذباتی اور ذہنی تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھنے کی بنا پر ہمارے معاشرے کا ایک اہم جز بن گئی۔ یہ ہماری تہذیبی روایت کا ایک حصہ ہے جسے ایرانی تہذیبی روایات نے ایک خاص ماحول میں پیدا کیا تھا۔ ایرانی مذاق، نفاست و لطافت اور حسن کی کرم فرمائیوں کے ساتھ ساتھ ایک جذباتی زاویۂ نظر عشق و عاشقی کی جانب گامزن کرتا ہے۔

غزل اظہار عشق کا نام ہے اور عشق صرف خوبصورت عورتوں یا لڑکیوں سے ہی محبت کا نام نہیں ہے بلکہ ایک ادیب یا شاعر اپنے قلم سے، ایک سپاہی اپنی تلوار سے، ایک جواری اپنے پانسوں سے، ایک کسان اپنی کھیتی سے اور مزدور اپنے کام سے عشق کرتا ہے۔ عشق ایک آفاقی کیفیت کا نام ہے لیکن ہر عشق کرنے والے کو گل و گلزار سے ایک گہرا لگاؤ ضرور ہوتا ہے۔ گل و گلزار کا جو تصور اور قدرتی انتظام ایران میں ہے وہ دوسرے ملکوں میں کم ہی نظر آتا ہے۔ بقول محمد حسین آزاد:

> ''ایران ایک قدرتی بہشت ہے۔ وہاں جن چیزوں کی بہتات ہے وہی اس کی انشا پردازی کا سامان ہے۔ گل وبلبل، سبزہ، شبنم، برف، اولے، مرغزار، آب رواں، گلشن چمن، درخت چمن، جوانان چمن، مرغان چمن، نغمہ سنجان چمن وغیرہ وغیرہ ان ترکیبوں میں ہزاروں نازک اور لطیف خیالات ادا کرتے ہیں۔''
> (سخندان فارس، ص ۱۸۳)

حقیقت تو یہ ہے کہ فارسی غزل خرابات میں معشوق کو بلانے کا سلیقہ، دنیا کی نگاہوں سے دور ساقی کے ساتھ بیٹھ کر دو چار گھونٹ پینے کا انداز سکھاتی ہے۔ رند، غنچہ، سرو، صنوبر، گل، لالہ، جام جم، جام پیالہ،

صراحی، غزالاں، عشق حقیقی، مجازی، معنوی اور نہ جانے ایسی ہی کتنی اصطلاحات، الفاظ اپنے محدود معنی کو وسعت دینے اور رنگینیاں بکھیرنے اور تہ در تہ پرتیں کھولنے کا ہنر سکھاتی ہے۔ غزل معاشرے کو آئینہ دکھانے، واعظ و راہبر کی اندرونی کیفیت سے خبردار کرنے کا وسیلہ بھی بنتی ہے۔

فارسی غزل کا میدان لامحدود ہے۔ اس کا رشتہ فنون لطیفہ کے مختلف منبروں اور مشاہدات سے نہایت گہرا اور نزدیکی رہا ہے۔ سکون، سکوت، جدوجہد، ریاضت، تصوف اور معرفت کے نہایت سخت راستے اسی غزل نے طے کرا کر سالک کو اس کی اصل منزل تک پہنچا دیا، یہاں تک کہ وہ کہہ اٹھا:

من تو شدم، تو من شدی، من تن شدم، تو جان شدی
تا کس نگوید بعد ازین، من دیگرم تو دیگری

اور کتنے بزرگ غزل کے اشعار سنتے سنتے فنافی اللہ ہو کر بقاباللہ کی منزل میں پہنچ گئے۔ دور اول میں خواجہ بختیار کاکی نے مندرجہ ذیل شعر سنتے سنتے جان، جان آفریں کے سپرد کر دی تھی:

کشتگان خنجر تسلیم را — ہر زمان از غیب جان دیگر است

فارسی غزل نے روز اول سے ہی تشبیہات و استعارات اور کنایے کے پیرایے میں اس طرح گفتگو کی ہے کہ کسی دوسری زبان میں یہ حسن بہت کم دکھائی دیتا ہے۔ محبوب کے قد کی سرو جیسی بلند قامتی ہو تو آنکھوں میں شراب، نرگس اور تیر جیسی کیفیتیں ہیں۔ اس کے لب یاقوت و گلاب کی پنکھڑیوں جیسے خوبصورت ہیں، ابروؤں میں محراب عبادت ہے۔ گیسو ہیں کہ دنیا کی تمام الجھنوں میں گرفتار......جیسی کیفیت و خوشبو اور زنداں و تاریکی کی علامت۔ چہرہ روز روشن ہونے کے ساتھ ماہ و مہر جیسی تمازت کا حامل نظر آتا ہے۔ فارسی شاعری کا باوا آدم ابوعبداللہ جعفر رودکی ایک بڑا غزل گو شاعر ہے۔ وہ کہتا ہے:

از مہر او ندارم بی خندہ کام و لب — تا سرو سبز باشد و بار آورد پدہ

بر رخ ہزار زہرۂ ثامور برشگفت — ایدون ز باغ قطرۂ شبنم نیافتم

یہ چوتھی صدی ہجری ہے۔ غزل کی ارتقائی آبیاری میں سنائی (۵۴۵ھ) اور ظہیر فاریابی (۵۹۸ھ) کا اہم کردار رہا ہے، لیکن غزل کو غزل بنانے میں شیخ سعدی (۶۹۱ھ) کی کاوشیں نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ انھوں نے غزل کو ہر طرح سے سجایا اور سنوارا۔ سعدی سے قبل غزل کے تغزل میں بھی قصیدہ کا اتباع نظر آتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ غزل، قصیدے کے مقابلے میں ثانوی حیثیت رکھتی تھی۔ سعدی نے غزل میں عشق سے متعلق تمام لوازمات جیسے شور و شوق، تخیل کی بلند پروازی، مضمون آفرینی اور نکتہ سنجی کو اس طرح برتا کہ غزل

نے باقی تمام اصناف سخن پر برتری حاصل کر لی۔ اسی دور میں غزل کو عام رواج حاصل ہوا۔ اب فارسی کا ہر شاعر غزل کی طرف راغب نظر آنے لگا۔

سعدی سے ٹھیک ایک صدی بعد وفات پانے والے شاعر حافظؔ شیرازی (۷۹۱ھ) کے زمانے تک غزل اپنے پورے شباب پر جلوہ افروز ہو چکی تھی۔ محبوب حقیقی و مجازی سے گفتگو کرنے کے لیے بھی یہ صنف نہایت موزوں اور دلآویز ثابت ہوئی۔ اس طرح غمِ جاناں سے غمِ دوراں تک کے مراحل اور سوال و جواب منظر عام پر لانے کے لیے بھی اس صنف نے اہم کردار ادا کیا۔

انھیں دونوں شاعروں کے درمیان ہندوستان کے ایک عظیم شاعر امیر خسرو نے غزل کی دنیا میں اپنا ایسا لوہا منوایا کہ ایرانیوں کے تمام دعوے خاک میں ملتے چلے گئے۔ خسرو کی وفات ۷۲۵ھ میں سعدی کے انتقال کے ۲۴ رسال بعد اور حافظؔ سے ۶۷ رسال قبل ہوئی تھی۔ خسرو اردو زبان کے بھی پہلے شاعر ہیں۔ حالاں کہ فارسی زبان کے پہلے تذکرے 'لباب الالباب' (۶۱۸) میں محمد عوفی نے مسعود سعد سلمان کو اردو کا پہلا شاعر لکھا ہے۔

خود امیر خسرو نے بھی اپنے دیوان 'غرۃ الکمال' کے دیباچے میں اس قول کی تائید کی ہے۔ حالاں کہ اس کا ہندوی دیوان ابھی تک حاصل نہیں ہوا ہے، لیکن امیر خسرو کی غزلیں اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ وہی اردو کا پہلا شاعر ہے۔ خسرو فارسی زبان کے عظیم شاعر ہیں تو ان کی اردو شاعری پر فارسی شاعری کا اثر ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ البتہ حیرت کی بات یہ ہے کہ خسرو کی اردو غزل جدید اردو غزل کے تیوروں سے مسجع نظر آتی ہے:

ز حال مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

مندرجہ بالا شعر میں لفظ 'مسکین' کا استعمال اس بات کی دلیل ہے کہ خسرو کے ذہن میں کہیں نہ کہیں اشتراکیت کا پہلو ضرور نمایاں تھا۔ اسی لیے حقیر، خاکسار، نیازمند جیسے الفاظ سے پرہیز کرتے ہوئے 'مسکین' لفظ کا استعمال کیا ہے۔ اردو زبان کے جملوں یا اشعار کو جو حصہ اردو کی شکل دیتا ہے وہ اس کے افعال ہیں۔ اگر اردو کے اپنے افعال نہ ہوتے تو فارسی اردو میں کوئی امتیاز باقی نہ رہتا۔ یہ امتیاز آج بھی باقی ہے۔ مثلاً اقبالؔ کا مشہور شعر:

نہیں منّت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری

یہاں لفظ نہیں اور ضمیر 'میری' کی بنا پر ان کے شعر کا پہلا مصرعہ اردو زبان کا کہا جا سکتا ہے ورنہ مکمل مصرعہ فارسی زبان میں ہے۔

امیر خسرو کے کلام کی شگفتگی، شیرینی اور آفاقیت کی ایک وجہ ان کے کلام پر حضرت نظام الدین اولیا کے مشورے بھی ہیں۔ جیسا کہ 'سیر الاولیا' کے اقتباس سے ظاہر ہے:

''اسی زمانے میں امیر خسرو نے شعر کہنا شروع کیا۔ وہ جو نظم کہتے، سلطان مشائخ کی خدمت میں پیش کرتے۔ ایک روز سلطان المشائخ نے ان سے فرمایا صفاہائیوں کی طرز پر شعر کہا کرو جو عشق انگیز بھی ہوں اور زلف و خال آمیز بھی۔ اس روز سے امیر خسرو علیہ الرحمہ نے اپنی شاعری میں زلف اور خال بتاں کی آمیزش کر کے اپنے اشعار کو نئی تشبیہوں اور استعاروں سے دلآویز بنا کر انتہائی کمال پر پہنچا دیا۔''

خسرو کے بعد اردو شاعری کی رفتار ایک دم مدھم ہوگئی۔ جس کی ایک وجہ 'فارسی زبان' کو سرکاری زبان کا درجہ ملنا ہے۔ اردو شاعری کا آغاز لاہور سے ہوا، پھر خسرو نے باقاعدہ دہلی میں اس کی آبیاری کی۔ لیکن اردو شعر و ادب کی نشو و نما میں سرزمین دکن کا اہم کردار رہا ہے۔ محمد تغلق کے آخری زمانے میں دکن کے سرداروں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ علاء الدین حسین بہمنی نے ۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء میں آزاد بہمنی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ جس کے ۱۴/سلطانوں نے ۹۲۴ھ تک نہایت شان و شوکت کے ساتھ حکومت کے کام کو انجام دیا۔ اس کے بعد یہاں پانچ خود مختار حکومتیں عماد شاہی برار، عادل شاہی بیجاپور، برید شاہی بیدر، نظام شاہی احمد نگر اور قطب شاہی گولکنڈہ وجود میں آئیں۔ ان حکومتوں نے اپنی رعایا کا پورا پورا خیال رکھا۔ جن میں نئی ابھرنے والی عوامی زبان اردو کی سرپرستی بھی شامل ہے۔ لہٰذا یہی دور اردو زبان کا اہم ارتقائی دور مانا گیا اور پہلا صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کی شکل میں نمودار ہوا۔

یہ وہ دور ہے جب فارسی سرکاری زبان ہے اور عوامی زبان، لشکری زبان کے سائے میں اردو کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ فارسی زبان کے تمام اسرار اسی زبان پر منکشف ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ جو تلمیحات فارسی غزلیات میں مستعمل تھیں وہ اسی طرح اردو زبان کی خوبصورت غزل کے پیرایے میں دکھائی دینے لگیں۔ ایرانی بادشاہوں، عاشقوں، جنگوں اور روایتوں کو تلمیح کی شکل میں مسجع کیا جانے لگا۔ ان میں جمشید، جام جم، کنعان، سکندر، آئینہ، خسرو، قارون، سلیمان، نمرود وغیرہ کا ذکر کیا جانے لگا۔ آئینے کا استعمال فارسی شاعری میں ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے، یہاں تک کہ بیدلؔ کو 'شاعر آئینہ ہا' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اب پہلے صاحب دیوان شاعر کا شعر ملاحظہ کیجیے:

سنوارے ہیں مجلس پیا روپ سوں — مدن مطرب اس میں خوش آواز ہے

اس شعر میں حافظؔ شیرازی کے شعر کی گونج بہت واضح ہے:

مطرب بزن کہ کار جہان شد بہ کام ما

قلی قطب شاہ کے بعد دوسرے غزل گو شاعر حسن شوقی (متوفی ۱۶۳۳ء) نے تو اپنے اشعار میں اکثر خسرویؔ، ہلالیؔ، انوریؔ و عنصریؔ وغیرہ کو یاد کر کے فارسی شعرا کے اثرات کا اعتراف کیا ہے:

جب عاشقاں کی صف میں شوقیؔ غزل پڑھے تو — کوئی خسرویؔ، ہلالیؔ، کوئی انوریؔ کہے ہیں

ہمارا حسن ہے شوقیؔ معلم ذہن کوں تیرے — سبق کچھ عنصریؔ کا یاد، درس کچھ انوریؔ کا ہے

سترہویں صدی کے بعد شاہ مبارک آبروؔ اردو غزل کے ایک مشہور شاعر ہوئے ہیں۔ ان کے اشعار پر فارسی غزل کا کتنا گہرا اثر ہے، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل شعر سے لگایا جا سکتا ہے جو خسرو کے مشہور شعر:

آفاق را گردیدہ ام، مہر بتان ورزیدہ ام — بسیار خوبان دیدہ ام، امّا تو چیز دیگری

....

دل نیں پکڑی ہے یار کی صورت — گل ہوا ہے بہار کی صورت

کوئی گل رو نہیں تمھاری شکل — ہم نے دیکھی ہزار کی صورت

یہی دور شمس الدین ولی دکنی کا بھی ہے۔ جنھیں ایک مدت تک اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر سمجھا جاتا رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ دہلی میں انھیں کی آمد نے اردو شاعری کا بازار گرم کیا تھا۔ ان کی مشہور زمانہ غزل تمام فارسی میں رائج تشبیہات و استعارات پر مبنی ہے:

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہوں گا — جادو ہیں ترے نین غزالاں سوں کہوں گا

دی بادشہی حق نے تجھے حسن نگر کی — یو کشور ایراں میں، سلیماں سوں کہوں گا

....

ہم جان بدان دو نرگس جادو سپردہ ایم — **حافظؔ** — ہم دل بدان دو سنبل ہندو نہادہ ایم

....

تعریف ترے قد کی، الف وار سریجن — جا سرو گلستاں کوں خوش الحاں سوں کہوں گا

دیکھا ہوں تجھے خواب میں اے مایۂ خوبی — اس خواب کو جا یوسف کنعاں سوں کہوں گا

پہلے شعر میں لب کی صفت لعل بدخشاں اور چشم غزالاں جس کا ترجمہ نین اور غزالاں کی نسبت سے بہت واضح ہے اور جادو ہیں ترے نین ذرا حافظؔ سے پوچھیے۔ دوسرے شعر کے مصرعۂ ثانی میں کشور ایراں اور سلیماں کا تذکرہ موجود ہے۔ تیسرا مصرعہ تو خسرو ہی کی مشہور زمانہ مگر مشکوک غزل میں موجود 'پری پیکر نگاری سرو قدی لالہ رخساری' قد کی تعریف سرو گلستاں سے کرنا یعنی تیرا قد سرو گلستاں جیسا ہے۔ آخری شعر

میں ترکیب 'یوسف کنعان' تلمیحاتی طور پر قصۂ قرآنی سے ماخوذ ہوتے ہوئے بھی فارسی غزل کا محبوب موضوع رہا ہے۔ جو فارسی غزل کی وراثت کی شکل میں اردو غزل میں داخل ہوا ہے۔

حافظؔ نے اپنی ایک غزل میں دُر پرونے کا مضمون نظم کیا ہے۔ یہی مضمون آتشؔ نے ایک مشہور غزل میں موزوں کیا ہے:

غزل گفتی و در سفتی بیا و خوش بخوان حافظؔ   کہ بر نظم تو افشاند فلک عقد ثریا را

آتشؔ کہتے ہیں:

بندش الفاظ، جڑنے سے نگوں کے کم نہیں   شاعری بھی کام ہے آتشؔ مرصع ساز کا

اکثر اردو غزل کے اشعار ہو بہو فارسی غزل کا چربہ تو کبھی ترجمہ نظر آتے ہیں۔ سعدیؔ فرماتے ہیں:

تو با چنین قد و بالا و صورت زیبا   بہ سرو و لالہ و شمشاد و گل نپردازی

مراعات النظیر سے مرصع یہ شعر آغا اکبر آبادی کی غزل میں اس طرح چار چاند لگاتا ہے:

سرو قد، لالہ رخ و غنچہ دہن یاد آیا   پھر بہار آئی مجھے لطف چمن یاد آیا

عبادت میں ریا کاری کا چرچا عام طور پر دیکھا جاتا ہے۔ مثال ہے کہ مسجد کا کونہ پکڑنے والے اکثر حقوق العباد ادا کرنے سے عاری ہوتے ہیں۔ ایسے عبادت گزار سجدہ کرنے والوں سے زمین خود شکوہ کرنے لگتی ہے کہ تیرے ریا کار سجدے نے میری پاکیزگی تار تار کر دی۔ اس مضمون کو فخر الدین عراقی جیسے مشہور صوفی نے نہایت خوبصورتی سے ادا کیا ہے:

بہ زمین چون سجدہ کردم، ز زمین ندا برآمد   کہ مرا خراب کردی تو بہ سجدۂ ریایی

علامہ اقبالؔ جیسے مستند شاعر کے یہاں ایک ایسی ہی مترنم بحر میں یہ مضمون اس طرح موزوں کیا گیا ہے کہ اس بحر کامل میں صرف ایک ہی غزل ہونے کے باوجود خوب گائی جاتی ہے۔ اقبالؔ کی اس غزل کا مطلع عشق حقیقی کی سیر کراتا ہوا سجدوں کی اہمیت کا اندازہ کراتا ہے:

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

اس غزل میں عراقیؔ کے شعر کا ترجمہ اردو میں کر دیا گیا ہے:

جو میں سر بہ سجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

گو کہ اقبالؔ نے شعر کو اس طرح موزوں کیا ہے کہ یہ مضمون ان کا اپنا ہی معلوم ہوتا ہے، اس

کے باوجود ترجمے کی خوبصورتی اور حقیقت اپنی جگہ مستحکم ہے۔ اسی طرح رندؔ لکھنوی کا مشہور شعر جو زبان زد خاص و عام ہے:

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں   تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے قوم

اکبرؔ الہ آبادی نے صرف آخری لفظ بدل کر پیروڈی کی شکل میں اسے طنز و مزاح کی شکل میں اپنے ذوق کا ایسا شعر بنا دیا تھا کہ قوم کی ساری فکر اور مشاہدہ نظروں کے سامنے گھوم کر مرثیہ کی شکل میں ابھر جاتا ہے۔ مذکورہ شعر سعدیؔ شیرازی کی غزل کے ایک شعر کا نہایت خوبصورت و کارآمد ترجمہ ہے جس کا مطلع اور بعد کا شعر یہ ہے:

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی   صوفی نشود صافی تا درنکشد جامی
ای بلبل اگر نالی من با تو ہم آوازم   تو عشق گلی داری من عشق گل اندامی

اسی طرح کی بہت سی مثالیں ہیں جن میں ترجمے کے ذریعے شعر صرف موزوں ہی نہیں کیا گیا ہے بلکہ شاعر کی شناخت بن کر اردو زبان کے معتبر اشعار میں جگہ پا چکا ہے۔

☆☆☆

Prof. Iraq Raza Zaidi
Dept. of Persian, JMI,
New Delhi-25, Mob. 9818818215
E-mail: iraq_raza@yahoo.co.in

نئے افسانے میں واقعات کربلا کی عکاسی

عابد حسین حیدری

اسلام کی تاریخ میں بالخصوص اور انسانیت کی تاریخ میں بالعموم کوئی قربانی اتنی عظیم اور اتنی مکمل نہیں ہے جتنی امام حسین کی شہادت، جو ریگ زارِ کربلا پر واقع ہوئی۔ اس عظیم قربانی نے مذہب اسلام کو جس کی حیثیت ایک نوخیز پودے کی سی تھی، وہ استحکام بخشا کہ قیامت تک آنے والی کفر والحاد کی آندھیوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسے محفوظ کر دیا۔

امام حسین (ع) کی اس بے مثال قربانی نے اسلام کے فلسفۂ جہاد اور ایثار و قربانی کی جس روایت سے عالم انسانیت کو روشناس کرایا اس کی تابناکی کا گہرا اثر ادبیات پر بھی پڑا۔ برصغیر میں اردو زبان جس وقت ابتدائی منزلیں طے کر رہی تھی، اس وقت بھی بعض علاقائی بولیوں اور لوک روایتوں میں اس دردناک واقعات کا عوامی اظہار ہو رہا تھا اور اردو میں صنف مرثیہ کے باقاعدہ وجود میں آنے سے پہلے دوہے اور نوحے وغیرہ پڑھے جاتے تھے۔

دکنی اردو میں مرثیوں کا رواج عام تھا تو شمالی ہند میں مرثیے، نوحے یا سوز و سلام کی ایک توانا روایت موجود تھی۔ ان کا مقصد مصائب اہل بیت کا بیان اور عقیدت و احترام کے ساتھ درد و غم کے جذبات کا اظہار تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شعریات کے ذخیرے میں رثائی ادب کا خاطر خواہ ذخیرہ ظہور پذیر ہوا۔ اردو شاعری میں امام حسین اور واقعۂ کربلا کو بطور استعارہ کثرت سے شعریات کا حصہ بنایا گیا ہے اور علامتوں کے حوالے سے متعدد مقالے منظر عام پر آ چکے ہیں لیکن فکشن میں اس پر کم توجہ دی گئی ہے۔ باوجود اس کے پریم چند نے 'کربلا' نامی ڈراما لکھ کر جہاں اس واقعے کی عظمت کا اعتراف کیا وہیں عصمت چغتائی نے 'ایک قطرۂ خون' لکھ کر اس قربانی کی آفاقی قدروں سے اردو فکشن کے قارئین کو روشناس کرایا۔

جہاں تک نئے افسانوں میں واقعات کربلا کی عکاسی کا سوال ہے تو اس میں سب سے اہم نام

انتظار حسین کا ہے۔ انتظار حسین نے نئے افسانوں کی درجہ بندی کے دور ہی میں واقعۂ کربلا کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''افسانہ نگار سن ستاون، معرکۂ کربلا اور جنگ بدر سے اپنا رشتہ جوڑے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس قوم کا جو نیا احساس تعمیر ہو رہا ہے اس میں وہ ایک ہزار سالہ ہند اسلامی تجربہ کو اور پونے چودہ سو سالہ تاریخی شعور کو بھی شامل کرنے کے لیے کوشاں ہے۔'' (اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، انوار احمد، ص ۲۵) اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انتظار حسین ایک بڑے تخلیقی تجربے کا امانت دار ہے۔ اپنے اولین مجموعے 'گلی کوچے' میں انھوں نے اپنی تجرباتی کیفیات کو پیش کرنے کے لیے میرؔ کے درج ذیل شعر کا سہارا لیا:

اڑتی ہے خاک شہر کی گلیوں میں اب جہاں
سونا لیا ہے گود میں بھر کر وہیں سے ہم!

گویا انتظار حسین کے مرکزی تخلیقی تجربے 'ہجرت' کے 'افسانوی ظہور کا' گلی کوچے ابتدائیہ ہے۔ اس کے کینوس کے تخلیقی تجربے اور اس واردات کی معنوی تہ داری سے گزرتے ہوئے انتظار حسین اپنے پانچویں مجموعے کے آخر میں نئے افسانہ نگاروں سے یوں مخاطب ہیں:

''جو چھوٹی سی اذیت اس فقیر کے نصیب میں لکھی گئی ہے وہ تمھیں عطا نہیں ہوئی۔ یعنی مین را کو، نہ سریندر پرکاش کو، نہ اپنے پاکستان کے انور سجاد کو...... میں اپنی مصیبت میں زمینوں اور زمانوں میں آوارہ پھرتا ہوں، کتنے دن اجودھیا اور کربلا کے بیچ مارا مارا پھرتا رہا، یہ جاننے کے لیے کہ جب بھلے آدمی اپنی بستی کو چھوڑتے ہیں تو ان پر کیا بیتتی ہے اور خود بستی پر کیا بیتتی ہے۔'' (اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، انوار احمد، ص ۳۹۳)

اگرچہ ثقافتی رس اور مہک کے ساتھ مٹی بھی انتظار حسین کا عشق ہے تاہم ہجرت انتظار حسین کے لیے محض گلی کوچوں اور بستیوں کی خاک سے بچھڑنے کا مسئلہ نہیں بلکہ آبا و اجداد کی یادگاروں، روایتوں اور رسموں سے بچھڑنے، تاریخ اور تہذیب کی شہادتوں سے منقطع ہونے اور اپنے تخلیقی وجود کی شکست و ریخت کا معاملہ ہے۔ 'کنکری' میں انتظار حسین نئی بستی کے بارے میں اجنبیت اور خوف کے احساس کو دل میں لیے کبھی بچھڑے ہوؤں کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے طوفانی رات میں ایک ناقابل اعتماد لائف بوٹ میں اترنے والے، ڈوبنے والے جہاز کے باقی مسافروں کو دیکھتے ہیں۔ کبھی اپنے وجد کے گرم مرتعش محسوسات کی بھاپ میں غسل کرتا ہے، کبھی اس کا واہمہ، اس کی تنہائی کو انسان کی ازلی تنہائی بنا دیتا ہے مگر اصل میں اس کی توجہ کا مرکز مٹی ہے اور اس مٹی میں کربلا کی وہ مٹی شامل ہے جو سجدہ گاہ کی زینت ہے۔ اس مٹی اور سجدہ گاہ کے استعاراتی و تلمیحی

پیش کش میں انتظار حسین امام حسین کے اس سجدۂ آخر کی یاد دلاتے ہیں جسے امام حسین نے رضائے الٰہی کی خاطر ادا کر کے قلبی سکون حاصل کیا تھا۔ پس منظر اور پیش منظر کے درمیان کنکری کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''جس مذہب سے میرا تعلق ہے اس کے متعلق میں نے بہت سن رکھا ہے کہ وہ مٹی سے بلند ایک طاقت ہے مگر میں اسے کیا کروں کہ میں اپنے مذہبی احساس کا تجزیہ کرتا ہوں (اگر وہ مجھ میں ہے) تو اس کی تہ میں بھی مٹی جمی ہوئی ہے۔ ہمارے محلے کی مسجد میں لکڑی کی سجدہ گاہیں ڈھیروں رکھی تھیں مگر مٹی کی سجدہ گاہیں صرف دو تھیں جو ہمیشہ پیش امام اور ان کے کسی حواری کی زد میں رہتی تھیں، جب کبھی مجھے مٹی کی سجدہ گاہ جھپٹ لینے کا موقع ملا مجھے سجدے میں وہ لذت حاصل ہوئی کہ جی چاہتا تھا کہ سجدہ اتنا طویل ہو، اتنا طویل ہو کہ کبھی ختم نہ ہو۔''

'شہادت' انتظار حسین کا ایک ایسا افسانہ ہے جس کا عنوان پڑھ کر یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ شاید یہ افسانہ امام حسین کی شہادت پر مبنی ہے جب کہ شہادتِ حسین افسانے کا مرکزی خیال نہیں ہے بلکہ یہ کہانی روایتوں کے زوال کی کہانی ہے جو انتظار حسین نے تراب علی، افضال حسین، محمد عوض کربلائی، مولوی فرزند علی کے ذریعہ پیش کی ہے۔ انتظار حسین نے 'شہادت' کے ذریعہ یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ امام حسین کے نام پر اوقاف کی لوٹ کی بھی وہی حیثیت ہے جو کربلا میں بعد شہادت یزیدی افواج کے ذریعہ ہوئی تھی۔

تراب علی کے ذریعہ اوقاف میں خرد برد کے ذریعہ انتظار حسین نے بدی، ناانصافی اور باطل پرستی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہاں انھوں نے ماضی اور حال کے انسلاکات پر زور دیا ہے۔ کسی واقعے کی عصری حسیت بھی ماضی اور حال کی پیوستگی کی بدولت عطا ہوتی ہے۔ انتظار حسین کی یہ خوبی ہے کہ ان کے افسانے اپنی روایات و اقدار کی پاسداری کے ساتھ ساتھ عصری تقاضوں کو بھی پورا کرتے ہیں۔ 'شہادت' بھی ایسی ہی کہانی ہے جو عصری حسّیت سے بھرپور ہے جس میں صدیوں پہلے رونما ہونے والے واقعے کو موجودہ پس منظر میں دیکھا گیا ہے:

> ''دوسرے دن مولوی فرزند علی علموں کی زیارت کر کے آبدیدہ باہر نکلے اور بولے کہ ''امام کی سواری نہیں آئی۔'' اس پر دل سب کے دھڑکنے لگے اور بہت وسوسے اور شک و گمان پیدا ہوئے مگر کسی کو کچھ بولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ بس محمد عوض کربلائی نے، جنھوں نے ایک سال کربلا میں محرم کیے تھے اور اپنی آنکھ سے دیکھا تھا کہ دس دن تک کربلا ویران رہی کہ امام کی سواری ہند کی طرف گئی ہوئی تھی، ٹھنڈا سانس بھرا اور بولے

> کہ ''اللہ ہم پر رحم کرے............'' مولوی فرزند علی درد بھری آواز میں بولے۔ ''علم ہم نے کھو دیا اور دلدل کو ہم نے............'' وہ بولتے بولتے چپ ہو گئے، پھر بولے ''اب رہ کیا گیا...... اب کیا رہ گیا ہے۔ نیکیاں روگرداں ہو گئیں ہیں اور حق پر عمل نہیں ہوتا اور باطل سے پرہیز نہیں کیا جاتا۔''

انتظار حسین وہ عظیم فن کار ہے جو ماضی کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر نہیں رہ جاتا بلکہ اپنے عہد کا گواہ ہے۔ انتظار حسین کے مجموعے 'شہر افسوس میں یہ گواہی' اجتماعی دکھ میں شرکت کی مخلصانہ آرزو سے معتبر ہوتی ہے۔ سقوط مشرقی پاکستان یا قیام بنگلہ دیش برصغیر کی تاریخ کا ایک عظیم سانحہ ہے۔ انتظار حسین نے اس سانحے پر لازوال افسانہ 'شہر افسوس' لکھا۔ تقسیم ہند کے بعد مشرقی پاکستان میں بسنے والے مہاجرین کی بے گھری، جوش انتقام کے ہاتھوں مسمار ہوتا ہوا اجتماعی وجود، دشمنوں کی طرف سے امان کا فریب اور نجات کے مسدود راستے، انتظار حسین اس اذیت ناک تجربے کو کوفہ و کربلا کی اذیت گاہوں سے گزار کر اپنے مخصوص داستانوی اسلوب کے ساتھ شہر افسوس تخلیق کرتے ہیں۔

'مردہ راکھ' میں بھی اس طرح کا تاسف شروع سے آخر تک سانس لیتا نظر آتا ہے۔ شب عاشور، ماتم، مجلس، امام باڑہ، نوحہ، مرثیہ، دلدل، علم وغیرہ الفاظ اس افسانے میں انتظار حسین کی روحانی ہجرت کی علامتیں بن جاتے ہیں۔ آج کا انسان نفس پرستی، شکم پروری، منافقت اور اخلاقی بزدلی جیسی منفی قوتوں کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ وہ اپنی ذات کو برتر رکھنے کی جدوجہد میں مصروف ہے جب کہ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ استحکام ذات کا مرحلہ عرفان ذات سے کہیں زیادہ مشکل ہے جبھی تو تفضّل جو علم اٹھانے میں سب پر سبقت لے جاتا تھا ہراساں اور دل برداشتہ ہو کر خود فراموشی کی ایسی کیفیت سے ہمکنار ہوتا ہے کہ علم کو ہاتھ میں لیے لیے وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے اور اسے میدان کربلا کے علاوہ کہیں اور پناہ نظر نہیں آتی:

> ''جلتے خیموں کی آگ ٹھنڈی ہو چلی تھی...... اور جب ہوا کا لشکر صحرا کی ریت کو روندتا ہوا آتا تو کوئی ادھ جلا خیمہ بھڑک اٹھتا اور لشکر کے گزر جانے پر پھر تھک کر بیٹھ جاتا۔ لٹے ہوؤں کا قافلہ کس طرف ہے۔ رات آ گئی اور سب سو کر ناپید ہو گئے اور زبانیں ساکت ہو گئیں اور وہ شخص جو ہتھکڑی اور زنجیر سمیت بیچ دشت میں سر بہ سجود ہے، ناتواں جسم کھجور کی مانند لرزتا ہے اور پیاسی زبان پر دعا جاری ہے۔ اے میرے معبود! تیرے آسمانوں کے ستارے ڈوبتے جاتے ہیں اور تیری مخلوق کی آنکھیں نیند میں ہیں اور سلاطین نے اپنے دروازے بند کر لیے اور باہر پہریدار کھڑے کر دیے، جب اس

نے سر اٹھا کر دیکھا تو پایا کہ وہ اکیلا کھڑا ہے۔''

انتظار حسین نے شام غریباں کے منظر نامے میں تفضّل کے چشم تصور سے اس منظر نامے کی بازیافت کی ہے جس میں امام حسین کے فرزند امام زین العابدین ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑے اپنے معبود کی عبادت میں مصروف ہیں۔ یوں انتظار حسین اپنی کھوئی ہوئی اقدار کی بازیافت میں تفضّل کا سہارا لیتے ہیں، جو چودہ سو سال قبل ماضی میں جا کر ختم ہوتا ہے، جہاں ایک شخص روایتوں، صداقتوں اور نیکیوں کا امین اور حق کا علمبردار بن کر انکار بیعت کے ذریعہ سامراجی طاقتوں اور ظالم و جابر شہنشاہیت کے منھ پر ایسا طمانچہ رسید کرتا ہے کہ یہ انکار آج بھی حق و باطل کے فرق کو سمجھنے کے لیے بہ نام کربلا ایسا استعارہ بن گیا ہے جو انسانیت کے لیے قیامت تک ڈھال کا کام کر رہا ہے۔ گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ 'مردہ راکھ' میں انتظار حسین نے موضوع اور فن دونوں کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ انھوں نے اس افسانے میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ظلم و ستم اور بربریت نے حق پرستوں کو راکھ بننے پر مجبور ضرور کر دیا ہے لیکن راکھ میں جو زندگی ہے اس کا تعلق انتظار حسین کے مطابق ان جڑوں سے ہے جسے انھوں نے 'ہندوستان سے ایک خط' میں بہت خوبصورت انداز میں برتا ہے۔

انتظار حسین کو اپنے معاصر افسانہ نگاروں پر یہ تفوق حاصل ہے۔ وہ اردو زبان و ادب سے تخلیقی سطح پر آشنا ہیں۔ وہ تاریخ و تہذیب کے پر اسرار اور پیچیدہ جنگل میں اتر کر اظہار و ابلاغ کے علامتی وسیلے کو معتبر بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ واقعات کربلا یا کربلائی علامتوں یا استعاروں کو انھوں نے اپنی تخلیقات میں جس ہنرمندی سے پیش کیا ہے، اردو کے کسی فکشن نگار کے یہاں نظر نہیں آتا۔

نئے افسانہ نگاروں میں دوسرا اہم نام قرۃ العین حیدر کا ہے جن کے متعدد افسانوں میں واقعات کربلا کو موضوع بنایا گیا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا ایک منفرد انداز تحریر ہے اور تاریخ کے گہرے مطالعے نے ان کے فکری افق کو جلا بخشی ہے۔ یوں مشرقی تہذیب کا وقار اور مغربی تمدن کا نکھار ان کے افسانوں میں کچھ اس طرح گھل مل گیا ہے کہ ایک رنگ کو دوسرے رنگ سے جدا کر کے دیکھا ہی نہیں جا سکتا۔ اس تہذیبی رچاؤ میں ان کی کہانیوں میں کربلا اور اس کے متعلق موضوعات کا بہت ہی عمدہ تہذیبی بیان ملتا ہے۔ ان کا مشہور افسانہ 'جلاوطن' اس کی بہترین مثال ہے۔ جس میں عینی آپا نے محرم داری اور اس کے متعلقات کو تہذیبی روپ دیا ہے۔ یوں تو افسانہ تقسیم، ہجرت اور ان کے انسلاکات کو سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے لیکن افسانے کے کردار، کرداروں کے نام، ان کے گھروں میں عزاداری، تعزیہ داری، مجالس اور جلوس و علم کا بیان افسانے میں اس طرح پیوست ہو جاتا ہے کہ ان سب سے ایک وسیع و عریض آفاقی منظر نامہ ترتیب پاتا ہے جو واقعہ کربلا سے ہمیں جوڑ دیتا ہے۔ ہجرت کے ساتھ عزاداری کے انسلاکات کے ذریعہ قرۃ العین حیدر نے ہجرت کے کرب

کو عزائے حسین میں مدغم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ چند اقتباسات دیکھیں:

''آج چاند رات تھی، محلے میں نقارہ رکھا جا چکا تھا۔ مجلسیں اب بھی ہوئیں لیکن وہ چہل پہل، رونق اور بے فکری تو کب کی خواب و خیال ہو چکی تھی۔''

''چھمو بیگم چپ چاپ آ کر میز کے پاس کھڑی ہو گئیں۔ زیارت پڑھ کر تعزیوں کو جھک کر سلام کرنے اور کنپٹیوں پر انگلیاں چٹخا کر جناب علی اصغر کے سبز جار جٹ کے گہوارے کی بلائیں لینے کے بعد انھوں نے علموں کو مخاطب کر کے آہستہ سے کہا۔ ''مولا! یہ آخری محرم ہے۔ ارے اب تمھاری مجلسیں یہاں کیسے کروں گی۔'' اور یہ کہہ کر انھوں نے زور و شور سے رونا شروع کر دیا۔''

''لُو بوا غم حسین کو یاد کر و اپنا غم ہلکا ہو جائے گا۔ مولا تو ہر جگہ ہیں۔ کیا پاکستان میں نہیں ہیں۔ ہاں ہاں باقی بیبیوں نے آنسو خشک کرتے ہوئے تائید کی۔ مولا کیا پاکستان میں نہیں۔ تم وہاں مولا کی مجلسیں قائم کرنا۔'' (جلاوطن)

'جلاوطن' کے درج بالا اقتباسات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اس کہانی میں ہندوستانی تہذیب کے زوال کی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے لیکن اس میں اثر انگیزی اور خوبصورتی اس وقت آتی ہے جب قرۃ العین حیدر عزاداری اور محرم کا ذکر کرتی ہیں۔ گویا انھوں نے ہندوستانی مشترکہ تہذیبی روایت کے زوال کا مرثیہ لکھنے کے لیے واقعات کربلا اور عزاداری کا سہارا لیا جس سے افسانے کے وقار میں اضافہ ہوا اور فنکاری کے اعتبار سے شاہکار افسانہ بن گیا۔ اس کے علاوہ قرۃ العین حیدر نے 'یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے' اور 'سنگاردان' میں بھی اودھ کی مٹتی ہوئی تہذیب کے پس منظر میں عزاداری کا خصوصی ذکر کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے علاوہ انیس اشفاق کے افسانہ 'کنکر کنواں' میں بھی ہجرت کے المیے کو علامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ 'کنکر کنواں' انیس اشفاق کا علامتی دور کا کامیاب افسانہ ہے جو ان کے مجموعے 'کتنے پڑھنے والے' میں شامل ہے۔ اس میں ہجرت کے موضوع کو لکھنوی تہذیب اور لکھنو سے ہجرت کرنے والے ایک خاندان اور خاص کر پرانے لکھنو کے ایک محلہ کنکر کنواں کو علامت بنایا گیا ہے۔ انھوں نے اس افسانے میں لکھنو کی عزاداری کے پس منظر میں ہجرت کرنے والی بڑی اَپی کے امامباڑے سے بچھڑنے کے کرب کو لکھنو میں محرم میں پڑھے جانے والے نوحوں سے سہارا لے کر بیان کیا ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''یہاں کچھ دیر کھڑے رہنے کے بعد وہ اس صحنچی کی طرف چلی گئیں جسے محرم میں امامباڑے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ صحنچی میں بیٹھ کر وہ بہت دھیمی اور پرسوز

آواز میں ان نوحوں کو پڑھنے لگیں جنھیں سن کر لوگ بے اختیار رونے لگتے تھے:

خالی کیا اجل نے بھرا گھر حسین کا — کوئی رہا نہ مونس و یاور حسین کا
زینب پکاریں اے مرے بیمار کیا ہوا — ہے ہے شبیہ احمد مختار کیا ہوا
گھر میں علم لیے ہوئے آئے ہیں خود حضور — وہ یادگار جعفر طیار کیا ہوا
آنکھوں میں میرے بھائی کی دنیا سیاہ ہے — روئے شبیہ احمد مختار کیا ہوا

شاہینہ بی اپنے کمرے میں جاگ رہی تھیں۔ نوحوں کی آواز سن کر وہ کمرے سے باہر نکل آئیں۔'' (کنکر کنواں)

لکھنو کا تہذیبی و ثقافتی منظر نامہ شیعہ-سنی اتحاد و ہم آہنگی اور تضادات و امتیازات سے آمیزش ہے۔ لکھنو کی گنگا جمنی تہذیب کی انفرادیت کے باوجود جہاں ہر مذہب و مسلک کے لوگ مل جل کر عید، دیوالی اور محرم کی تقریبات مناتے ہیں لیکن بعض دفعہ یہ رسومات جھگڑے اور فسادات کی شکل بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ عابد سہیل کا افسانہ 'سوا نیزے پر سورج' اور علی امام نقوی کا افسانہ 'ایک ننگی کہانی' اس کی بہترین مثال ہے۔ کچھ افسانہ نگار ایسے بھی ہیں جن کے یہاں کربلا کا ذکر ضمناً آیا ہے جیسے احمد ندیم قاسمی کا 'کپاس کا پھول'، تحسین منور کی 'سردھا نجلی'، زاہدہ حنا کا افسانہ 'زمیں آگ کی آسماں آگ کا'، 'جسم و زباں کی موت سے پہلے' اور منظر کاظمی کا 'ایک جلائی ہوئی شام' وغیرہ۔ ان افسانوں کے اندر کربلا کے تناظر میں استعمال ہونے والے واقعات و مکالمات اس طور پر استعمال ہوئے ہیں کہ ان سے کہانیوں کے مرکزی خیال میں شدت آجاتی ہے ساتھ ہی یہ افسانے شہادت امام حسین کی یاد بھی دلاتے ہیں۔

مندرجہ بالا افسانوں کے علاوہ قاضی عبدالستار کے افسانے 'رضو باجی' میں اودھ کی تہذیب کی عکاسی کے ضمن میں محرم کا ذکر بہت خوبصورت انداز میں ملتا ہے۔ قاضی عبدالستار اودھ کی فضاؤں کے پروردہ ہیں، اسی لیے محرم اور اس کے انسلاکات کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں کہ اس سے ان کی انفرادیت برقرار رہتی ہے۔

''ہماری بستی کے محرم سارے ضلع میں مشہور تھے اور دور دور سے عزیز و اقارب محرم دیکھنے آیا کرتے تھے...... نویں کی رات سال بھر میں واحد رات ہوتی تھی جب ہمارے گھر کی بیبیاں بستی میں زیارت کو نکلتی تھیں۔ پورا اہتمام کیا جاتا تھا کہ وہ پہچانی نہ جائیں۔ برقعوں کے بجائے موٹی موٹی چادر اوڑھ کر نکلتی تھیں۔'' (رضو باجی)

قاضی عبدالستار جہاں اودھ کی تہذیب کا اہم حصہ محرم اور اس کی رسومات کو قرار دیتے ہیں وہیں

جیلانی بانو نے اس منظر نامے کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ امام حسین کو خط لکھنے والے تو بہت تھے لیکن قوت ارادی کی کمی کے سبب بہت سے لوگ امام حسین کی آواز پر لبیک نہ کہہ سکے۔ نئے افسانہ نگاروں میں انتظار حسین، قرۃ العین حیدر کے علاوہ اسد محمد خاں، تسکین زیدی، وسیم حیدر ہاشمی، اسلم جمشید پوری اور فرقان سنبھلی ایسے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے واقعۂ کربلا کو موضوع بنا کر افسانے لکھے ہیں۔

اسد محمد خاں اردو فکشن کی وہ آواز ہیں جنھوں نے اپنی کہانیوں سے نئے افسانہ نگاروں کی بھیڑ میں وہ مقام حاصل کیا ہے جو کم افسانہ نگاروں کو حاصل ہوا۔ اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ہمارا زمانہ جس کی بابت عام تاثر یہ ہے کہ اس نے انسان کی معنوی دلچسپیوں اور باطنی اظہار کی سرگرمیوں کے آگے بڑے بڑے سوالیہ نشان لگا دیئے ہیں اور ہمیں خارجی زندگی کے ہنگاموں میں محو کر دیا ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ ہمارا زمانہ اچھی کہانیوں کے لیے توجہ اور قبولیت سے آج بھی عاری نہیں بلکہ بڑی کہانیوں کے امکانات سے اب بھی اسی طرح بھرا پڑا ہے جیسے اس سے قبل کے زرخیز زمانے رہے ہیں۔ ہاں بس اب یہ ہے کہ وہی کہانی کار فوکس ہو سکیں گے جو کہانی کہنے سے پہلے خود اپنے اندر اور اپنے فن کے اندر کہانی کو بسر کرتے ہیں۔ ایسے ہی کہانی کار اسد محمد خاں ہیں۔ اسد محمد خاں کے پہلے افسانوی مجموعے 'کھڑکی بھر آسمان' سے لے کر 'برج خموشاں'، 'غصے کی نئی فصل'، 'ٹکڑوں میں کہی گئی کہانیاں' تک کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسد محمد خاں نے پے در پے ایسے کرداروں کو لکھا ہے جو ہند اسلامی کلچر کے پیدا کردہ ہیں۔ انھوں نے ان کرداروں کو اس سلیقے سے پیش کیا ہے کہ اس سے برصغیر کی ثقافتی روح، ہمارا تہذیبی اسٹرکچر، اس کی تمام تر رنگارنگی اور تنوع نمایاں نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں اسلوب، تکنیک اور بیانیہ کے بہت تجربے کیے ہیں اور وہ اس میں کامیابی سے ہم کنار بھی ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنے فن میں جو لسانی صورت حال پیش کی ہے وہ خیر و شر کے اس نئے تصور کی دین ہے جس میں شر کو خیر پر غلبہ پاتے دیکھا جاتا ہے اور یہاں ہمیں اس حقیقت کو بھی پوری سچائی کے ساتھ تسلیم کرنا چاہیے کہ انسانی فطرت میں داخل شر کے عنصر کا جو اظہار ہمارے عہد کی زندگی میں ہو رہا ہے وہ اس سے قبل کی انسانی تاریخ میں نظر نہیں آتا۔ اس عہد میں بدی زیادہ طاقتور ہی نہیں ہوتی ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہولناک بات یہ ہے کہ اس نے نیکی پر غلبہ پانے کے لیے خود نیکی کے اوزاروں کو بھی استعمال کرنا سیکھ لیا ہے۔ اسد محمد خاں نے اسی ہولناک منظر نامے کو اپنی کہانی 'شہر کوفے کا محض ایک آدمی' میں بہت کامیابی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اسد محمد خاں کی نظر میں امام حسین کی شخصیت خیر کی علامت ہے اور ان کی عظیم الشان قربانی ہمیشہ یا ہر دور میں مسلمانوں کے قلوب کو گرماتی رہے گی لیکن اسد محمد خاں اس بات سے رنجیدہ ہیں کہ کل بھی ہزاروں مسلمانوں

نے امام حسین کو خط لکھ کر کوفے بلایا لیکن امام کے آنے کے بعد شر کے مقابل امام کے ساتھ آنے کی جرأت نہ کر سکے۔ موجودہ عہد کی کربلا میں بھی فلسطینیوں اور دوسرے مسلمانوں پر مظالم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں لیکن ہم یہ فقرہ تو کہتے ہیں کہ ''کاش ہم کربلا میں ہوتے تو امام حسین آپ کے ساتھ قربانی پیش کرتے۔'' لیکن آج کی کربلا میں بھی ہمارا کوئی حصہ نہیں اور آج بھی حسین 'ہل من ناصر ینصرنا' کی صدا بلند کر رہے ہیں لیکن کوئی لبیک کہنے والا نہیں ہے۔ اسد محمد خاں نے کہانی کے پہلے ہی پیراگراف میں اس منظرنامے کی تشکیل کی ہے جس میں مسلمانانِ عالم کے غیر ذمہ دارانہ رویے کی طرف اشارہ کیا ہے:

> ''ایک آدمی کا تصور کیجیے جس نے کوفے سے امام کو خط لکھا ہو کہ میرے ماں باپ فدا ہوں آپ دارالحکومت میں ورود فرمائیے۔ حق کا ساتھ دینے والے آپ کے ساتھ ہیں اور وہ آدمی اپنے وجود کی پوری سچائی کے ساتھ اس بات پر ایمان بھی رکھتا ہو، مگر خط لکھنے کے بعد گھر جا کر سو گیا ہو۔''

کہانی کا ابتدائیہ اسد محمد خاں کے کرب کا مظہر ہے اور انھوں نے بیانیہ اس طرح مرتب کیا ہے گویا ان کی آنکھوں میں کربلا کے سارے مناظر آ گئے ہیں۔ کہانی لکھنے والا داستان کہتا جا رہا ہے اور بے حس سماج کی بے حسی کو اس طرح پیش کر رہا ہے کہ پڑھنے والا 'کوفی لایوفی' کے اس منظرنامے میں اپنے آپ کو محسوس کرنے لگتا ہے۔

کہانی کار کبھی امام حسین اور ان کے اہلِ حرم پر پانی بند کرنے کا ذکر کرتا ہے تو کبھی جناب عباس کی شہادت کا ذکر کرتا ہے اور کبھی امام حسین کے بارے میں رسول خدا کے ارشادات کو پیش کرتا ہے۔ آخر وہ مرحلہ بھی سامنے آتا ہے اور فرزندِ رسول شہادت کے مرتبے پر فائز ہو گئے۔ جیم الف کو سب کی خبر ہے لیکن وہ زبانی جمع خرچ کے علاوہ کچھ نہیں کرتا۔ اس کے دل میں محبت تو ہے لیکن اس میں حق کا ساتھ دینے کی جرأت نہیں ہے۔ اس پورے منظرنامے کو اسد محمد خاں نے جس خوبصورتی سے واقعۂ کربلا کے منظرنامے کے ذیل میں پیش کیا ہے اور اس کی معنویت اور افادیت کو جو بیانیہ کا روپ دیا ہے کہانی کے آخری پیراگراف سے مزید واضح ہو جاتا ہے:

> ''تو سنیے، بات کوئی پرانی نہیں ہے۔ یہ آدمی ایک بار کسی مشاعرے میں بلوایا گیا تو میزبانوں سے کہنے لگا، مجھے پیسے نہ دو۔ یہاں سے بیت اللہ قریب ہے، مجھے عمرہ کرا دو۔ تمہارا کوئی زیادہ خرچ بھی نہ ہوگا۔ پھر عمرہ کرنے گیا تو طواف کرتے ہوئے بے ڈھنگے پن سے دہاڑیں مار مار کے رونے لگا (سمجھو تو اتنی عمر میں اس سے یہی ایک نیکی صادر ہوئی ہے) یا اسے اس کی بے بسی کہہ لو۔ کہہ رہا تھا میں نے حرم شریف میں دنیا کے پہلے مظلوم اور مستقیم آدمی سے لے کر فلسطینیوں تک، سب کے لیے دعا کی اور رونا مجھے اپنی ضلالت اور بے بسی پر آتا تھا کہ میں اگر کربلا کے سن ہجری میں ہوتا تو اپنے گھر میں پڑا کلپتا رہتا۔ مجھ میں اتنی استقامت بھی نہ ہوتی کہ جلانے کی لکڑی کھینچ کر ہی ظالموں کے سامنے جا کھڑا ہوتا اور گھوڑے تلے روند دیا جاتا۔''

اسد محمد خاں نے موجودہ منظرنامے کی روشنی میں واقعۂ کربلا کو جس رخ سے پیش کیا ہے وہ ثابت کرتا ہے کہ وہ کوئی معمولی فنکار نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں کی تجسیم میں مطالعہ کے ساتھ ساتھ موجودہ حالات کا مشاہدہ بھی کیا ہے اور مشاہدے میں ہمارا کرب بھی ہے اور موجودہ مسائل کی دروں بینی بھی۔

تسکین زیدی افسانہ نگاروں کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جنھوں نے ترقی پسندی سے لے کر جدت کا سفر طے کیا ہے جو ان کے مجموعے 'فصیل، پرچھائیاں اور ہنسنے والی' کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے۔ ان کے افسانے تکنیکی تجربوں کے سبب بوجھل نہیں ہیں بلکہ افسانوں میں صاف ستھری زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ انھیں بیانیہ پر قدرت حاصل ہے، ان کے افسانے حقیقت پسندی کے آئینہ دار ہیں۔ واقعۂ کربلا کے حوالے سے ان کا خوبصورت افسانہ 'صراطِ مستقیم' ہے جو ایک اچھا افسانہ ہونے کے ساتھ ساتھ بیانیہ کا خوبصورت نمونہ ہے۔ 'صراطِ مستقیم' میں تسکین زیدی نے بیانیہ اس طرح مرتب کیا ہے کہ حضرت امام حسین اور ان کے ساتھیوں کو کس طرح سازشاً میدان کربلا میں گھیر کر لایا جاتا ہے، کن اشخاص نے اس سازش میں حصہ لیا۔ دورانِ واقعہ کس طرح جناب حُر کے اندر تبدیلی آئی، اور وہ سیدھا راستہ نظر آ گیا جس پر چل کر حر دنیا و آخرت دونوں جگہ باعزت بن گیا۔ حر کی اس قلبی ماہیت کی تبدیلی کا اصل سبب امام حسین (ع) کی ذات والا صفات تھی جن کے اخلاقِ حسنہ نے جہاں فلسفۂ اسلام اور سنت رسول اللہ کو زندہ کیا وہیں حر کو اپنے آپ بدلنے پر مجبور کیا۔

حر یزیدی فوج کا سپہ سالار تھا جو امام حسین کو دشت کربلا میں گھیر کر لانے پر مامور تھا۔ جب امام حسین اور حر کے لشکر کا سامنا ہوتا ہے تو حر اور ان کی فوج کے افراد پیاس سے جاں بہ لب تھے۔ صحرا میں دور دور تک کہیں پانی کا نام نہیں تھا۔ امام حسین اور ان کے ساتھیوں نے جب حر اور اس کے لشکر کو دور سے آتے ہوئے دیکھا تو انھوں نے مورچہ سنبھال لیا۔ وہ اور ان کے ساتھی فوج مخالف کے کسی بھی ردعمل کا جواب دینے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ تسکین زیدی نے اس منظرنامے کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے:

> ''چند لمحوں میں ہزاروں سواروں کی فوج سامنے آ کھڑی ہوئی۔ فوج دشمن کی ضرور تھی مگر شدتِ عطش سے سوار بدحواس تھے اور گھوڑوں کی زبانیں منھ سے باہر ہو رہی

تھیں۔ قافلہ کے تجربہ کار ساتھیوں نے سردار سے کہا کہ ہمیں لڑنے کی اجازت فرمائیں تو ہم انھیں تلواروں کی باڑھ پر رکھ لیں۔ سردار نے مشورہ نہ مان کر غنیم کے لشکر کو سیراب کرنے کا حکم دے دیا۔ پہلے ایک ایک سوار نے پانی پیا پھر گھوڑوں کی باری آئی اور ایک ایک گھوڑے نے اپنی پیاس بجھائی پھر سب نے اس نیک قافلہ سالار کو متشکر نظروں سے دیکھ کر اس کے لیے دعائے خیر کی۔''

امام حسین چاہتے تو دم بھر میں دشمن کی فوج کا خاتمہ کر دیتے لیکن یہ فعل حسین کی سرشت کے خلاف تھا۔ اس لیے کہ حسین نبی رحمت کے نواسے، شیر خدا کے فرزند اور سیدۃ النساء العالمین کے لخت جگر تھے۔ لہٰذا انھوں نے حر کی جاں بہ لب فوج کو پانی پلا کر اپنے اعلیٰ اخلاق و کردار کا مظاہرہ کیا۔

امام حسین کے اس کرم اور اخلاقی بلندی نے دشمن کو اتنا متاثر کیا کہ پہلے ہی مرحلے پر دشمن تسخیر ہو گئے۔ وہ حر جو ابن زیاد کی طرف سے امام حسین کو گرفتار کرنے پر مامور تھا، ان کے اخلاق کا گرویدہ ہو گیا اور سوچنے لگا کہ امام حسین جیسے باکردار، عبادت گزار، پاک سیرت اور بے ضرر انسان کو کس طرح گرفتار کرے۔ اس طرح کی کشمکش اور حالات کے درمیان امام حسین کا کارواں بڑھتا رہا۔ حر کا لشکر بھی ان کے قافلے کے ساتھ ساتھ نگرانی کرتا ہوا چلتا رہا۔ 'صراط مستقیم' میں تسکین زیدی نے واقعۂ کربلا کے اصل محرک کے چہرے سے نقاب کشائی کی ہے۔

پانی اس صدی کا سب سے اہم مسئلہ ہے اور پیاس شہادت حسین کا استعارہ۔ ہمارے بہت سے فکشن نگاروں نے اس مسئلہ کو سامنے رکھ کر کہانیاں لکھیں لیکن اسلم جمشید پوری ایسے کہانی نویس ہیں جنھوں نے یونیورسٹی کیمپس کے اس اہم مسئلے کو واقعۂ کربلا کی پیاس سے ربط دیا ہے اور تاریخ انسانیت کے اس کردار کی پیاس کو پیش کیا ہے جس کی پیاس کا تذکرہ سن کر کسی بھی صاحب اولاد انسان کا کلیجہ پھٹ جاتا ہے۔ 'پانی اور پیاس' دراصل کیمپس کے ایک طالب علم کی پیاس کی کہانی ہے جو شدت عطش سے اپنے وائس چانسلر کو یزید سے تشبیہ دیتا ہے۔ یہی استعاراتی جملہ کہانی کار کو واقعۂ کربلا کے اس ششماہے کی پیاس کی طرف لے جاتا ہے جسے تاریخ نے علی اصغر لکھا ہے۔

اسلم جمشید پوری نے جس خوبصورتی کے ساتھ سانحۂ کربلا کو اس افسانے کی زینت بنایا ہے، یہ ان کی تاریخ کے ساتھ فکشن پر فنکارانہ مہارت کا ثبوت ہے کیونکہ کربلا کے جس واقعے کو اس افسانے کا بیانیہ بنایا گیا ہے وہ واقعہ یزیدی فوج کی بے حسی اور درندگی کو بے نقاب کرتا ہے۔

''حسین بچے کو لیے ہوئے خیمے سے باہر آئے۔ باہر سورج آسمان پر قہر برسا رہا

تھا۔ نیچے زمین تپش کے مارے انگارہ بنی ہوئی تھی۔ ریگ زار میں بے گور و کفن ساتھیوں کے لاشے دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ سامنے عدو کا لشکر تھا جو ہر حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ انھیں فتح قریب نظر آ رہی تھی۔'' (پانی اور پیاس)

اس کہانی کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلم جمشید پوری کو نفسیات پر مکمل عبور حاصل ہے۔ انھوں نے اپنی کہانی کے ہیرو کو اس بات کا احساس دلایا ہے کہ کسی کی بھی پیاس علی اصغر کی پیاس سے شدید نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ہیرو علی اصغر کی پیاس کے تصور سے کانپ جاتا ہے اور اسے اپنی پیاس کی شدت ہیچ معلوم ہوتی ہے۔ اسلم جمشید پوری کا متذکرہ افسانہ اس لیے بھی کامیاب ہے کہ اس میں عصری حسیت پائی جاتی ہے۔ کیوں کہ پانی کا مسئلہ ایک عالمی مسئلہ ہے اور علی اصغر کی پیاس کا ذکر کر کے اسے آفاقیت مل گئی ہے۔ طلبا کی سیاست، طلبا اور انتظامیہ کا ٹکراؤ اس بیچ انتظامیہ کا پانی کا بند کرنا، یہ ایسے اقدامات تھے جس سے وہ طالب علم چودہ سو سال پہلے کے دنیا کے سب سے بڑے دہشت گرد یزید سے وائس چانسلر کی تشبیہ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

واقعۂ کربلا اور شہادت امام حسین کے بعد دنیا کی تاریخ میں جو بھیانک جرم سرزد ہوا وہ خانوادۂ رسالت یعنی اہل حرم کی اسیری ہے۔ اس موضوع پر وسیم حیدر ہاشمی کا افسانہ 'فتح نامہ' اور فرقان سنبھلی کا افسانہ 'شہادت کے بعد' اہمیت کے حامل ہیں۔ فرقان سنبھلی نے اپنے افسانے میں اہل حرم کی اسیری اور ابن زیاد کی سر حسین کی بے حرمتی کے واقعہ اور صحابی رسول حضرت عبداللہ بن عفیف کی صدائے احتجاج کو مکالماتی شکل دے کر فکشن کا حصہ بنایا ہے:

''کوفہ کے حاکم کا دربار سجا ہوا تھا۔ محفل جشن میں ڈوبی ہوئی تھی کہ ایک سر تھال میں سجا کر حاکم کے سامنے پیش کیا گیا۔ حاکم نے مطلوبہ سر دیکھتے ہی کھل کر قہقہہ لگایا۔ لگتا تھا اس پر جنون طاری ہو گیا ہے۔ پھر اس نے ایک چھڑی اٹھالی۔ ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ وہ دھیرے دھیرے ٹہلتے ہوئے تھال میں رکھے سر کے قریب پہنچا اور اس کے نازک اور بے جان ہونٹوں پر مارنے لگا۔''

اس شیطانی فعل کے خلاف صحابی رسول حضرت عبداللہ بن عفیف نے صدائے احتجاج بلند کی لیکن یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ ظالم اپنی بے بسی کا اظہار قتل کی دھمکی سے دیتا ہے، ابن زیاد نے بھی یہی کیا۔ اس پس منظر میں فرقان سنبھلی کے یہ مکالمے قابل دید ہیں:

''بس کرو...... یہ وہ لب ہیں جو ہمارے آقا کا بوسہ لیا کرتے تھے اور تم ان کی

بے حرمتی کر رہے ہو۔ لعنت ہے تم پر۔ بزرگ کی بات حاکم کو بے حد ناگوار گزری۔ اس نے خفا ہو کر کہا۔ بکواس مت کرو...... اگر تم اس قدر بوڑھے نہ ہوتے تو تمھیں ابھی اسی وقت قتل کر دیتا۔ اب جاؤ...... اور میری آنکھوں کے سامنے سے دفع ہو جاؤ۔"

واقعۂ کربلا کے بعد اہل حرم کی اسیری کے درمیان امام حسین کی بہن جناب زینب نے ابن زیاد اور یزید کے دربار میں اسلام کی حقانیت کو اجاگر کیا اور ظالم کے چہرے سے نقاب اتار کر پھینک دی۔ اس جرأت نے نہ صرف یہ کہ امام حسین کی شہادت کی عظمت کو دنیا کے سامنے اجاگر کیا بلکہ عورت کے وقار کی عکاسی بھی کی۔ اس پس منظر میں حاکم کوفہ و شام اور جناب زینب کی گفتگو ظالم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گفتگو کا سلیقہ عطا کرتی ہے۔ اکیسویں صدی میں بھی جناب زینب کے کردار کے ذریعہ فرقان سنبھلی نے بتایا ہے کہ عورت کبھی کمزور نہیں رہی ہے۔ جہاں مرد اپنے فرائض کو ادا کر کے جام شہادت نوش کر لیتے ہیں وہاں عورت اپنے صبر و ضبط اور عزم و حوصلے سے ظالم کو نیست و نابود کر دیتی ہے۔

شہادت کے بعد کے موضوع پر دوسرا اہم افسانہ وسیم حیدر ہاشمی کا 'فتح نامہ' ہے، جسے ہاشمی نے داستان کے انداز میں بیانیہ کا روپ دیا ہے۔ کہانی اس وقت شروع ہوتی ہے جب عمر سعد اور شمر ذی الجوشن ظاہری فتح کے زعم میں حاکم وقت یزید کو اطلاع دینا بھول گئے اور ایک افسر نے انھیں متوجہ کیا کہ رقص و سرود کی محفل تو جم گئی لیکن کیا حاکم وقت کو اطلاع بھجوادی گئی کہ ہم فتحیاب ہو گئے۔ سوار فتح نامہ لے کر روانہ ہوا۔ اس روانگی کے منظر نامے کو وسیم حیدر ہاشمی نے داستانی روپ دیا ہے۔ انھوں نے جو ماحول بیان کیا ہے وہ ایسا ہے جیسا دہلی کے کسی مغل شہنشاہ کا دربار ہے۔ اس ماحول میں واقعۂ کربلا کا منظر نامہ اس طرح پیش کیا گیا ہے:

> "بادشاہ وقت کو ان کی فوج کی کامیابی مبارک ہو۔ کل علی الصباح ہم لوگوں نے یکبارگی ہزار ہا تیر مخالفین کی طرف پھینک کر اپنی طرف سے جنگ کا اعلان کر دیا۔ مخالفین جو کہ نماز فجر کے لیے جا رہے تھے، ان میں سے تقریباً تیس افراد اور مختلف مقامات پر کھڑے ان کے سات گھوڑے آن کی آن میں موقعۂ واردات پر ہی ہلاک ہو گئے۔ صرف بہتر افراد پر مشتمل ایک چھوٹے سے لشکر کے اتنے لوگوں کے جنگ کیے بغیر اچانک خاتمے سے ان کی فوجی طاقت آدھی رہ گئی۔ ہماری طرف سے فتح کے نقارے بج اٹھے۔"

وسیم حیدر ہاشمی نے جنگ مغلوبہ کے بعد یکے بعد دیگرے شہادت کا ذکر کیا ہے لیکن اس سے پہلے امام حسین کا فوج یزیدی کو وعظ و نصیحت کرنا، جناب حر کا امام حسین کی طرف آنا، جناب عباس کی ہیبت اور شہادت اور پھر زخمی امام حسین کا سجدۂ آخر اور شہادت عظمیٰ کے واقعات کو اس خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ گویا مصنف

خود ان واقعات کا تصوراتی گواہ ہو۔ امام حسین کی شہادت بیان کرتے ہوئے افسانہ نویس لکھتا ہے:

> "بہ مشکل تمام ایک نے ان کا سر تن سے جدا کیا اور آپ کے نام پر ایک عظیم فتح کی مہر لگ گئی۔"

فتح نامے کو سن کر بادشاہ کے حکم کو وسیم حیدر ہاشمی نے جس طرح بیان کیا ہے اس سے یزید کی بربریت اور اہل حرم کے ساتھ نا روا مظالم کی داستان سامنے آتی ہے:

> "میرا اگلا حکم یہ ہے کہ مخالف کے بچے ہوئے تمام افراد کو گرفتار کر لیا جائے۔ ان کے تمام مال و اسباب کو ضبط کر لیا جائے۔ عورتوں کے سروں پر چادریں تک نہ چھوڑی جائیں۔ تمام عورتوں اور بچوں کو بے محمل اور بے کجاوا اونٹوں پر بٹھا کر مرحوم سردار کے بیمار بیٹے کے ہاتھوں میں ہتھکڑی، پیروں میں بیڑیاں، کمر میں لنگر اور گلے میں خاردار طوق ڈال کر پا پیادہ دولت کے حضور پیش کیا جائے۔ میں بچے ہوئے تمام افراد کا تماشہ بناؤں گا اور پھر شہر کے بھیانک ترین قید خانے میں قید کروا دوں گا، جہاں ان کے ہمراہ یہ داستان دفن ہو جائے گی۔"

لیکن یزید کو کیا معلوم تھا۔ ع:-

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے

وہ سوچتا تھا کہ آنے والا کل رسولؐ کی نہیں بلکہ میری سنت پر عمل کرے گا۔ لیکن یزید کے بھرے دربار میں یزید کے موذن نے محمدؐ کی رسالت کی گواہی دے کر بتایا کہ سنت محمدی ہی قیامت تک رائج رہے گی۔ کربلا میں شہادت حسین اصل میں سنت محمدی کو بچانے کے لیے پیش کی گئی تھی اور سنت محمدی کا وجود حسینؑ کی فتح و کامرانی کی علامت ہے۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ نئے کہانی کاروں نے بھی اپنی کہانیوں میں واقعات کربلا کو جس سلیقے سے پیش کیا ہے وہ اس بات کا اشاریہ ہے کہ اردو کے نئے کہانی نویسوں نے بھی جملہ موضوعات کے ساتھ واقعۂ کربلا کا بھی خوبصورت بیان کیا ہے۔

☆☆☆

Dr. Abid Husain Haideri
Principle MGM P.G. College,
Sambhal, U.P, Mob. 9411097150
E-Mail: drabidhusain@gmail.com

فارسی کے جام جم ڈاکٹر سید حسن عباس

نورالسعید اختر

واقعی دوست ہوتو ایسا، یعنی 'جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی تصویر یار'۔ ڈاکٹر سید حسن عباس محض میرے دوست ہی نہیں بلکہ میرے ہمدم دیرینہ، رفیق شفیق اور حبیب بے عدیل ہیں۔ حسن عباس بے حد حساس اور ذہین تھے اور ہیں۔ فارسی اور اردو ادب پر اچھا خاصا درک رکھتے ہیں۔ دوستوں کے ہجوم میں بھی حسن عباس مطالعے میں مست رہتے ہیں۔ انھیں بچپن ہی سے کتابوں سے انسیت رہی ہے۔

ادھر حسن عباس علمی و ادبی میدانوں میں دانش و فراست کے گھوڑے پر سوار ہو کر بڑی تیزی سے میدان مارتے گئے۔ ان کی کوشش اور جذبۂ شوق نے انھیں آخر وہاں پہنچا ہی دیا جہاں ان کا نصب العین تھا۔ وہ ایک طے شدہ پروگرام کے تحت تہران گئے تھے۔ ان کے پروجکٹس ان کے ہمراہ تھے جنھیں وہ ایران کے دورانِ قیام مکمل کر لینا چاہتے تھے۔ حسن عباس میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ دوستوں کی رگ پر ہاتھ رکھ کر نئے دوست کو پرکھ لیا کرتے تھے۔ چنانچہ موصوف نے اپنے طبعی تھرمامیٹر کو دیکھ کر ساری باتوں کا خلاصہ کر لیا اور طے کر لیا کہ اس نئے فارسی داں دوست کو 'یار غار' بنانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہی وہ دوست تھا جو حسن عباس کی ایران میں آمد سے قبل ایران تشریف لایا تھا لیکن تنہائی سے تنگ آ کر ایک ہفتہ ہی میں اپنے وطن لوٹ گیا تھا۔ وہی دوست، حسن عباس کی ایما پر دوبارہ ایران واپس آیا تھا۔ البتہ حسن عباس کی اس نو آمد دوست سے قربت تھی تو صرف مراسلت کے ذریعے۔ حسن عباس کو پہلے سے معلوم تھا کہ ان کا نیا دوست 'عارف نوشاہی' (اب ڈاکٹر عارف نوشاہی) نہ صرف فارسی زبان و ادب کا ماہر ہے بلکہ ان کا ہم پیشہ اور ہم مزاج بھی ہے۔ دونوں کتابوں کے رسیا اور مخطوطات کے عاشق ہیں۔ سب سے اہم چیز جو دونوں کی نمایاں تخصیص تھی، وہ دونوں کے دماغ کی یکساں برقی رو جسے انگریزی میں lengthwave کہا جاتا ہے۔ اتنی ساری یکسانیت دونوں دوستوں میں رہنا ایک عجوبے سے کم نہیں ہے، لہٰذا یہ دونوں 'یک جان و دو قالب' کے

مصداق ہو گئے۔ اللہ کی مہربانی سے دونوں دوستوں کی خوش قسمتی تھی کہ انھیں ایسے دلدار، محقق اور فاضل دوست غیر ملک میں میسر آئے۔ ڈاکٹر عباس نے اس دوستی کو زندۂ جاوید رکھنے کے لیے آزادؔ بلگرامی پر لکھی گئی بے مثال کتاب اپنے دوست کے نام معنون کی ہے۔ یہ موضوع بھی اسی دوست نے منتخب کیا تھا۔ اس کتاب کے بارے میں معروف استاد ایرج افشار نے جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے، دیکھیے کیا لکھتے ہیں:

> ''جناب عباس کی آزادؔ پر کتاب تحقیق کے مستحکم ستونوں پر استوار ہے اور اس کتاب کے ذریعے ادبیات فارسیِ ہند کے ایک معروف ادیب و سخن شناس کو پوری طرح متعارف کرایا گیا ہے۔''

حسن اتفاق سے میرے قیام ایران کے زمانے میں ڈاکٹر عارف نوشاہی، راقم پر بھی مہرباں رہے تھے اور شیخ سعدی کے قول کو سچ کر دکھایا تھا:

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست   در پریشاں حالی و درماندگی

ہوا یوں تھا کہ جامعۂ تہران کے سربراہ نے تحقیقی کاموں کے لیے راقم کے ایران میں قیام کرنے کی مدت میں توسیع کر دی تھی اور راقم کو اطمینان دلایا تھا کہ وہ میری قیام گاہ (پنج ستارہ ہوٹل) والوں کو فیکس (Fax) کے ذریعے مطلع کر دیں گے۔ اس لیے مجھے وہاں مزید قیام کرنے میں کوئی دقت نہ ہوگی۔ راقم مختلف کتاب خانوں سے ضروری مواد لے کر شام کو جب ہوٹل پہنچا تو منیجر نے مجھ سے فوراً کہا کہ ''آغا، مہمانی تمام شد۔'' یعنی آپ کی مہمانی ختم ہوئی اور آپ ہوٹل کا کمرہ خالی کر دیں۔ یہ سنتے ہی میرے ہوش اڑ گئے کہ اب نئے ٹھکانے کا انتظام کیسے کروں؟ راقم نے فوراً طے کیا کہ صرف عارف نوشاہی کے یہاں پناہ مل سکتی ہے۔ چنانچہ فوری طور پر ان کے گھر پہنچا اور ساری روداد بیان کی۔ موصوف نے دعوت شیراز کا اہتمام کیا اور اس کے بعد راقم کا ایک ہاسٹل میں رات بسر کرنے کا انتظام کر دیا۔ دوسرے دن صبح میں اٹھ کر اپنا بوریا بستر سمیٹنے جونہی ہوٹل پہنچا تو وہاں کا منظر ہی کچھ اور تھا۔ منیجر مجھ سے بار بار معافی کا خواستگار تھا۔ اس نے بتایا کہ میرے ہوٹل سے جاتے ہی جامعۂ تہران کے سربراہ کا فیکس آیا جس میں مہمانی کی مدت بڑھا دی گئی ہے۔ میں نے اپنا سامان اور اچھے کمرے میں رکھا اور الٹے پیر نوشاہی بھائی کے گھر پہنچا اور انھیں سارا ماجرا سنا کر ہوٹل چلنے کے لیے اصرار کیا۔ عارف بھائی نے میری بات مان لی اور راقم کے ساتھ ہوٹل آئے اور دونوں نے نہایت نفیس کھانا کھایا۔ عارف بھائی کی خوراک بہت کم ہے لہٰذا وہ فروٹ جوس وغیرہ سے لطف اندوز ہوئے۔ ہم دونوں نے خوب گپیں لڑائیں اور اپنے اپنے کاموں کی تفصیل بتائی۔ راقم نے شیخ سعدی کے قول کی تعبیر حقیقت میں دیکھ لی۔ آج سے تین سال قبل راقم کراچی گیا ہوا تھا۔ 'مجھے' چند کتابوں کی ضرورت تھی، جس میں ایک کتاب بھائی

عارف کی مرتب کردہ تھی۔ میں نے کتاب کے دام ان کے نام روانہ کر دیا۔اس وقت وہ اسلام آباد میں تھے۔ جونہی میرا مکمل نام دیکھا مجھے فون کیا اور روپیہ ارسال کرنے پر ناراض ہوئے۔ دوسرے تیسرے دن کیا دیکھتا ہوں مختلف کتابوں کا پارسل میرے نام بھیجا گیا ہے۔اس پارسل میں عارف بھائی کی تصانیف کے علاوہ اور دوسری کتابیں بھی تھیں جو راقم کی دلچسپی کی تھیں۔ بہرکیف، میں جتنے روز کراچی میں رہا موصوف کے فون برابر آتے رہے۔آج کل ان کے فون نہیں آرہے ہیں۔ شاید حالات کا تقاضا ہو یا ان کی بے پناہ مصروفیات ہوں۔اس ساری داستان کا ایک ہی مقصد ہے کہ تینوں ہم مزاج، ہم پیشہ اور ایک دوسرے کے رفیق وحبیب ہیں۔ عارف بھائی ہیں تو دھان پان آدمی لیکن بلا کے ذہین ہیں۔ تحقیق وتدقیق ان کی شریانوں میں رچی بسی ہے اور ایرانیوں کی طرح جدید فارسی بولنے اور لکھنے پر قادر ہیں لہٰذا ایرانیوں کے ادبی حلقوں میں ان کی خوب پذیرائی ہوتی ہے۔خوش بختی سے ڈاکٹر سید حسن عباس کو پردیس میں عارف نوشاہی جیسا یا نوشاہی کو عباس جیسا ہمدرد، غمگسار، ہمکار اور تحقیق نواز ساتھی مل گیا، اس لیے دونوں ہر کام ساتھ ساتھ کرتے تھے۔ دونوں دیوانہ وار نایاب کتابیں اور مخطوطات کی فہرستیں خریدا کرتے۔ اکثر ایسی دوکانوں کی کھوج کرتے جہاں ان کو مطلوبہ کتابیں میسر آتیں۔ اگر ایک اپنے لیے کوئی کتاب پسند کرتا تو ایک نسخہ اپنے دوست کے لیے بھی خرید لیتا۔ اگر ایک کی جیب خالی ہوتی تو دوسرا قیمت ادا کر دیتا اور 'حساب دوستاں دردل' والا معاملہ ہوتا۔ جب کتابوں کے ڈھیر ان کے کمروں میں جمع ہو جاتے اور وہ سرسری طور پر کتابوں کی ورق گردانی کرنے کے بعد جو کتابیں رکھنے کی ہوتیں انھیں تو وہ رکھ لیتے بقیہ کتابیں اپنے اپنے وطن بھیجنے کی فکر کرتے۔اس زمانے میں ایران سے کتابوں کی ترسیل کچھ آسان نہ تھی۔ ایرانی دوستوں سے دفترچہ (شناختی کارڈ) حاصل کرتے۔ پوسٹ آفسوں تک تھیلا بردار جاتے۔ کتابیں بھیج کر کبھی سرخ رو ہوتے اور خود کو ایک قسم کا فاتح سمجھتے۔کبھی بے نیل مرام کتابوں کا بوجھ اٹھائے اپنے ٹھکانوں پر بھاری اور تھکے تھکے قدموں سے پہنچتے، جیسے میلوں پیدل چل کر آئے ہوں۔لیکن جب کتابیں حسب منشا پوسٹ ہو جاتیں تو خوش ہوتے اور شاید کوئی نہ کوئی یہ ضرور کہتا ہوگا: ''وہ کام کیا ہم نے جو رستم سے نہ ہوگا!'' اور ہنسی خوشی گھر لوٹتے۔(اس کی تفصیل عارف نوشاہی کی ارمغان ہندوستان میں دیکھیے)

اس طرح دونوں نے جامعۂ تہران سے اعلیٰ سندیں حاصل کیں۔ کتابوں کے انبار (متعدد بکسے) اور نایاب قلمی نسخوں کی فوٹو کاپیاں اپنے ساتھ لے آئے۔اب اطمینان سے ان پر تحقیقی مقالات یا کتابیں مرتب کر رہے ہیں۔اس وقت پاکستان کی ادبی دنیا میں جو مقام میرے دستگیر ڈاکٹر عارف نوشاہی کا ہے وہی درجہ کم وبیش ہندوستان کے فارسی داں حلقوں میں ڈاکٹر سید حسن عباس کا ہے۔ خدا انھیں ہر نصب العین میں کامیاب کرے۔

آج کل ڈاکٹر حسن عباس کا طوطی بول رہا ہے اور مختلف ادبی ادارے انھیں اعزازات سے نوازتے

جا رہے ہیں۔ فارسی اور عربی ادبیات میں تاریخی، تخلیقی اور لسانی اعتبار سے میر غلام علی آزادؔ بلگرامی (۱۱۱۶--۱۲۰۰ھ) کی شہرت اور کارہائے نمایاں کے سبھی قائل ہیں۔ ان میں سے کچھ نے آزادؔ بلگرامی کی حیات وافکار تک اپنے رہوارِ قلم کو ایڑ لگائی ہے لیکن ان میں سے کسی نے آزادؔ بلگرامی کی مجموعی کارگزاریوں پر قلم اٹھانے کی جرأت نہیں کی۔ مجھے اپنے جانباز ادب نواز دوست حسن عباس کی ہمت اور تحقیقی شعور پر ناز ہے کہ انھوں نے ایک آگ کے دریا سے ڈوب کر گوہر مقصود نکال لانے کو اپنا مطمح نظر بنایا۔ دراصل یہ کام ادبی کوہکنی سے کم نہیں تھا۔ اس میں فرہاد کی مانند تیشہ برداری لازم تھی اور مختلف زبانوں سے بہنے والی نہروں سے قطرہ قطرہ پانی سمیٹنا تھا۔ گویا انھیں آتش نمرود میں چھلانگ لگانی تھی۔ یہ نہایت صبر آزما اور دقت طلب کام تھا۔ حضرت آزادؔ بلگرامی صرف نام کے آزاد نہیں تھے بلکہ انھوں نے ادبی، تحقیقی ولسانی میدانوں میں خاص کر شاعری اور تذکرہ نگاری میں اپنی خلاق آزادانہ طبیعت کے جوہر نمایاں کیے ہیں اور وہ بھی اورنگ آباد 'دکن' جیسے دور دراز مقام میں قیام کرتے ہوئے۔ موصوف نے کون سا ایسا علمی وادبی کام تھا جو انجام نہیں دیا۔ آزاد بلگرامی کی کاوشات کا منظرنامہ بے حد وسیع ہے حتیٰ کہ ان کے تلامذہ نے یہ جرأت نہیں کی اور بالآخر یہ ناتواں شخص اس بارگراں کو اپنے ملک سے کوسوں دور جا کر اٹھا لایا۔ رستم نے تو صرف پہلوانی کی، گھڑسواری اور شمشیرزنی وتیراندازی کے جوہر دکھائے تھے لیکن سرزمین بہار کے موضع گوپال پور کے ضیغم نے وہ کام کیا جو رستم سے نہ ہوا تھا۔ خدا کرے حسن عباس کے وہ تمام کام مکمل ہو جائیں جن کا تعلق آزادؔ بلگرامی کی شخصیت اور علمی کارناموں سے ہے۔ میں تو ڈاکٹر حسن عباس کی تحقیقی بصیرت کا اس قدر معترف ہو چکا ہوں کہ انھیں 'حسن عباس' کے الفاظ سے مخاطب کرنے لگا ہوں۔ حسن عباس کی علمی فضیلت کا یہ حال ہے کہ انھوں نے 'مولانا آزادؔ بلگرامی کے احوال اور فارسی تصانیف کا جائزہ' فارسی زبان میں لکھا ہے جو کافی ضخیم ہے اور بڑی آن بان اور شان سے ایران میں شائع ہوا ہے۔ میرے محسن نے مجھے اس کی ایک جلد روانہ کی ہے جس کا میں گاہے گاہے مطالعہ کرتا رہتا ہوں اور ادبی معلومات سمیٹتا رہتا ہوں۔ بقول شخصے:

گاہے گاہے اسے پڑھا کیجے   اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں

موصوف نے اپنا تحقیقی مقالہ جامعہ تہران کے اساتذہ پروفیسر اسماعیل حاکمی، پروفیسر جلیل تجلیل اور پروفیسر مظاہر مصفّا کی زیر نگرانی مکمل کیا ہے۔ جن اہل علم نے ان کے اس کام میں کسی نہ کسی طور تعاون کیا، مقدمے میں ان سب کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ اس مقالے کے زبانی امتحان (Viva) کے جلسے میں ایرانی اساتذہ کے علاوہ برصغیر کے نامور استاد پدم شری پروفیسر نذیر احمد صاحب (م:۲۰۰۸ء) اور پاکستان سے ڈاکٹر سلیم اختر صاحب نیز ڈاکٹر عارف نوشاہی جیسے صاحبان علم وتحقیق نے شرکت کی تھی۔ ان

صاحبان نے حسن عباس کی تحقیق، جستجو اور تیشہ گری کی تعریف کی اور ان سے توقع رکھی کہ موصوف آزادؔ بلگرامی کی تصانیف کو اسی مقالے کی طرح مرتب کریں گے تا کہ آزادؔ بلگرامی کی ادبی و علمی شخصیت کی تمام جہتیں پوری طرح روشن ہو جائیں۔ ڈاکٹر حسن عباس ایفائے عہد کے لیے شب و روز کوشاں ہیں اور عنقریب اردو زبان میں بھی ان کی کتاب 'مولانا آزاد بلگرامی' منصۂ شہود پر آنے والی ہے۔ اللہ انھیں سرخ رو کرے۔ لیکن ایک مشکل ان کی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے علمی تحقیقی کاموں کے دوران لوگوں کی فرمائشوں کی تکمیل میں بھی لگ جاتے ہیں جس سے ان کا علمی منصوبہ متاثر ہوتا رہتا ہے۔

ڈاکٹر حسن عباس ان خوش قسمت نوجوانوں میں سے ہیں کہ انھیں زندگی کے ہر موڑ پر نابغہ روزگار اساتذہ سے سابقہ رہا ہے۔ ایک کہاوت ہے بِنا گُرو گیان نہیں ملتا ہے۔ جیسے تصوف کے مدارج طے کرنے کے لیے پیر و مرشد درکار ہوتے ہیں تب ہی عارف سلوک کی تمام منزلیں طے کر سکتا ہے۔ انھیں ابتدائی اسکولوں کے علاوہ بہار یونیورسٹی مظفر پور میں بھی اپنے فیلڈ میں ماہرِ فن اساتذہ ملتے رہے۔ حسن عباس صاحب نے نہایت تپاک سے اپنے بے عدیل اساتذہ کے کاموں کا تذکرہ کیا ہے۔ ڈاکٹر حسن عباس کی ادبی رہنمائی کرنے والے پروفیسر محمد سلیمان (مرحوم)، پروفیسر حاتم رام پوری (مرحوم)، پروفیسر عبدالواسع (موصوف نے ڈاکٹر واسع کی نگرانی میں ہی اردو میں پی ایچ ڈی کی سند لی تھی) اور پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ پروفیسر قمر اعظم ہاشمی نے اپنی سوانح 'سر سری اس جہان سے گزرے' میں اور معروف شاعر و استاد پروفیسر ولی الحق انصاری نے اپنی خود نوشت 'مدّ و جزر' میں ڈاکٹر سید حسن عباس کی علمی صلاحیتوں کا بھرپور اعتراف کیا ہے۔

تہران (ایران) میں جن اساتذہ نے ڈاکٹر حسن عباس کے علمی شعور کو پروان چڑھایا اور فارسی زبان و ادب کے رموز و آداب سے روشناس کیا اور علمی بالغ النظری کے غیر تراشیدہ کوہ نور کی فنکارانہ پہلو تراشی کی ان میں ذیل کے اساتذہ شامل ہیں۔ پروفیسر سید جعفر شہیدی (مرحوم)، پروفیسر احمد تفضلی (مرحوم)، پروفیسر سید حسن سادات ناصری (مرحوم)، پروفیسر خانم آموزگار، پروفیسر احسان اشراقی، پروفیسر حسین لسان (مرحوم)، پروفیسر جلیل تجلیل، پروفیسر سجادی، پروفیسر غلام رضا ستودہ۔ ان کے علاوہ پروفیسر شفیعی کدکنی، ایرج افشار اور دیگر اساتذہ سے موصوف نے فیض اٹھایا۔ ڈاکٹر عباس نے ایرانی اساتذہ سے فارسی زبان و ادب اور لہجے کی تمام باریکیاں سیکھیں۔ موصوف نے ۱۸؍اپریل ۱۹۸۶ء سے مارچ ۱۹۹۵ء تک اسلامک ریپبلک آف ایران کے براڈ کاسٹنگ شعبے External Services میں اردو پروگرام میں مترجم اور اناؤنسر (Announcer and Translator) کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ براڈ کاسٹنگ میں دس سال تک خدمات انجام دینے کی وجہ سے حسن عباس فارسی بولنے اور زبان کے

برتنے میں طاق ہو گئے۔ اس کے علاوہ تہران سے شائع ہونے والے اردو جریدے 'ندائے اسلام' میں بھی جز وقتی کام کیا۔ چوں کہ وہ طالب علمی کے دور میں مظفر پور سے رسالہ 'ادراک' نکال چکے تھے، لہٰذا اس تجربے کا وہاں بھی خوب استعمال کیا۔

مشاغل: ایران میں قیام کے دوران ڈاکٹر صاحب نے صرف فارسی علم و ادب کے شہ پارے تلاش کیے اور سوائے لکھنے پڑھنے کے اور کوئی کام نہیں کیا۔ موصوف پر ایک دُھن سوار تھی اور ایسے ہی جنون سے علمی ذخیروں کو سمیٹا جا سکتا ہے۔ موصوف نے ایران کی جتنی معروف و غیر معروف لائبریریاں تھیں، وہ سب دیکھیں۔ یہاں کے نایاب اور اہم کتابخانوں سے استفادہ کیا۔ موصوف نے وہاں کے علمی مراکز کے ذخائر دیکھے اور وہاں کی علمی شخصیات سے خوب فائدہ اٹھایا۔ وہاں کی اہم کتابیں جمع کیں اور فی الوقت موصوف کی ذاتی لائبریری میں ایرانی مطبوعات کا بڑا عمدہ ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ موصوف نے ایران سے سوائے کتابوں کے اور کوئی سوغات کسی کے لیے نہیں خریدی۔ جب موصوف نے ایران کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہا اور وطن واپس ہوئے تو ان کے ساتھ صرف کتابوں کے ۲۰۔۲۵ کارٹون تھے۔ بمبئی ایرپورٹ پر ورود کے بعد موصوف کے ایک بزرگ دوست پروفیسر انصاری نے کسٹم آفیسر کو مراٹھی زبان میں موصوف کی ایران میں علمی فتوحات کے بارے میں تفصیل سے بتایا اور کتابوں پر چارج نہ لینے کی درخواست کی۔ کسٹم آفیسر سمجھدار آدمی تھا۔ اس نے موصوف کی کتابوں کا کرایہ معاف کر دیا، لہٰذا ڈاکٹر عباس اپنے بزرگ دوست کے بے حد ممنون ہیں۔

ڈاکٹر حسن عباس کو ایران میں مخطوطات سے دلچسپی ڈاکٹر عارف نوشاہی کی صحبت میں ہوئی۔ اسی ذوق و شوق کے نتیجے میں ڈاکٹر صاحب کو مخطوطات کی فہرستیں پڑھنے اور خریدنے کا شوق پیدا ہوا۔ موصوف نے راقم کو ایک خط میں لکھا ہے کہ فی الوقت ان کے ذخیرے میں مخطوطات و مطبوعات کی بہت سی فہرستیں اور اشاریے موجود ہیں۔

دراصل ڈاکٹر حسن عباس کو لڑکپن ہی سے کتب بینی کا شوق تھا۔ ان کا یہ ذوق عمر کے لحاظ سے بڑھتا گیا حتیٰ کہ کتب بینی کا صحیح مشغلہ بی۔ اے میں داخلے کے بعد شروع ہوا کیوں کہ انٹرمیڈیٹ میں غیر متوقع طور پر انھیں فرسٹ ڈویژن میں دسویں پوزیشن آ گئی، لہٰذا انھوں نے سوچا کہ اب اگلے امتحانوں میں بھی اس پوزیشن کو برقرار رکھنا ضروری ہے۔ موصوف ہمہ قسم کی کتابیں پڑھا کرتے اور ان سے کام کے اقتباسات نقل کرتے تھے۔ موصوف کو دھیرے دھیرے تحریر کے فن سے آگاہی ہونے لگی اور ان کی سوجھ بوجھ کا کینوس (Canvas) بڑا ہونے لگا۔ خوش بختی سے معروف طنز و مزاح نگار احمد جمال پاشا مرحوم نے جو سیوان

کے زیڈ۔اے۔ اسلامیہ کالج میں اردو کے استاد تھے حسن عباس میں علمی بصیرت کے شرارے دیکھ لیے لہٰذا موصوف ڈاکٹر عباس کو اپنی ذاتی لائبریری سے مطالعے کے لیے کتابیں مہیا کرتے تھے اور ڈاکٹر عباس ان کتابوں کو کبھی تو ایک دو ہی دن میں اور کبھی ہفتے عشرے میں مطالعے کے بعد نہایت سعادت مندی سے لوٹا دیا کرتے۔ پاشا صاحب موصوف کی ایمانداری اور ذوق کتب بینی سے بے حد خوش ہوتے تھے۔ فکر و نظر سے آگہی کے بعد انھوں نے اپنے سلسلے میں ان سے مضمون لکھنے کی فرمائش بھی دبی زبان میں کر ڈالی۔ ڈاکٹر عباس نے ان پر دو مضامین 'احمد جمال پاشا کی کالم نگاری' اور 'احمد جمال پاشا کی خاکہ نگاری' لکھ ڈالے۔ اول الذکر 'نیرنگ خیال' کراچی کے سالنامے میں اور موخر الذکر 'نیا دور' لکھنو میں شائع ہوا۔ 'نیا دور' والا مضمون پاشا صاحب کی وفات کے بعد چھپا تھا۔

ڈاکٹر حسن عباس ہندوستان کے چند نابغۂ روزگار اساتذہ کے ادبی افکار سے از حد متاثر ہیں اور انھیں علمی تبحر رکھنے والے اساتذہ کی موصوف نے جگہ جگہ پیروی کی ہے۔ اس علم و ادب کی کہکشاں میں سرفہرست نام پدم شری پروفیسر نذیر احمد مرحوم کا ہے۔ ان کے علاوہ پروفیسر مختار الدین احمد مرحوم، پروفیسر حکیم ظل الرحمٰن، پروفیسر نادم بلخی مرحوم، پروفیسر حنیف نقوی اور ڈاکٹر زیڈ۔ اے ڈیسائی مرحوم سے بھی وہ بے حد متاثر ہیں۔

پاکستانی اساتذہ جن کے علمی و ادبی کارناموں سے ڈاکٹر عباس بے حد متاثر ہیں ان میں سرفہرست نام مشفق خواجہ مرحوم کا ہے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر عارف نوشاہی، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر معین الدین عقیل، ڈاکٹر اقبال مجددی، ڈاکٹر ریاض الاسلام مرحوم اور ڈاکٹر علی رضا نقوی کے علمی کارناموں سے بھی وہ فیضیاب ہوئے ہیں۔ یہ حضرات بھی انھیں ان کے علمی شغف کے پیش نظر عزیز رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر حسن عباس کی علمی و ادبی کارگزاریاں: ڈاکٹر حسن عباس علم و ادب اور جدید فارسی کے تمام پہلوؤں پر عبور حاصل کر کے ہندوستان لوٹے۔ موصوف نے نہ جانے کیسے کیسے خواب دیکھے ہوں گے۔ لیکن انھیں حسب دلخواہ اسامی کافی جد و جہد کے بعد میسر آئی۔ ابتدا میں موصوف نے رام پور رضا لائبریری میں سینئر کیٹلاگر (Senior Cataloguer) کے عہدے پر ایک سال سے زائد کام کیا۔ موصوف نے یہاں پر لوہارو کلیکشن کے مخطوطات و مطبوعات کی فہرست بنانی شروع کی تھی لیکن وہ اس کو مکمل نہ کر پائے۔ ۱۹۹۶ء میں بہار یونیورسٹی سروس کمیشن پٹنہ کے ذریعے لکچرر منتخب ہو کر رانچی یونیورسٹی کے ایک کالج میں رجوع ہوئے۔ موصوف نے اس کالج میں سات سال تک خدمات انجام دیں، لیکن وہ اس دور افتادہ اور کوردہ مقام پر جانے میں ہی کم و بیش ہفتہ عشرہ غور و فکر کرتے رہے۔ آخر ملازمت کی مجبوری کے پیش نظر اور اعزہ واحباب کے

سمجھانے پر کہ ملازمت کہاں ملتی ہے؟ آخر وہاں بھی لوگ رہتے ہیں؟ وہاں نادم بلخی جیسی نادرۂ روزگار شخصیت بھی تو ہے؟ نادم بلخی کا نام سن کر ان کے چہرے پر ایک چمک آ گئی اور وہ وہاں جانے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ لیکن ایک روز اپنے ایک عزیز کے ساتھ پٹنہ اسٹیشن پر ٹکٹ لے کر ٹرین کا انتظار کرتے رہے اور جب ٹرین آئی اور اس میں لوگوں کی حد سے زیادہ بھیڑ بھاڑ دیکھی تو پروگرام بدل دیا اور واپس چلے آئے۔ پھر دوسرے تیسرے دن رزرویشن کرا کر کسی طرح ڈالٹن گنج پہنچے اور جوائن کیا۔ جوائن کرنے کے بعد پروفیسر نادم بلخی صاحب کی خدمت میں حاضری دی۔ اس کے بعد کا حال خود ان کی زبانی سنیے:

''میں نومبر ۱۹۹۶ء کے اواخر میں اس شہر میں وارد ہوا۔ بہار یونیورسٹی سروس کمیشن پٹنہ کی سفارش پر میرا تقرر رانچی یونیورسٹی کے تحت ڈالٹن گنج کے جی۔ ال۔ اے کالج میں بہ حیثیت لکچرر ہوا تھا۔ یہ وہی کالج ہے جہاں سے ۱۹۹۰ء میں پروفیسر بلخی صاحب بحیثیت صدر شعبہ و پروفیسر متقاعد ہوئے تھے۔ میں نے یہاں آنے کے فوراً بعد ان کی خدمت میں حاضری دی اور مجھے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ پہلی ہی ملاقات میں انھوں نے ہر قسم کا تعاون دینے کا وعدہ کر لیا۔ میرے علاوہ محمد ایوب صاحب کی بھی اسی کالج میں تقرری عمل میں آئی تھی جو مجھ سے ایک ہفتہ قبل جوائن کر چکے تھے اور بلخی صاحب سے مل چکے تھے۔ ان ہی کے ساتھ میں بلخی صاحب سے ملا تھا۔ وہ اس بات سے بے حد خوش نظر آ رہے تھے کہ چھ سات سال تک کالج کا شعبۂ اردو بند رہنے کے بعد اب کھل گیا ہے جہاں انھوں نے زندگی کا ایک طویل عرصہ گزارا تھا اور شعیب راہی مرحوم کی ناگہانی وفات اور ان کے متقاعد ہونے سے سناٹا ہو گیا تھا۔ دو نئے لکچرروں کی آمد کی خبر سن کر پھولے نہیں سماتے تھے۔ ہم لوگوں کے بارے میں بڑھا چڑھا کر دوسروں کو بتاتے تھے کہ یہ ایسے قابل ہیں اور وہ ایسے فاضل ہیں۔ میں تو گھبرایا ہوا تھا کہ نصیب میں کیا کیا دیکھنا لکھا ہے۔ تہران سے آ کر رام پور اور پھر وہاں سے ڈالٹن گنج جس کا نام خواب و خیال میں بھی نہیں تھا اور قدرت نے وہیں سے رزق کا سلسلہ جوڑ دیا تھا۔ مجھے بلخی صاحب سے مل کر یک گونہ اطمینان بھی حاصل ہوا تھا کہ اس شہر میں دل لگنے کی اگر کوئی جگہ تھی تو ان ہی کے پاس جہاں ہر نوع کی کتابوں کا انبار ہے اور خود بلخی صاحب وسیع المطالعہ ہونے کے ساتھ قدیم و جدید رجحانات کے حامل اور ادبی رفتار سے بھی واقف تھے۔ بلخی صاحب کے درِ دولت سے جو وابستگی پہلے دن سے ہوئی تھی وہ روز افزوں بڑھتی گئی۔ ان کے ذخیرۂ کتب

سے جس قدر ممکن تھا استفادہ کر رہا تھا۔'' (ذکر نادم بلخی مرتبہ سید حسن عباس، ص ۱۳)

جنوری ۲۰۰۴ء میں ڈاکٹر صاحب کا بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں تقرر ہو گیا اور بہ فضل خدا ڈاکٹر عباس اس وقت ریڈر اور صدر شعبۂ فارسی کے عہدے پر فائز ہیں (موصوف فی الوقت رام پور رضا لائبریری کے ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہیں، مدیر)۔ موصوف کے لیے بی۔ ایچ۔ یو جیسی مشہور ومعروف یونیورسٹی ان کے علمی تبحر اور تحقیقی و ادبی کاموں کے لیے نہایت مناسب مقام ہے۔ انشاء اللہ وہ اپنی لیاقت اور تصنیف و تالیف کے بے مثال کاموں سے بہت جلد مزید ترقی کی منزلیں طے کریں گے اور وہ عالم گیر شہرت حاصل کرلیں گے۔

راقم کے محسن اور ہمدم نے اپنی معلومات کا پس منظر اس قدر وسیع کرلیا ہے کہ اب ان کا شمار فارسی اور اردو کے نادر الوجود اساتذہ میں ہونے لگا ہے۔ موصوف نے آزاد بلگرامی پر جس جستجو اور تحقیقی شعور کے ساتھ ایک معیاری تحفہ فارسی کی ادبی دنیا کو بطور سوغات دیا ہے بس یہی ایک ادبی کارنامہ موصوف کی شہرت و علمیت کا سرتاج ہونے کے لیے کافی تھا۔ اس قدر اوصاف کے باوجود موصوف نہایت منکسر المزاج ہیں۔ غرور، فخر اور انا انھیں چھو کر نہیں گیا ہے۔ موصوف دوستی نبھانے کے فن سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ راقم نے موصوف سے جب بھی کوئی ادبی فرمائش کی موصوف نے عمل برآری میں دیر نہیں کی۔ وہ محقق کے مواد کے حصول میں تعجیل، تجسّس اور بے صبری سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ڈاکٹر عباس کی ادبی فتوحات دیکھ کر راقم نے اپنے ذہن و ضمیر کے تاریک گوشوں کو از سر نو روشن کرنے کی جسارت کی ہے اور اپنے آدھے ادھورے تحقیقی کاموں کی تکمیل کا محدود بصارت کے باوجود نصب العین بنا چکا ہے۔ ایران میں دس سال گزارنے کے باوجود موصوف کے لب و لہجے میں کہیں سے تفاخر کا انداز نہیں پایا جاتا۔ موصوف کی جدید فارسی کی تحریریں اگر ایرانیوں کے ہم پلّہ نہیں کہی جاسکتیں تو کم تر بھی نہیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ بار بار 'قربانت شوم آغا' کا نعرہ بھی بلند نہیں کرتے جب کہ ایرانیوں کا یہ وطیرہ ہے۔ خاص طور پر ایرانی دوشیزائیں جب یہ جملہ کہتی ہیں تو نو وارد مغالطہ میں پھنس جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ لایعنی جملہ ہے۔ یہ تو شیریں سخن لوگوں کا ایک روزمرّہ ہے، یا ان کا کلچر ہے، یا ان کا انداز تخاطب۔ ڈاکٹر صاحب کے مخصوص دوستوں کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے۔ اللہ اس میں انھیں برکت دے۔

ڈاکٹر حسن عباس صاحب ایک نہایت فعال اور سیماب صفت انسان ہیں۔ انھیں نچلا بیٹھنا پسند نہیں ہے۔ وہ ہر لمحہ سے ادبی عرق کھینچنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ دراصل تحقیقی جنون رکھنے والے پیدائشی طور پر بے کل ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب صبح کب اٹھتے ہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ راقم کو سورج نے کبھی سوتے نہیں دیکھا۔ آج اس عمر میں بھی صبح تین بجے اٹھ کر ادبی کاموں میں جُٹ جاتا ہے، ورنہ ان کاموں کا

تکمیل ہو پانا ممکن نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے طالب علمی کے زمانے میں پروفیسر قمر اعظم ہاشمی اور مخصوص احباب ڈاکٹر ولی احمد ولی اور ڈاکٹر محمد سلیم اللہ کے تعاون سے 'ادراک' کے نام سے ۱۹۸۲ء میں مظفر پور سے ایک اردو ادبی جریدے کا اجرا کیا تھا۔ اس کے تین شمارے منظر عام پر آئے اور جنوری ۱۹۸۴ء کے بعد یہ بند ہو گیا۔ یہ صرف اردو ادب سے متعلق تھا۔

۱۹۸۶ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے ڈاکٹر صاحب ایران چلے گئے جس کے سبب یہ کاروبار شوق نہ صرف کھٹائی میں پڑ گیا بلکہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔ ۱۹۹۵ء میں ایران سے لوٹنے پر دوبارہ 'ادراک' کو زندہ کرنا چاہا لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ 'ادراک' کے سرپرست و احباب بھی گزشتہ دس برسوں میں ملازمت وغیرہ کے چکّر میں ادھر اُدھر ہو گئے، لہٰذا موصوف نے ہمت کر کے ۲۰۰۱ء میں گوپال پور (سیوان) سے اس رسالے کو ذاتی طور پر شائع کیا، البتہ اپنے قدیم ہم کاروں کے ساتھ مشورے کے بعد۔

۱۹۹۲ء میں ڈاکٹر صاحب نے 'مرکز تحقیقات اردو و فارسی، گوپال پور' کے نام سے اپنے آبائی وطن میں ایک علمی ادبی مرکز کی بنیاد ڈالی تھی اور 'ادراک' کو اس کا ترجمان بنا دیا۔ ان تبدیلیوں کی وجہ سے 'ادراک' کی ادبی حیثیت میں اضافہ ہو گیا ہے اور اس کے موضوعات میں وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ اردو، فارسی، عربی ادبیات کے ساتھ تاریخ ہند و ایران، علمی مراکز، علمی شخصیات، کتاب و مخطوطہ شناسی، کتبہ شناسی، مکتوبات، فہرست مخطوطات، کتابوں کا تعارف وغیرہ موضوعات سے متعلق مضامین 'ادراک' کو اسم بامسمّٰی بناتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے 'ادراک' کی تجدید اشاعت کے بعد سے اب تک سات شمارے شائع کیے ہیں جن میں ۲۰۰۵ء میں 'حکیم سید ظل الرحمٰن نمبر'، ۲۰۰۷ء میں گوشۂ مشفق خواجہ اور اب ۲۰۱۰ء میں 'حنیف نقوی نمبر' یادگار نمبر کہے جاسکتے ہیں جنھیں ہمارے علمی حلقے نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے۔

ڈاکٹر صاحب آج کل 'فصیح الدین بلخی نمبر' اور 'احمد جمال پاشا نمبر' نکالنے کی ٹوہ میں لگے ہوئے ہیں۔ (فصیح الدین بلخی نمبر ۲۰۱۵ء میں زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے اور احمد جمال پاشا نمبر ابھی زیر اشاعت ہے، مدیر) وہ صدق دل سے اس کام میں دامے درمے کوشاں ہیں، اس لیے انشاء اللہ کامیابی ان کے قدم چومے گی اور یقیناً یہ یادگار نمبر بھی اردو ادب کے ذخیرے میں کوہ نور سے کم نہ ہوں گے۔ واضح رہے کہ ہندو پاک اور ایران کے معروف جریدوں میں برابر ان کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔

اعزازات:

۱- سعدی ایوارڈ برائے ۲۰۱۱۔ ہندوستان میں فارسی زبان و ادب میں نمایاں خدمات انجام دینے

کے اعتراف میں ایرانی سفارت خانے کے کلچرل کاونسلر نے ۲۰۱۱ء کا 'سعدی ایواڈ' دیا۔ یہ ایوارڈ پہلی بار سب سے کم عمر اسکالر کو دیا گیا ہے۔

۲- ڈاکٹر سید عارف نوشاہی جیسے محقق و استاد نے اپنے مضامین فارسی کے مجموعے 'مقالات عارف' جلد دوم (مطبوعہ تہران، ۲۰۰۷ء) کا انتساب ڈاکٹر حسن عباس کے نام کیا ہے جو کسی بھی اعزاز سے کم نہیں۔ دیکھیے وہ کن الفاظ میں ڈاکٹر عباس کو یاد کرتے ہیں:

> ''پیشکش بہ دوست عزیز دکتر سید حسن عباس، محقق ادبیات اردو و فارسی در ہندوستان۔ در سال ہای ۷۳-۱۳۶۹ش با او در دانشکدۂ ادبیات و علوم انسانی دانشگاہ تہران ہمدرس بودم، باہم می نشستیم و می اندیشیدیم کہ در آیندہ، در کشور ہای خود، از چہ راہ ہای خدمتی بہ فرہنگ و ادبیات فارسی خواہیم کرد۔ او بعداً در زادگاہ خود گوپال پور 'مرکز تحقیقات اردو و فارسی' را تاسیس کرد و مجلہ ای تحقیقی 'ادراک' را ایجاد کرد و فرزند خود را نیز بہ راہ تحقیق و درس فارسی تربیت می کند۔
>
> ما و مجنون ہم سفر بودیم در دشت جنون　　او بہ منزل ہا رسید و ما ہنوز آوارہ ایم''

۳- ایران کلچر ہاؤس کے مرکز تحقیقات فارسی کے علمی، ادبی مجلّے 'قند پارسی' کے تقریباً ہر شمارے میں ڈاکٹر عباس کا کوئی نہ کوئی مضمون شامل اشاعت ہوتا ہے اور اب وہ اس کی مجلس مشاورت میں بھی شامل کر لیے گئے ہیں۔

۴- ایران سے شائع ہونے والے 'ایرانین انٹرنیشنل جرنل فار اسلامک مینو اسکرپٹ ریسرچ موسوم بہ 'نامۂ بہارستان' کی مجلس مشاورت میں پروفیسر سید امیر حسن عابدی صاحب کی وفات کے بعد ڈاکٹر عباس کو شامل کیا گیا ہے۔

۵- کولمبیا یونیورسٹی میں قائم انسائیکلو پیڈیا 'ایرانیکا' (مدیر ڈاکٹر احسان یار شاطر) کی طرف سے ڈاکٹر عباس کو مضامین لکھنے کی دعوت دی گئی ہے۔

۶- یو جی سی کی طرف سے کتاب شناسی امیر خسرو دہلوی تیار کرنے کے ایک میجر پروجکٹ پر بھی ڈاکٹر عباس کام کر رہے ہیں۔

☆☆☆

Dr. Noorus Saeed Akhtar
Mumbai, India

تقسیم ہند اور منٹو و بیدی کا پر درد تخلیقی بیانیہ

محبوب حسن

سعادت حسن منٹو اور راجندر سنگھ بیدی اردو فکشن کے دامن آسمان پر چمکتے ہوئے دو ستاروں کی مانند ہیں۔ دونوں کے ذکر کے بغیر اردو فکشن کی محفل بے رونق معلوم پڑتی ہے۔ ان دونوں قلم کاروں کا تعلق ایک مخصوص عہد کی یکساں سماجی، سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی صورت حال سے رہا ہے۔ منٹو اور بیدی نے سماج کی بوسیدہ روایات، توہم پرستی، ناانصافی اور ظلم و استحصال کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ ان دونوں کی تخلیقات میں انسانی درد و غم اور بے بسی و لاچاری کی زیریں لہریں موجود ہیں۔ منٹو نے اپنے افسانوں میں زخم خوردہ طوائفوں کی زندگی کے مختلف رنگ و روپ کو سفاک انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے فن پاروں میں جنسی موضوعات کو مرکزیت حاصل ہے۔ بیدی نے منٹو کی طرح جنسی موضوعات و مسائل کو خصوصی توجہ نہیں دی۔ موصوف کے افسانوں میں انسانی، اخلاقی اور تہذیبی قدروں کی خوبصورت عکاسی موجود ہے۔ وہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں، امنگوں اور نازک جذبات و احساسات کو افسانے کے قالب میں ڈھالنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ایک دفعہ سعادت حسن منٹو نے بیدی سے سوال کیا کہ ''تم سوچتے بہت ہو۔ لکھنے سے پہلے سوچتے ہو، بیچ میں سوچتے ہو اور بعد میں بھی سوچتے ہو''۔ منٹو کی اس بات کا جواب دیتے ہوئے بیدی نے کہا تھا کہ ''سکھ اور کچھ ہوں یا نہ ہوں، کاریگر اچھے ہوتے ہیں اور جو کچھ بناتے ہیں ٹھوک بجا کر اور چول سے چول بٹھا کر بناتے ہیں۔'' بیدی کا یہ جواب ان کے منفرد تخلیقی رویے اور ان کی جدت پسند طبیعت کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

تقسیم ہند برصغیر کی تاریخ کا نہایت الم ناک سانحہ رہا ہے۔ اس المیے نے انسانی زندگی کے دوسرے شعبوں کے دوش بہ دوش زبان و ادب کو بھی غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ تقسیم ہند کے المیے نے اردو فکشن کو بھی بے انتہا متاثر کیا۔ اردو فکشن میں تقسیم کے حادثات و واقعات کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی ہیں۔ اردو افسانہ نگاروں نے تقسیم کے جلو میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات، قتل و

غارت گری، اغوا و آبروریزی، بے بسی اور ہجرت کی چیرہ دستیوں کی حقیقی ترجمانی کی ہے۔ تقسیم و ہجرت کے رنج والم اور درد و غم کو افسانوی روپ دینے والے فن کاروں میں منٹو، بیدی، کرشن چندر، عصمت، قدرت اللہ شہاب، عبداللہ حسین، خدیجہ مستور، بلونت سنگھ، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور جوگندر پال وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ مذکورہ قلم کاروں نے تقسیم ہند کے خارجی و داخلی موضوعات پر مشتمل متعدد اہم افسانے تخلیق کیے۔ خاص طور پر سعادت حسن منٹو اور بیدی نے تقسیم ہند کے درد و غم اور کرب و اضطراب کو جس تخلیقی حسن کے ساتھ آئینہ دکھایا ہے، اس کی مثال خال خال نظر آتی ہے۔

سعادت حسن منٹو بذات خود تقسیم ہند کے مصائب کا شکار ہوئے۔ انھوں نے ہجرت اور نقل مکانی کے پس منظر میں کئی اہم و شاہکار افسانے تخلیق کیے ہیں۔ 'کھول دو'، 'ٹوبہ ٹیک سنگھ'، 'ٹھنڈا گوشت'، 'موذیل' اور 'سہائے' وغیرہ میں اس مخصوص عہد کی ہولناک صورت حال کی حقیقی ترجمانی کی گئی ہے۔ انسانی درد والم میں ڈوبا افسانہ 'کھول دو' منٹو کا ایک لازوال فن پارہ ہے۔ یہ افسانہ سرحد کی دونوں جانب پیدا شدہ وحشت ناک ماحول کی زندہ تصویریں پیش کرتا ہے۔ ظلم و بربریت پر مشتمل یہ افسانہ ہمیں ایک انجانے درد و سوز سے آشنا کر دیتا ہے۔ زیر بحث افسانے میں انہوں نے تقسیم ہند اور ہجرت کے نتیجے میں رونما ہونے والے جنسی جبر و تشدد کو ایک نئے تخلیقی تیور کے ساتھ پیش کیا ہے۔

قابل غور ہے کہ اس افسانے کا عنوان ہی انتہائی بربریت اور جبر و تشدد کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ افسانہ 'کھول دو' چیخ چیخ کر تقسیم کے درد و ستم کو بیان کر رہا ہے۔ منٹو نے سکینہ کی زندگی کی تباہی و بربادی کے پس پردہ نام نہاد مہذب سماج و معاشرے کو آئینہ دکھایا ہے۔ سراج الدین کی بیٹی سکینہ کی اجتماعی آبروریزی درحقیقت پوری انسانیت کی آبروریزی ہے۔ سکینہ کی لاچاری و بے بسی میں انسانی زندگی کی لاچاری و بے بسی جھلکتی ہے۔ سراج الدین کی بیٹی سکینہ تقسیم ہند اور نقل مکانی کے طوفان میں کہیں بھٹک جاتی ہے۔ تقسیم ہند کے ہنگامہ خیز حالات میں سراج الدین اپنی بیٹی سکینہ کی تلاش میں ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ وہ آس پاس کے مہاجر کیمپوں میں بھی تلاش کرتا ہے۔ لیکن اسے ہر جگہ ناکامی ہاتھ لگتی ہے۔ تقسیم ہند کی ہنگامہ خیزی کا ایک خاموش منظر ملاحظہ ہو:

> ''یوں تو کیمپ میں ہر جگہ شور برپا تھا لیکن بوڑھے سراج الدین کے کان جیسے بند تھے۔ اسے کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ کوئی اسے دیکھتا تو یہی خیال کرتا کہ وہ کسی گہری فکر میں غرق ہے۔ مگر اس کے ہوش و حواس شل تھے۔ اس کا سارا وجود خلا میں معلق تھا۔
>
> ......لوٹ، آگ، بھاگم بھاگ، اسٹیشن، گولیاں، رات اور سکینہ! سراج الدین ایک دم کھڑا ہو گیا اور پاگلوں کی طرح اس نے اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے انسانوں کے سمندر کو کھنگالنا شروع کیا۔
>
> پورے تین گھنٹے وہ سکینہ سکینہ پکارتا کیمپ کی خاک چھانتا رہا مگر اسے اپنی جوان اکلوتی بیٹی کا کوئی پتہ نہیں ملا۔ چاروں طرف ایک دھاندھلی سی مچی تھی۔'' (منٹو کے نمائندہ افسانے، مرتبہ اطہر پرویز، ص ۱۷۲)

یہ اقتباس ملک کے بٹوارے کے بعد پیش آنے والے ہجرت کے حالات و واقعات کا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کرتا ہے۔ واضح رہے کہ اس افراتفری اور ہنگامہ خیز ماحول میں نہ جانے کتنی سکینہ جبر و تشدد کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں؟ منٹو کا یہ افسانہ خود غرض سیاسی رہنماؤں کے گال پر ایک زوردار طمانچہ ہے۔ انسانی زندگی کی تلخی اور کڑواہٹ سے لبریز یہ افسانہ آج بھی تقسیم اور ہجرت کی تہ در تہ پرتوں کو کھولتا ہوا نظر آتا ہے۔ تقسیم ہند اور ہجرت کے موضوعات پر بے شمار افسانے لکھے گئے۔ لیکن منٹو نے افسانہ 'کھول دو' میں تقسیم اور ہجرت کے درد و غم کو جس شدت سے بیان کیا ہے، اس کی مثال خال خال نظر آتی ہے۔ منٹو کا یہ افسانہ پلاٹ کی اختصار پسندی، کردار کی چستی، اسلوب کی عمدگی اور اپنے آغاز و اختتام کی اثر انگیزی کے اعتبار سے نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ سعادت حسن منٹو کو عام سی بات میں بھی کوئی خاص نکتہ پیدا کرنے کا ہنر آتا ہے۔ بعض اوقات وہ اپنے قارئین کو چونکاتا بھی ہے۔

دوسری اہم بات یہ کہ سعادت حسن منٹو نے اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں ہی کردار خلق کیے ہیں۔ اس کے کردار افسانے کے پلاٹ سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ اس افسانے میں کسی طوائف کا کردار نہیں ملتا۔ 'ہتک' کی سوگندھی اور 'کالی شلوار' کی سلطانہ سے قطع نظر 'کھول دو' کی سکینہ حالات کی ستائی ہوئی ایک ایسی لڑکی ہے، جو غربت و مفلسی میں اپنے جسم کا سودا نہیں کرتی۔ وہ ہجرت کے دوران اپنے باپ سے بچھڑ کر رضا کار نوجوانوں کے ہتھے چڑھ جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہونے والا وحشیانہ سلوک زمانے اور حالات کی ستم ظریفی کو پیش کرتا ہے۔ منٹو نے اس افسانے میں سکینہ کی آبروریزی کے خوفناک منظر کی تصویر کشی راست طور پر نہیں کی ہے۔ بلکہ افسانے کا فن کارانہ اختتام ہمیں اس قابل رحم صورت حال سے دوچار کرتا ہے۔ اس افراتفری کے ماحول میں سکینہ بے ہوشی کی حالت میں یکا یک مل جاتی ہے۔ علاج کے لیے اسے ڈاکٹر کے پاس لے جایا جاتا ہے۔ سکینہ کے والد سراج الدین بھی اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر سراج الدین سے کھڑکی کھولنے کے لیے کہتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر کی آواز سن کر سکینہ کا اپنے بے جان ہاتھوں سے ازار بند کا کھولنا افسانے کا Climax ہے۔ اس افسانے کا اختتام پیش خدمت ہے:

"ڈاکٹر نے اسٹیچر پر پڑی ہوئی لاش کو دیکھا اور اس کی نبض ٹٹولی اور سراج الدین سے کہا۔"کھڑکی کھول دو۔"

سکینہ کے مردہ جسم میں جنبش ہوئی۔ بے جان ہاتھوں سے اس نے ازار بند کھولا اور شلوار نیچے سرکا دی۔ بوڑھا سراج الدین خاموشی سے چلایا۔"میری بیٹی زندہ ہے۔"

ڈاکٹر سر سے پیر تک پسینے میں غرق ہو گیا۔" (ایضاً، ص ۱۷۶)

ڈاکٹر کے پسینے میں غرق ہونے کو پوری انسانیت کے شرمندہ ہونے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ سکینہ کا اپنے نیم جان ہاتھوں سے ازار بند کھولنا اس کے ساتھ کی گئی جنسی بربریت کو چیخ چیخ کر بیان کر رہا ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اس افسانے کے ایک ایک لفظ سے حیوانیت و درندگی آشکار ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ ملک کی تقسیم کا المیہ دوقومی نظریے کی بنیاد پر پیش آیا۔ مسلمانوں کے لیے مملکت خداداد یعنی پاکستان کا قیام عمل میں آتا ہے۔ ملک کے بٹوارے کے بعد مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان چلی جاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح سے پاکستان سے بھی ہندو اور سکھ طبقے کے لوگ ہجرت کر کے ہندوستان چلے آتے ہیں۔ ہجرت کا یہ سلسلہ سرحد کی دونوں جانب جاری تھا۔ زیر مطالعہ افسانہ اسی صورت حال کا ترجمان ہے۔ اس افسانے میں ہجرت کے پرانتشار منظر کو فنی خوبیوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ امرتسر سے اسپیشل ٹرین مہاجرین کو لے کر مغل پورہ پہنچتی ہے۔ مغل پورہ پاکستان کا سرحدی علاقہ ہے۔ سراج الدین اپنی بیٹی سکینہ کے ہمراہ پاکستان ہجرت کر جاتا ہے۔ لیکن افسوس کہ مملکت خداداد میں رضا کار کمیٹی کے ممبران ہی سکینہ کو اپنی ہوس کا شکار بناتے ہیں۔ یہاں یہ سوال قائم ہوتا ہے کہ جب ملک کا بٹوارہ مذہب کی بنیاد پر ہوا تو اپنے ہی مذہبی طبقے کے لوگوں نے ایسی گھنونی حرکت کیوں کی؟ انسانیت اور انسانی قدروں کا پجاری منٹو بلا تفریق مذہب و ملت اپنے طنز کا نشتر چلاتا ہے۔ اس کے افسانوں میں کسی قسم کی مصلحت پسندی اور طرف داری کا احساس نہیں ہوتا۔ منٹو نے اپنے افسانوں میں انسانی روح کی غلاظت اور ذہن کی گندگی کو نفسیاتی آگہی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ منٹو کی یہی روش اسے دوسرے قلم کاروں سے ممتاز بناتی ہے۔ رضا کار و فلاحی تنظیم کی عیاری و شیطنت کی جھلک دیکھیے:

"آٹھ رضا کار نوجوانوں نے ہر طرح سکینہ کی دلجوئی کی۔ اسے کھانا کھلایا، دودھ پلایا اور لاری میں بٹھا دیا۔ ایک نے اپنا کوٹ اتار کر اسے دے دیا کیوں کہ دوپٹہ نہ ہونے کے باعث وہ بہت الجھن محسوس کر رہی تھی، اور بار بار بانہوں سے اپنے سینے کو ڈھانپنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھی۔" (ایضاً، ص ۱۷۴)

پیش کیے گئے اس اقتباس سے سکینہ کی قابل رحم زندگی کے کئی پہلو نمایاں ہیں۔ منٹو کا افسانہ 'کھول دو' اس عہد کی اخلاقی پستی، معاشرتی زوال اور مذہبی شکست و ریخت کو سفاک و حقیقت پسندانہ انداز میں سامنے لاتا ہے۔ اس طرح سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ پیش نظر افسانہ فکری اور فنی اعتبار سے منٹو کی تخلیقی عظمت و انفرادیت کی ٹھوس دلیل فراہم کرتا ہے۔

راجندر سنگھ بیدی نے مختلف موضوعات و مسائل پر طبع آزمائی کی ہے۔ کنہیا لال کپور نے انھیں بجا طور پر تھیم کا بادشاہ کہا ہے۔ تقسیم ہند کا المیہ بھی بیدی کی آنکھوں سے اوجھل نہیں رہا۔ لیکن انہوں نے تقسیم کی اشتعال انگیزی اور ہنگامی صورت حال پر بہت زیادہ توجہ صرف نہ کی۔ چند ایک افسانوں میں ہی تقسیم کی آنچ محسوس ہوتی ہے۔ تقسیم کے موضوع پر مبنی 'لاجونتی' جیسا کسک آمیز افسانہ آج بھی اس المیے کے درد و غم کو تازہ کر دیتا ہے۔ اس افسانے کے مطالعہ کے بعد قاری جذبات و احساسات کے سمندر میں غوطہ لگانے پر مجبور ہوتا ہے۔ اسے افسانے کی ہیروئن لاجونتی کے درد و غم میں اپنا درد و غم اور اس کے دل میں اٹھنے والی ٹیس میں اپنی بے بسی و لاچاری محسوس ہوتی ہے۔ بیدی کے یہاں تقسیم کا المیہ مقصد بن کر نہیں ابھرتا۔ انہوں نے اس حادثے کے جلو میں ہونے والے مذہبی قتل و خون اور تشدد کی تصویر کشی راست طور پر نہیں کی ہے بلکہ تقسیم ہند کو پس منظر کے طور پر استعمال کر کے ایک عورت کے داخلی و نفسیاتی کرب و اضطراب کو تخلیقی گویائی عطا کی ہے۔

راجندر سنگھ بیدی نے اس افسانے کے پلاٹ کا تانا بانا تقسیم ہند کے نتیجے میں رونما ہونے والے حادثات و واقعات سے تیار کیا ہے۔ یہ افسانہ مرکزی کردار لاجونتی کے پس پردہ انسانی زندگی کا ناقابل فراموش درد بیان کرتا ہے۔ تقسیم کے نتیجے میں اٹھنے والے ہجرت کے طوفان میں لاجونتی کہیں بھٹک جاتی ہے۔ 'دل میں بساؤ' کمیٹی کے تحت مغویہ عورتوں کی بحالی کی امیدیں ایک بار پھر سے جاگ اٹھتی ہیں۔ سندر لال کو اس کمیٹی کا سکریٹری منتخب کیا جاتا ہے۔ لوگوں کو بیدار کرنے کی غرض سے جلوس اور پربھات پھیریاں نکالی جاتی ہیں۔ ہجرت کا طوفان تھم جانے کے بعد حسن اتفاق سے لاجونتی دوبارہ مل جاتی ہے۔ اس کا شوہر سندر لال اسے اپنے گھر میں پناہ دیتا ہے، لیکن افسوس کہ وہ لاجو کو اپنی بیوی کے روپ میں قبول نہیں کرتا۔ سندر لال لاجو کی عزت اور احترام ایک دیوی کی طرح کرتا ہے، لیکن اسے بیوی کی محبت دینے سے قاصر ہے۔ اس طرح لاجو جیتے جی پتھر کی مورت بنا دی جاتی ہے۔ لاجونتی اپنے تباہ شدہ وجود اور اپنی زخم خوردہ زندگی کو از سر نو سمیٹنا چاہتی ہے۔ اپنی خوشیوں اور اپنے ارمانوں کی ان بکھری ہوئی کرچیوں کو چننا چاہتی ہے مگر سندر لال کی بے اعتنائی اسے یکسر توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ دونوں کی گفتگو کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

”کون تھا وہ؟ اچھا سلوک کرتا تو وہ؟“

”ہاں!“

”مارتا تو نہیں تھا؟“

لاجونتی نے اپنا سر سندر لال کی چھاتی پر سرکاتے ہوئے کہا”نہیں...“ اور پھر بولی”وہ مارتا نہیں تھا، پر مجھے اس سے زیادہ ڈر آتا تھا۔ تم مجھے مارتے بھی تھے پر میں تم سے ڈرتی نہیں تھی... اب تو نہ مارو گے؟“

سندر لال کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے، اور اس نے بڑی ندامت اور بڑے تاسف سے کہا”نہیں دیوی! اب نہیں... نہیں ماروں گا...“

”دیوی!“ لاجونتی نے سوچا اور وہ بھی آنسو بہانے لگی۔

اور اس کے بعد لاجونتی سب کچھ کہہ دینا چاہتی تھی لیکن سندر لال نے کہا”جانے دو بیتی باتیں! اس میں تمہارا کیا قصور ہے۔ اس میں قصور ہے ہمارے سماج کا جو تجھ ایسی دیویوں کو اپنے ہاں عزت کی جگہ نہیں دیتا۔ وہ تمہاری ہانی نہیں کرتا، اپنی کرتا ہے۔“

اور لاجونتی کی من کی بات من ہی میں رہی۔ وہ کہہ نہ سکی ساری بات اور چپکی چپکی دبکی پڑی رہی اور اپنے جسم کی طرف دیکھتی رہی جو کہ بٹوارے کے بعد اب 'دیوی' کا بدن ہو چکا تھا۔ لاجونتی کا نہ تھا۔ وہ خوش تھی، بہت خوش لیکن ایک ایسی خوشی میں سرشار جس میں ایک شک تھا اور وسوسے۔ وہ لیٹی لیٹی اچانک بیٹھ جاتی جیسے انتہائی خوشی کے لمحوں میں کوئی آہٹ پا کر ایکا یکی اس طرف متوجہ ہو جائے...“ (راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے، مرتبہ اطہر پرویز، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۲۰۰۶، ص ۱۷۴)

پیش نظر اقتباس لاجونتی کی نفسیاتی بے بسی اور اس کے سینے میں اٹھنے والے جذبات و احساسات کے اتھاہ سمندر کو آشکار کرتا ہے۔ لاجونتی در حقیقت قسمت کی ماری ہوئی ایک ایسی عورت کا تصور ہے، جو دوبارہ بس جانے کے بعد ایک بار پھر سے اجڑ جاتی ہے۔ وہ اپنی بے گناہی کے باوجود نا کردہ گناہوں کی سزا بھگتنے کے لیے مجبور ہوتی ہے۔ زیر مطالعہ افسانہ کے مرکزی کردار لاجونتی کے توسط سے تقسیم اور ہجرت کے طوفان میں بھٹکنے والی ہزاروں اور لاکھوں بدنصیب عورتوں کی مظلومیت اور ان کی قابل رحم زندگی کا گاتھا پیش کرتا ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ 'لاجونتی' تقسیم ہند پر تخلیق شدہ افسانوں میں اپنی مثال آپ ہے۔ بیدی

نے اس افسانے میں طہارت کا مسئلہ پیش کرتے ہوئے مرد اساس معاشرے کی غیر انسانی ذہنیت کا پردہ چاک کیا ہے۔ یہ افسانہ آج بھی مرد کی بالا دستی اور اس کے تعصب آمیز رویے سے جواب کا طلب گار نظر آتا ہے۔ افسانہ 'لاجونتی' اپنے موضوع اور انداز پیش کش کے اعتبار سے آج بھی Relevant ہے۔ بیدی کا یہ افسانہ نام نہاد مرد اساس معاشرے کی متعصّبانہ ذہنیت اور اس کے غیر انسانی سلوک کو بے نقاب کرتا ہے۔

تقسیم اور ہجرت کی غم ناک صورت حال میں سرحد کی دونوں جانب بے گناہ عورتوں اور خواتین کی آبرو کو سر بازار نیلام کیا جاتا ہے۔ یہ تلخ حقیقت ہے کہ عورتیں بلا تفریق مذہب و ملت حیوانیت اور جنسی درندگی کا شکار ہوتی ہیں۔ ایسے جاں سوز حالات میں ان اغوا شدہ عورتوں کا کیا قصور تھا؟ کیا انھیں اپنی عزت اور اپنی عصمت کے تار تار ہونے کا ملال نہ تھا؟ بیدی نے لاجونتی کے توسط سے درد و غم سے نڈھال ہزاروں لاکھوں عورتوں کی زندگی کی بے بسی اور لاچاری کا پردہ چاک کیا ہے۔

قابل غور ہے کہ زیر مطالعہ افسانہ بنیادی طور پر مغویہ عورتوں کی باز آبادکاری کے مسائل کو سنجیدگی سے پیش کرتا ہے۔ بیدی نے اس افسانے میں شعوری طور پر فرقہ وارانہ فسادات اور قتل و غارت کا منظر پیش نہیں کیا ہے۔ سطحی جذباتیت اور شدید مقصدیت کے برعکس بیدی نے سماج و معاشرے کے لیے ایک ایسا تخلیقی آئینہ خلق کیا ہے، جس میں غیر انسانی اور غیر اخلاقی رسم و رواج کا بدنما داغ صاف طور پر نظر آتا ہے۔ اس افسانے کو سیتا ہرن کے سیاق میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ سیتا کو بھی اپنی پاک دامنی کا امتحان دینے کے لیے آگ سے گزرنا پڑا تھا۔ اس طور پر کہا جا سکتا ہے کہ تقسیم اور ہجرت کے ستائے ہوئے خواتین طبقے کی زندگی متعدد بار بستی اور اجڑتی ہے۔ بیدی نے اس جانب بھی اشارہ کیا ہے کہ مغویہ عورتوں اور خواتین کو ان کے شوہر کے علاوہ ماں باپ اور بھائی بہن بھی پہچاننے سے صاف انکار کر دیتے ہیں۔ ان قابل رحم حالات میں مغویہ عورتوں کے پاس خودکشی کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ باقی نہیں رہتا۔ یہ تلخ حقیقت ہے کہ حوا کی بیٹیوں کے ساتھ ظلم اور ناانصافی کا رویہ اختیار کرنے میں پورا انسانی معاشرہ پیش پیش تھا۔ ایک عبرت ناک اقتباس ملاحظہ ہو:

”مغویہ عورتوں میں ایسی بھی تھیں جن کے شوہروں، جن کے ماں باپ، بہن اور بھائیوں نے انھیں پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ آخر وہ مر کیوں نہ گئیں؟ اپنی عفت اور عصمت کو بچانے کے لیے انہوں نے زہر کیوں نہ کھا لیا؟ کنویں میں چھلانگ کیوں نہ لگا دی؟ وہ بزدل تھیں جو اس طرح زندگی سے چمٹی ہوئی تھیں۔ سینکڑوں اور ہزاروں عورتوں نے اپنی عصمت لٹ جانے سے پہلے اپنی جان دے دی لیکن انھیں کیا پتہ کہ وہ زندہ رہ کر کس بہادری سے کام لے رہی ہیں۔ کیسے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے موت کو گھور رہی

ہیں۔ایسی دنیا میں جہاں ان کے شوہر تک نہیں پہچانتے پھر ان میں سے کوئی جی ہی جی میں اپنا نام دہراتی ہے۔سہاگ ونتی......سہاگ والی......اور اپنے بھائی کو اس جم غفیر میں دیکھ کر آخری بار اتنا کہتی ......تو بھی مجھے نہیں پہچانتا بہاری؟ میں نے تجھے گودی کھلایا تھا رے......!!'' (ایضاً، ص ۱۶۴)

مذکورہ بالا اقتباس کا ایک ایک لفظ ہماری روح کو مضطرب کرنے کی قوت رکھتا ہے۔اس عبارت سے بے بس اور لاچار عورتوں کا شدید دکھ درد آشکار ہے۔دراصل بیدی کا یہ افسانہ انسانی معاشرے پر گہرے طنز اور تازیانے کی حیثیت رکھتا ہے۔انسانیت کو تار تار کرنے والا یہ منظر ہمیں تادیر ذہنی کچوکے لگاتا ہے۔راجندر سنگھ بیدی نے نہایت تخلیقی آب و تاب کے ساتھ عورتوں کے درد نہاں کو قوت گویائی عطا کی ہے۔

مذکورہ بالا مباحث کی روشنی میں یہ بات بلاتردد کہی جاسکتی ہے کہ سعادت حسن منٹو کے افسانہ 'کھول دو' اور راجندر سنگھ بیدی کے 'لاجونتی' میں تقسیم ہند اور ہجرت کے اندوہناک حالات و مسائل بالخصوص عورتوں اور خواتین کی اذیت ناک زندگی کی پر درد تصویر کو اچھوتے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔'کھول دو' کی سکینہ اور 'لاجونتی' کی لاجو کی قابل رحم زندگی قاری کے دل کو مغموم کر دیتی ہے۔پیش نظر دونوں افسانوں کے پلاٹ کا تانا بانا سکینہ اور لاجو کے درد نہاں سے تیار کیا گیا ہے۔سکینہ سراج الدین کی بیٹی ہے جب کہ لاجو سندر لال کی بیوی۔سکینہ اپنے والد کی خوشیوں اور امیدوں کا مرکز ہے تو لاجو اپنے شوہر سندر لال کے لیے حسن و محبت کا پیکر۔سکینہ اور لاجو کی سماجی حیثیت جداگانہ ہوتے ہوئے بھی دونوں کی زندگی کا غم یکساں ہے۔دونوں کے سینے میں اٹھنے والی درد و الم کی ٹیس ایک جیسی ہے۔منٹو اور بیدی نے ان فن پاروں میں مذہبی و فرقہ وارانہ جبر و تشدد سے قطع نظر اپنی تمام تر توجہ عورت ذات کی زخمی روح اور اس کے جھلستے ہوئے جذبات و احساسات پر مرکوز کی ہے۔دونوں ہی افسانوں کا اختتام نہایت بلیغ اور فکر انگیز انداز میں ہوتا ہے۔مختصر یہ کہ 'کھول دو' اور 'لاجونتی' اپنے موضوع اور انداز پیش کش کے اعتبار سے تقسیم ہند پر تخلیق شدہ افسانوں میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔

☆☆☆

Dr. Mahboob Hasan
Assistant Professor
Department of Urdu, DDU
University, Gorakhpur-273009
Mobile: 8381856066,
E-mail: mahboobafaqi@gmail.com

اقبال سہیل کی قصیدہ نگاری کے چند محاسن

وسیم حیدر ہاشمی

اقبال سہیل کی ولادت ۱۱/ربیع الثانی ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۸۸۴ء میں ضلع اعظم گڑھ کے گاؤں 'بدھیریا' میں اور وفات ۷/نومبر ۱۹۵۵ء کو ہوئی۔موصوف کا شمار ملک کے اچھے اردو شعرا میں کیا جاتا ہے۔وہ قانون داں کے علاوہ اچھے سیاست داں بھی تھے۔راقم کی معلومات کے مطابق اقبال سہیل نے عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم اس دور کے معروف عالم جناب مولانا حمید الدین فراہی صاحب سے (۸-۱۹۰۷ء) اور ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ (۱۹۱۳ء) کی تعلیم بنارس کے 'کوینس کالج' سے حاصل کی۔انھوں نے ۱۹۱۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم۔اے کرنے کے بعد ایل ایل بی کیا۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے یہ اسناد حاصل کرنے کے بعد وہ اپنے آبائی وطن اعظم گڑھ واپس آ گئے۔

وہ علامہ شبلی نعمانی سے حد درجہ متاثر تھے، چنانچہ اعظم گڑھ واپسی کے بعد علامہ کے معاون ہو گئے۔موصوف جن لوگوں سے زیادہ متاثر تھے، ان میں ایک علامہ شبلی نعمانی بھی تھے۔اس اثنا میں وہ مسلسل 'دارالمصنفین' آیا کرتے تھے۔اپنے علی گڑھ قیام کے دوران وہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے علاوہ پروفیسر رشید احمد صدیقی سے بھی بہت قریب تھے۔ان حضرات سے ان کی دوستی کی خاص وجہ ان کی علمیت تھی۔ان کی علمی صلاحیتوں کا اندازہ اس امر سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ اپنے علی گڑھ قیام کے دوران اقبال سہیل نے متعدد مواقع پر ڈاکٹر ذاکر حسین کے لیے تقاریر بھی سپرد قلم کیں۔اقبال سہیل کے شعری مجموعہ 'تابش سہیل' کا پیش لفظ ڈاکٹر ذاکر حسین نے لکھا۔وہ شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج کے علاوہ اعظم گڑھ کے دیگر تعلیمی اداروں کے 'اِکزیکیوٹیو کمیٹی ممبر' تھے۔وہ 'اِنڈین نیشنل کانگریس' کے سرگرم رکن تھے۔ان کی سیاسی خدمات سے متاثر ہو کر کانگریس نے ۱۹۳۵ء میں انھیں 'اُتّر پردیش لجس لیٹیو کمیٹی' کا ممبر منتخب کیا۔اس مقام پر قابل ذکر یہ ہے کہ ان کا مقابلہ سید علی ظہیر جیسی بڑی سیاسی اور مشہور زمانہ شخصیت سے تھا، جنھیں انھوں نے شکست

دے کر یہ ممبرشپ حاصل کی تھی۔ اُس پرآشوب زمانے میں ملک کے سیاسی حلقوں میں ان کی قدر ومنزلت اس لیے بھی بہت زیادہ تھی کہ وہ ملک کی تقسیم کے سخت مخالف تھے۔ ان کی علمیت اور اسی فکر کے پیش نظر ڈاکٹر ذاکر حسین نے انھیں اپنا دوست بنالیا تھا۔

ویسے تو اقبال سہیل نے بہ حیثیت شاعر متعدد اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر راقم السطور نے یہاں ان کی قصیدہ نگاری کے چند محاسن پر خامہ فرسائی کا ارادہ کیا ہے۔ فتح ایران کے بعد شاعری کی یہ صنف مسلمانوں کے ساتھ عرب سے ایران اور ایران سے برصغیر میں آئی۔ ایران کے ایسے بہت سے شعرا ہیں جن کے نام قصیدہ نگاری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں خاص طور پر انوریؔ، خاقانیؔ اور عرفیؔ کے نام فارسی قصیدہ گویوں میں سرفہرست شمار کیے جاتے ہیں۔

ہندوستان میں اس صنف کا آغاز دکن میں ہوا۔ دکن کے شاعر نصرتیؔ کو اردو کا پہلا قصیدہ گو شاعر کہا گیا ہے۔ جہاں تک شمالی ہند کا تعلق ہے تو یہاں کے سرفہرست شعرا میرؔ، غالبؔ، سوداؔ، ذوقؔ، ناسخؔ، مصحفیؔ، انشاؔ وغیرہ نے اس صنف شاعری میں زبردست کامیابی حاصل کی۔ محمد رفیع سوداؔ کو قصیدہ نگاری کا امام کہا گیا۔ شاعری کی اس صنف کا تعلق خاص کر مدح سے ہے۔ ہندوستان کے تعلق سے اٹھارہویں اور اُنیسویں صدی کے اوائل تک کا زمانہ بادشاہوں، راجاؤں، نوابوں اور زمینداروں کا زمانہ تھا۔ اس دور کے بیشتر شعرا انھیں کی شان میں قصیدے لکھتے تھے اور عوض میں انھیں چھوٹے بڑے انعام واکرام سے نوازا جاتا تھا۔ ان میں سے بیشتر کی پرورش انھیں درباروں سے ہوتی تھی۔ گو کہ قصیدہ گو شعرا کا دارومدار انھیں افراد کی داد ودہش پر تھا۔ ان درباروں کے توسط سے بیسویں صدی کے نصف اول تک ہندوستان میں قصیدہ گوئی خوب پروان چڑھی۔ ملک آزاد ہونے کے بعد نہ تو رجواڑے رہے نہ ہی زمینداری اور نوابی۔ چوں کہ بیشتر شعرا اُنھیں کے لیے قصائد لکھتے تھے، اس لیے ان کے زوال کے بعد بیشتر قصیدہ گو شعرا نے قصیدہ نگاری کو بالائے طاق رکھ دیا، جس کے نتیجے میں یہ مہتم بالشان صنف شاعری روبہ زوال تصور کی جانے لگی۔ اس سلسلے میں جناب عاصم محمد آبادی کے طنز میں مخفی درد کو بہ آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''ایک باقاعدہ صنف سخن کو یکسر ترک کر کے اردو ادب کا دامن تنگ کیا جا رہا ہے یا وسیع۔ کمی کی جا رہی ہے یا اضافہ؟ ممدوحین کی فہرست کو وسیع کرنا ضروری ہو تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ کوئی معصومین کی مدح کرتا ہے تو کرے، آپ پھولن دیوی، لالو پرشاد، رابڑی دیوی، ٹلائم سنگھ کی شان میں قصیدے لکھیے اور دعا و مدعا کی جگہ نئی سروِس یا بزنس لائسنس طلب کیجیے۔ امریکہ کے مسٹر بُش کی ثنا کیجیے اور ان سے گرین کارڈ

مانگیے۔ کسی صورت سہی، اردو ادب کی ایک اچھی صنف زندہ تو رہے۔'' (احساس و ادراک، بنارس ۲۰۱۰ء، ص ۶۰)

ائمۂ معصومین کی شان میں روایتی انداز میں قصیدہ گوئی کرنے والوں میں حضرت اقبال سہیل کا نام سرفہرست ہے۔ جہاں ایک طرف انھوں نے روایتی قصیدہ نگاروں کی مانند مرصع قصیدہ گوئی میں اس کے اجزائے ترکیبی کا خیال بدرجۂ اتم رکھا، وہیں تمام شعری لوازمات کو اسی حسن وخوبی کے ساتھ نبھایا ہے۔ یہی ان کی قصیدہ گوئی کے محاسن بن کر اُبھرے۔ شاعری کے تمام محاسن میں سلاست کے ساتھ روانی کی اہمیت مسلم ہے، جس کا خیال بھی موصوف نے اپنی قصیدہ نگاری میں حد درجہ رکھا ہے۔ شاعری میں روانی قائم رکھنے کی ضرورت کے مدنظر شمس الرحمٰن فاروقی کا خیال ملاحظہ ہو، جہاں انھوں نے تین شرائط کی طرف اشارہ کیا ہے:

''......روانی سے مراد یہ ہے کہ کلام کا ہر جزو، یعنی لفظ، ایک دوسرے سے اس طرح ہم آہنگ ہو کہ کوئی لفظ صوتی اعتبار سے اجنبی نہ محسوس ہو بلکہ ہر لفظ کا آہنگ دوسرے لفظ کے آہنگ کی پشت پناہی کرے۔ روانی کی دوسری شرط یہ ہے کہ کلام پر بحر حاوی نہ ہو بلکہ بحر پر کلام حاوی ہو۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ کسی مخصوص بحر کی بعض صفات فرض کر لی جائیں اور تقاضہ کیا جائے کہ جو کلام اس بحر میں ہو، اس میں وہ صفات ضروری ہوتی ہیں۔ روانی کا تفاعل یہ ہوتا ہے کہ وہ بحر کے مشینی آہنگ کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتی ہے یعنی شاعر جس قدر روانی پر قادر ہوگا، اسی قدر وہ بحر کے مشینی آہنگ کا تابع نہ ہوگا۔ روانی کی تیسری شرط یہ ہے کہ کلام میں اصوات نہ زیادہ معلوم ہوں اور نہ کم معلوم ہوں۔ الفاظ کی زیادتی کمی سے بحث نہیں بلکہ اصوات کا معاملہ ہے۔ بعض کلام میں ایسا ہوتا ہے جس میں اصوات کی مجموعی تعداد ضرورت سے کم یا ضرورت سے زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں روانی کم ہوگی۔'' (شعر شور انگیز، جلد اول، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ۲۰۰۶ء، صفحہ ۲۲۱-۲۲۰)

کلام میں روانی کی انھیں شرائط کے پیش نظر اگر اقبال سہیل کے قصیدے کی متن خوانی کی جائے تو یہ بات از خود واضح ہو جائے گی کہ ان کے قصائد میں روانی کس درجہ قائم ہے۔ زیر مطالعہ قصیدے کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو جہاں قصیدے کی ضرورت کے مطابق زوردار الفاظ کے ساتھ روانی کا خیال بھی پوری توجہ کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ یہ قصیدہ مولائے کائنات حضرت علی (ع) کی شان میں ہے اور ۴۸/اشعار پر مشتمل ہے۔

لے کے فطرت سے غضب کا حوصلہ پیدا ہوا حامل بارِ امانت، یہ طلسمِ آب و گل

اس کے بعد حافظؔ شیرازی کے ایک قصیدے کا وہ شعر ملاحظہ ہو جس میں انھوں نے امانت کی ذمہ داری کے بار کی وضاحت فرمائی ہے:

آسمان بار امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بہ نامِ منِ دیوانہ زدند

روانی کے پیشِ نظر درج بالا دونوں اشعار کو ہم پلّہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کیونکہ یہاں پر شمس الرحمٰن فاروقی کی وضع کردہ روانی کی تینوں شرائط پوری کر دی گئی ہیں۔

اپنے دور کے جید عالم دین مولانا حمید الدین فراہی نے اقبال سہیل کو قرآن شریف کی تعلیم جس سلیقہ سے دی تھی اسی سلیقہ سے اپنے اشعار میں انھوں نے انھیں برتا بھی ہے۔ اسی قصیدے کا تیسرا شعر ملاحظہ ہو:

گردنیں جنّ و ملک کی، اس کے آگے جھک گئیں
زد گیا، جس کو نصب کا ادّعا پیدا ہوا

درج بالا شعر کا مطالعہ غائر مقصود ہو تو کہا جا سکتا ہے اس شعر میں جہاں ایک طرف قرآنی آیت کی طرف اشارہ ہے وہیں دوسری طرف اس شعر کا خاص وصف اخلاقی قدر کا بہترین نمونہ بھی ہے۔ اخلاقی شاعری میں اگرچہ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے مرثیوں کا پایہ بہت بلند ہے تو اقبال سہیل کے یہاں بھی جا بہ جا اخلاقیات کی تعلیم نہایت موثر پیرائے میں نظر آتی ہے۔ ہاں اس شعر میں ایک نامانوس لفظ 'زد گیا' ضرور شامل ہے، جو باذوق قارئین کو کھٹکتا ہوگا۔ ہر چند کہ اس لفظ کا استعمال نہ تو ادب میں مروج ہے نہ ہی عام بول چال کی زبان میں۔ پھر بھی اس لفظ کا استعمال اقبال سہیل نے دوسرے الفاظ کے امتزاج اور فارسی ترکیب کے ساتھ اس حسن و خوبی کے ساتھ کیا ہے کہ اس کی روانی میں مطلق فرق نہیں آیا۔ راقم کی معلومات کے مطابق لفظ 'زَد گیا' پورب کے مسلم گھرانوں کی عورتوں میں عام ہے، جس کا مفہوم کسی بے دین شخص پر خدا کی مار پڑنے سے ہے۔

'ساز و برگ' کی ترکیب عام نہیں ہے بلکہ کوتاہ نظر راقم السطور کے لیے ادب میں یہ ترکیب بالکل نئی ہے، جو شاید اقبال سہیل کی خود ساختہ ہے:

کون اُلٹ سکتا تھا روئے حسن فطرت سے نقاب
ہم سے یہ سب 'ساز و برگ' ارتقا پیدا ہوا

اسی قصیدے کے اٹھارہویں شعر میں اقبال سہیل کا ایک ذاتی فلسفہ ملاحظہ فرمائیے۔ ان کے پیش نظر ہمیشہ کلام اللہ رہا ہے چنانچہ وہ ہر حد نگاہ کو سدرۃ المنتہٰی سے تعبیر کرنے کو ہرگز تیار نہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ افق، سدرہ نہیں یعنی اگر ہم نگاہ کی آخری حد یعنی افق تک پہنچ جائیں تو جس حد کو ہم سدرہ سمجھتے تھے، ہمیں وہاں سے ایک دوسرا سدرہ بھی ضرور نظر آئے گا۔ ذیل کے شعر میں وہ فرماتے ہیں:

منتہیٰ خود جرم ہے، اہل محبت کے لیے
جس جگہ پہنچے، کچھ اس سے ماورا پیدا ہوا

درد آشنا دل کے ساتھ حضرت آدم یعنی انسان کی خلقت کی تعریف، عشق (عشق حقیقی) کی تعریف، تڑپ اور طلب، فلسفی، منتہیٰ، تبحر و تموج، دل کی تعریف پیش کرنے کے بعد اس قصیدے کا بائیسواں شعر گریز کی شکل میں یوں پیش کیا کہ انھیں بھرتی کے ایک مصرعے کا بھی سہارا نہیں لینا پڑا۔ جب کہ اکثر معتبر قصیدہ گو یان بھی تشبیب سے گریز کا رخ اختیار کرنے میں کبھی کبھی دو چار اور کبھی دس بارہ اشعار تک کا سہارا لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ تشبیب سے گریز کا ایسا حسن قصیدہ گوئی کی تاریخ میں کمیاب کہا جا سکتا ہے۔ اقبال سہیل کے اس قصیدے میں گریز ملاحظہ ہو:

کعبہ کیا، وہ قبلۂ وحدت پرستاں جہاں
جس کے دامن میں شہ خیبر کشا پیدا ہوا

اقبال سہیل، فقہ جعفریہ کے مقلدین کی مانند حضرت علی (ع) کے وجود کو ازل سے تسلیم کرتے ہیں۔ رسول اکرم (ص) کی ایک معروف حدیث ہے کہ 'انا و علی من نورٍ واحد' اور ایک دوسری حدیث میں یہ بھی بیان ہے کہ 'میرا نور اس وقت خلق ہو چکا تھا جب آدم (ع) آب و گل کے درمیان تھے'۔

سرخی خون شہادت، جس کے عارض پر نثار
جو 'ازل سے' لالہ ساں، رنگیں قبا پیدا ہوا

درج بالا شعر کے ثانی مصرعے میں حضرت علی (ع) کی ولادت کو اقبال سہیل روز ازل سے تسلیم کرتے ہیں۔ اس کی وضاحت اشارتاً تحریر کی جا چکی ہے۔ اس شعر کے علاوہ بھی اقبال سہیل نے اسی قصیدے کے دیگر اشعار میں حضرت علی (ع) کے سلسلے میں بیشتر انھیں عقیدوں کا تذکرہ کیا ہے جیسا کہ فقہ جعفریہ میں بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر اسی قصیدے کے چند دیگر اشعار ملاحظہ ہوں:

خانہ زادِ خالق ارض و سما پیدا ہوا
دست و بازوئے حبیبِ کبریا پیدا ہوا

آبشارِ نورِ باطن، افتخارِ آب و گل
نازِ پروردِ جنابِ مصطفیٰؐ پیدا ہوا

تم کو سیرابی مبارک، تشنہ کامانِ ازل
ابر رحمت، بحر موّاجِ عطا پیدا ہوا

زورِ بازوئے یداللّٰہی، جبیں سے آشکار
شیرِ یزداں، ضیغمِ دشتِ غزا پیدا ہوا

قہرمانِ کشورِ دیں، فاتح باطل شکن
حیدرِ کرار، شاہِ لافتیٰ پیدا ہوا

موردِ ''من کنتُ مولاہ'' آفتاب موجِ حق
خسروِ مسند نشینِ ''انما'' پیدا ہوا

خازنِ علم لدنی، حامل اسرار وحی
کنز عرفاں، مشعلِ راہِ ہدیٰ پیدا ہوا

دُرّۃ التاجِ سیادت، زُبدۂ آل عبا
سیّدِ ابرار، امامُ الاولیا پیدا ہوا

اقبال سہیل کی شاعرانہ خصوصیات میں ایک بڑی خوبی ان کے کلام میں الفاظ کا استعمال و امتزاج

ہے۔ موصوف خالص ہندی الفاظ کو بھی اس خوبصورتی سے فارسی ترکیب کے ساتھ برتتے ہیں کہ کلام کی روانی ذرّہ برابر متاثر نہیں ہوتی۔ کچھ یوں کہ ہندی لفظ بھی اردو معلوم ہونے لگتا ہے:

فیض سے جوش نمو کے لہلہائی کھیتیاں پھر 'بسنت' آئی، دلوں میں ولولہ پیدا ہوا
سبزہ وہ کھیتوں کے پتّے، زرد وہ سرسوں کے پھول دشت میں بھی منظرِ بُستاں سرا پیدا ہوا
کوئلیں کوکیں، ہوئیں آموں کی شاخیں گل فروش گل کھلے، بلبل کو پھر جوش نوا پیدا ہوا
شادیانے گارہے ہیں، طائرانِ نغمہ سنج عید میلاد علی(ع) کا غلغلہ پیدا ہوا

اقبال سہیل کے زیر مطالعہ قصیدے میں تمام شاعرانہ نکات اور حسن اپنے عروج پر نظر آنے کے باوجود چند معمولی کمیاں قارئین کو ضرور کھٹکتی ہوں گی۔ درج بالا دو اشعار میں 'کھیتوں کے پتّے' کا استعمال بہت مناسب نہیں ہے کیوں کہ پتّوں کا تعلق درخت سے ہوتا ہے کھیتی سے نہیں۔ اسی طرح چوتھے شعر میں 'شادیانے گارہے ہیں' طائرانِ نغمہ سنج' شادیانہ خوشی کے باجے کو کہتے ہیں نہ کہ گیت کو، جو گایا جاتا ہے اور شادیانے بجائے جاتے ہیں، گائے نہیں جاتے۔ ہوسکتا ہے کہ شعری ضرورتوں کے لحاظ سے اُنھوں نے اس مقام پر 'کھیتوں کے پتّے' اور شادیانے کے ساتھ گانے کو جائز مانا ہو۔ بہر حال اس طرح کی معمولی سی کمی خوبصورت چاند پر لگے داغ کے مانند تصور کی جائے تو بہتر ہوگا۔ ورنہ اس مقام پر زیادہ غور و فکر کے سلسلے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ اُس شخص کی حالت قابل رحم ہے جو چاند کی چاندنی سے لطف اندوز ہونے کے بجائے اس کے داغ پر اپنی نگاہیں جمائے، چاندنی کے لطف سے محروم رہ جاتا ہے۔

☆☆☆

Waseem Haider Hashmi
B.10/43, Shivala,
Varanasi-221001,
E-mail : whh55bhu@gmail.com
Cell: 9580698805, 9451067040

اردو کی موجودہ صورتِ حال: ایک جائزہ

سحر افروز

عالمی سطح کے سبھی ماہرین تعلیم اس بات پر متفق اور متحد ہیں کہ مادری زبان میں بچوں کی تعلیم زیادہ بہتر ہے، جو بچوں کی نشو و نما اور ترقی کے ساتھ منزل مقصود تک کا سفر طے کرنے میں معاون بنتی ہے۔ بنیادی تعلیم کے متعلق کتابوں اور کمیشنوں کے دستاویزات کے ساتھ ساتھ ریاستوں اور مرکز کے محکمہ جات میں یہ سفارشیں موجود ہیں کہ تعلیم کا ذریعہ مادری زبان کو بنایا جائے۔ اردو میڈیم کے استحکام کے لیے لازم ہے کہ جنوبی اور شمالی ہند کی علاقائی زبانوں میں اردو جاننے والوں کو روشناس کرایا جائے، ساتھ ہی کوئی ایسا ادارہ بھی قائم کیا جائے جہاں اردو میڈیم کے سلسلے سے تدریسی مواد کا عظیم ذخیرہ موجود ہو۔

یہ احساس اس احساس سے بھی قوی تر ہے کہ اردو پڑھنے سے معاش کا مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ حالاں کہ زبانیں اس لیے نہیں سیکھی جاتیں کہ ان سے محض روزی روٹی کے مسئلے کو حل کیا جاسکے بلکہ اس لیے بھی سیکھی جاتی ہیں کہ وہ ہمیں گونگا ہونے سے بچاتی ہیں، دل و دماغ کے دریچے کھولتی ہیں اور روشن خیالی پیدا کرتی ہیں۔ مگر معلوم نہیں کیسے اردو والوں کے دل میں یہ بات گھر کر گئی ہے کہ اردو بولنے، پڑھنے اور لکھنے سے شخصیت کی پیشانی پر پسماندگی کا لیبل لگ جاتا ہے۔ حالاں کہ وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ اردو شرفا کی زبان رہی ہے۔ اس کو اپنانے والا مہذب سمجھا جاتا رہا ہے اور اس کا جاننے والا اس بات پر فخر محسوس کرتا رہا ہے کہ اسے بھی وہ زبان آتی ہے جو لبوں پر آتی ہے تو منھ سے پھول جھڑنے لگتے ہیں، جس کا سننے والا تماشائی اور بولنے والا مرکز نگاہ بن جاتا ہے، مگر صد افسوس کہ جو زبان لبوں پر سجی رہتی تھی آج سینے میں بھنچی اور کسی شکنجے میں کسی ہوئی ہے اور یہ سب اس احساس کا فساد ہے جو کسی چڑیل کی طرح دل و دماغ پر اپنا سایہ ڈال چکا ہے۔

یہ احساس مختلف انداز سے اردو والوں کو اس کے قریب جانے سے روکتا ہے۔ مثلاً اس کے دباؤ کے زیر اثر اردو والے:

(۱) اپنے بچوں کو اردو میڈیم اسکول میں نہیں بھیجتے یا مجبوری میں بھیجتے ہیں۔

(۲) اپنے بچوں کو اردو مکتب میں بھیجنے کے بجائے انگریزی میڈیم اسکول میں بھیجنا پسند کرتے ہیں۔

(۳) محفلوں اور مجلسوں میں اردو میں اظہار خیال کے بجائے انگریزی میں بولنا زیادہ بہتر سمجھتے ہیں یا انگریزی کمزور ہونے پر خاموش رہنا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔ وہ لوگ جو اردو میں اپنے خیالات کا بہتر اظہار کر سکتے ہیں وہ انگریزی کے غلبے اور رعب کی بدولت اپنے خیالات کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔

(۴) اردو کی کتابیں اور اردو کے جرائد و رسائل نہیں خریدتے اور حتی المقدور کوشش کرتے ہیں کہ ان کے ڈرائنگ اور اسٹڈی روم میں اردو کی کتابیں نظر نہ آئیں۔

(۵) شادی بیاہ اور دیگر تقریبات کے دعوت نامے اردو کے بجائے انگریزی یا ہندی میں تقسیم کرتے ہیں۔

(۶) اردو ادارے بھی سرکاری کام کاج اردو کے بجائے انگریزی یا ہندی میں کرتے ہیں جب کہ ایسا کرنے میں کوئی قانونی دباؤ بھی نہیں ہے۔ وہ آسانی سے بلاخوف و خطر یہ کام اردو میں کر سکتے ہیں۔

(۷) بعض سیاست داں جو بہت اچھی اردو جانتے ہیں، وہ بھی اپنی تقریروں میں قصداً ہندی اور انگریزی لفظ استعمال کرتے ہیں جب کہ غیر اردو داں اپنی گفتگو کو اردو کے لفظوں کے استعمال سے بہتر اور موثر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

(۸) ان تعلیمی اداروں میں بھی جہاں اردو کا رواج رہا ہے اور اردو میں درس و تدریس اور دفتری خط و کتابت کی اجازت ہے، اردو کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ بہت آسانی سے جہاں اردو میں بات کی جا سکتی ہے اور دعوت نامے اور اشتہار اردو میں چھاپے جا سکتے ہیں، وہاں اردو کی جگہ انگریزی یا ہندی کا استعمال زیادہ کیا جاتا ہے۔

(۹) بعض یونیورسٹیوں کے چوتھے درجے کے ملازمین جو کہ زیادہ تر اردو میں تعلیم یافتہ ہوتے ہیں اور انہیں اچھی اردو آتی ہے، اپنے جلسوں اور دیگر سرگرمیوں میں اردو کے بجائے ہندی اور انگریزی زبانوں کے استعمال پر زیادہ زور دیتے ہیں، بلکہ اردو کو سرے سے ایسے موقعوں پر خارج کر دیتے ہیں۔

(۱۰) وہ یونیورسٹی جس کے بنیاد گزاروں میں اردو کے شیدائی یعنی سر سید احمد خاں، مولوی سمیع اللہ، مولوی ذکاء اللہ، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا حالی، مولانا شبلی نعمانی وغیرہ اہم تھے اور جہاں سر سید احمد اور سر راس مسعود سے لے کر شعبۂ فارسی کے پروفیسر نذیر، شعبۂ ہندی کے پروفیسر رویندر بھرمر، شعبۂ تاریخ کے پروفیسر عرفان حبیب وغیرہ نے اردو کے حوالے سے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ اب لوگوں کو یہ احساس

کیوں ستاتا ہے کہ وہ اپنا کام اردو کے علاوہ غیر ملکی زبان میں کریں۔ ان سوالوں پر غور کرتے وقت کئی وجوہات سامنے آتی ہیں جن میں سے پہلی وجہ یہ ہے کہ انگریزی کے رعب نے ہندوستانیوں کو اپنی زبان کی قدر و قیمت سے نا آشنا بلکہ متنفر کر دیا ہے۔ انگریزی کا رعب ایسا بیٹھا ہوا ہے کہ اچھا خاصا پڑھا لکھا آدمی بھی کم پڑھے لکھے مگر انگریزی داں کے سامنے اپنے کو احساس کمتری میں مبتلا پاتا ہے۔

انگریز ہندوستان سے چلے گئے، مگر ان کی زبان آج بھی ہمارے ملک پر حکمرانی کر رہی ہے۔ اس زبان کا گھر، بازار، دفتر، سفر ہر جگہ غلبہ دیکھنے کو ملتا ہے اور غلبہ اس قدر ہے کہ دوسری زبانیں اس کے سامنے دب کر اپنی آواز کھو دیتی ہیں یا یوں کہیے کہ ان کی آوازیں اس کے دباؤ سے گھٹ کر دم توڑ دیتی ہیں۔ انگریزیت کا یہ غلبہ سب سے زیادہ اردو کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ ہندی کو تو سرکاری پشت پناہی حاصل ہے لیکن بے چاری اردو کی پشت پناہی کون کرے۔ خود اردو والے بلکہ اس کی کمائی کھانے والے بھی اس کے بچاؤ کے لیے آگے نہیں آپاتے۔

اس کی دوسری وجہ سیاسی صورت حال ہے۔ ملک کی سیاسی صورت حال ایسی ہے کہ اردو کی سرپرستی نہیں ہو پاتی۔ جس صورت حال سے ہمارا آج کا معاشرہ گزر رہا ہے اس میں اردو کو ایک خاص طبقہ سے جوڑ کر نہ صرف یہ کہ اردو کے دائرے کو تنگ کیا جا رہا ہے بلکہ اردو سے دشمنی کی فضا بھی تیار کی جا رہی ہے۔ وہ لوگ جنہیں اردو اچھی لگتی ہے اور اردو سے پیار کرتے ہیں، وہ جب اپنے کانوں میں یہ آواز سنتے ہیں کہ اردو ان کی نہیں بلکہ ایک خاص فرقہ کی زبان ہے تو وہ بھی آہستہ آہستہ اردو کو غیر سمجھ کر اس سے شعوری اور غیر شعوری طور پر دور ہونے لگتے ہیں۔ جب کہ کسی بھی زبان کا تعلق کسی ایک طبقہ سے نہیں ہوتا بلکہ ہر زبان کی اپنی صلاحیت ہوتی ہے۔ اردو گنگا جمنی تہذیب کی زبان ہے لیکن جیسے جیسے تہذیب مٹ رہی ہے، ویسے ویسے اردو کے قدر دانوں میں بھی کمی کا احساس کیا جا رہا ہے۔ یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ اردو والے جب سیاست میں داخل ہوتے ہیں اور جلسوں میں عوامی مقامات پر تقریریں شروع کرتے ہیں تو سیاسی مصلحت کے تحت قصداً اردو سے گریز کرتے نظر آتے ہیں۔ یہی سیاسی لوگ جب آگے چل کر زبانوں کے تحفظ اور ترقی کے منصوبے بناتے ہیں اور اس کو عمل میں لانے کا قانون نافذ کرتے ہیں تو اپنی خود غرضی، مصلحت کوشی کے سبب اور حکومت وقت کی خوشنودی حاصل کرنے کے مقصد کے پیش نظر اردو کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

اس کی تیسری وجہ تنظیمی سطح پر بھی اردو سے ناانصافی کا برتاؤ ہے۔ کسی زبان کی ترقی کا انحصار اس سے متعلق پالیسی اور اس پالیسی کو عملی صورت دینے والے تنظیمی ڈھانچے پر ہوتا ہے۔ اگر پالیسی صاف ستھری

واضح ہو اور اس کے عمل میں پیچیدگیاں نہ ہوں تو آگے بڑھنے یا بڑھانے میں دشواری پیش نہیں آتی اور اگر آتی بھی ہے تو تنظیمی بصیرتیں رکاوٹیں ہٹا دیتی ہیں۔لیکن اگر تنظیمی بصیرتیں ہی جانبدار ہوں تو یہ کیوں کر ممکن ہے کہ کوئی منزل تک پہنچ جائے۔اردو کے سلسلے میں ہمیشہ مصلحت کوشی سے کام لیا گیا ہے۔

اس کی آخری اور اہم وجہ تعلیمی و تدریسی صورت حال بھی ہے۔ ملک میں ایسی تعلیمی صورتِ حال ہے کہ حکومت کی اردو کی ترقی کی پالیسی کے باوجود اس کی ترقی رکی ہوئی ہے، بلکہ روز بہ روز یہ تنزلی کا شکار ہوتی جا رہی ہے۔غیر محسوس طریقے سے ایسی حکمت عملی اپنائی جاتی ہے کہ اردو کو دل سے چاہنے والے اور اس کی تعلیم حاصل کرنے والے بھی کچھ دنوں کے بعد مجبور ہو کر اردو سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔متذکرہ بالا وجوہات کے علاوہ بھی کئی اسباب ہیں جن کی وجہ سے اردو کو انصاف نہیں مل پایا جن میں سے کچھ ذیل میں دئے جاتے ہیں:

☆ زیادہ تر اردو اساتذہ اردو نہیں پڑھاتے۔

☆ انتظامیہ اردو کے تئیں بے اعتنائی برتتی ہے۔

☆ والدین اور سرپرست بھی اپنے بچوں کی اردو تعلیم پر بہت کم دھیان دیتے ہیں ساتھ ہی طلبہ بھی اردو پڑھنے میں دلچسپی کم لیتے ہیں۔

☆ اردو میڈیم اسکولوں میں اردو کے ذریعہ پڑھانے والے دوسرے مضامین کے اساتذہ بہت کم ہیں اور بعض اسکولوں میں تو ہیں بھی نہیں۔

☆ اردو میڈیم کی کتابیں اسکولوں میں بہت دیر سے پہنچتی ہیں جس کے سبب طلبہ کو تیاری کرنے کا موقع نہیں ملتا۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ امتحان کے نتائج اچھے نہیں ہو پاتے۔

☆ کتابیں نہ پہنچنے کی وجہ سے زیادہ تر طلبہ کو مجبوراً اپنا میڈیم تبدیل کرنا پڑتا ہے۔

☆ تعلیمی اداروں میں پڑھائے جانے والے نصابات بھی بے توجہی کے شکار ہیں۔زیادہ تر اسکولوں اور کالجوں کے نصابات وہی ہیں جو بہت پہلے بنائے گئے تھے جن میں نہ تو معیار کا خیال رکھا گیا ہے نہ ہی دلچسپی کا۔بیشتر اسباق مشکل، فرسودہ اور غیر دلچسپ ہیں۔ان میں درجہ بندی کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔

مذکورہ بالا جائزے کی روشنی میں یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ اردو زبان کی صورت حال اس ملک میں اچھی نہیں ہے بلکہ بعض اعتبار سے صورت حال اتنی خراب ہے کہ خوش فہمیوں کے چلن سے باہر آ کر اگر مناسب اور موثر اقدامات نہ کیے گئے تو اس کا وجود مٹنے میں وقت نہیں لگے گا۔

اس بدتر صورت حال اور تشویش ناک مستقبل سے نکلنے کی صورت یہ ہے کہ بہی خواہانِ اردو تبلیغی

جماعت کے نظام دعوت کے جوش و خروش اور عیسائی مشنریوں کے مشنری ایکسپرٹ کے انداز پر اس زبان کے تحفظ اور فروغ کے لیے کام کریں اور ایسی تڑپ اور چاہت پیدا کریں جو معشوق کی فرقت میں عاشق کی ہوتی ہے اور اس تگ و دو کا مظاہرہ کریں جو حصول محبوب یا وصالِ یار کی خاطر صحراؤں میں نظر آتا ہے۔اس سلسلے میں ہماری تجویز یہ ہے کہ درج ذیل امور پر توجہ دی جائے:

(۱) اردو کے تئیں جو محسوس کیا جا رہا ہے کہ اردو پڑھنے والا پسماندہ ہے، اسے دور کیا جائے۔

(۲) اس احساس کو بھی دل و دماغ سے مٹایا جائے کہ اردو روزگار کے مواقع فراہم نہیں کرتی۔

(۳) روزگار کے سارے امکانات پر روشنی ڈالی جائے اور جہاں جہاں جس جس صورت میں روزگار کی گنجائشیں موجود ہے اس کی نشاندہی کی جائے۔

(۴) اردو تعلیم و تدریس پر زیادہ زور دیا جائے اور اسے سائنٹفک بنایا جائے۔

(۵) جہاں اردو تعلیم کا نظم ہے وہاں بہتر بنانے کی کوشش کی جائے۔

(۶) جہاں انتظام نہیں ہے مگر پروویزن ہے وہاں انتظام کی صورت پیدا کی جائے۔

(۷) جہاں نہ انتظام ہے اور نہ ہی پروویزن، مگر پڑھنے والے مناسب تعداد میں موجود ہیں، وہاں اردو کی تدریس کے انتظام کے لیے کوشش کی جائے۔

(۸) تدریس کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں انہیں دور کیا جائے۔

(۹) پرائمری سے لے کر کالج اور یونیورسٹی کی سطح کے نصابات کو نصاب کے اصولوں اور جدید تدریسی تقاضوں کو سامنے رکھ کر ان پر نظر ثانی کی جائے۔انہیں معیاری، موثر، مفید، دلچسپ اور آسان بنایا جائے۔

(۱۰) اردو بولنے، سننے، پڑھنے اور لکھنے کی طرف لوگوں کو مائل کیا جائے۔ان سے کہا جائے کہ اردو ضرور پڑھیں اور اس سمت میں اپنی پیش روی کو تیز رفتار بنائیں۔

(۱۱) گھروں میں اردو کا ماحول قائم کیا جائے۔

(۱۲) بچوں میں اردو کی اہمیت کو اجاگر کر کے اردو سے ان کی رغبت پیدا کی جائے۔

(۱۳) اچھی، معیاری، خوبصورت، معلوماتی اور دلچسپ کتابیں شائع کی جائیں۔

(۱۴) اردو کی اچھی فلمیں اور سیریل دکھانے کا اہتمام کیا جائے۔

(۱۵) مرکزی حکومت کے زیر اہتمام چلائے جانے والے مراکز، اکادمی، اردو میڈیم اساتذہ، نیز اعلیٰ پیمانے کے دیگر اداروں کے پروگراموں کو زیادہ سے زیادہ شیئر کیا جائے اور ان سے استفادہ کی راہ بھی ہموار کی جائے۔

(۱۶) سچر کمیٹی اور دوسری کمیٹیوں کی روشنی میں مرتب کیے جانے والے سرکاری منصوبوں اور پروگراموں کو عمل میں لانے کی تدبیریں کی جائیں اور ایسا دباؤ بنایا جائے کہ وہ پروگرام کسی بھی صورت میں رکنے نہ پائیں۔

(۱۷) اردو کے ہم خیالوں کی ایسی تنظیمیں بنائی جائیں جو اردو کے سرکاری اور نیم سرکاری اداروں، تنظیموں اور اسکولوں وغیرہ پر نظر رکھیں اور وقتاً فوقتاً اچانک ان کا معائنہ کرایا جائے اور اس کی رپورٹ اخبارات و رسائل میں شائع کرائی جائے۔

(۱۸) اردو تنظیمیں یہ مہم بھی چلائیں کہ اردو کا دعویٰ کرنے والے لوگ اپنی تقریبات کے دعوت نامے اردو میں چھپوائیں اور دیگر کام بھی اردو میں کرنے کی کوشش کریں۔

(۱۹) وہ ریاستیں جن میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے اور جہاں اردو میں کام کرنے کے لیے دفتروں میں اردو مترجم رکھے گئے ہیں ان کا ہاتھ بٹائیں اور حکومت کو یہ کہنے کا موقع نہ دیں کہ اردو میں درخواستیں موصول نہیں ہوتیں۔

(۲۰) کوشش کی جائے کہ مترجم کے عہدوں پر ایسے لوگوں کی تقرری عمل میں لائی جائے، جنہیں ترجمے کے فن کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب پر بھی مضبوط پکڑ ہو۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اگر مذکورہ بالا باتوں پر دھیان دیا جائے اور ان پر نیک نیتی اور سنجیدگی سے عمل کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ اردو اپنی موجودہ صورتِ حال کے تشویشناک دائرے سے باہر نکل سکتی ہے بلکہ اپنا کھویا ہوا وقار بھی حاصل کرسکتی ہے۔

اس ملک کی آبرو و شان ہے اردو ہندی اگر جسم ہے تو جان ہے اردو

☆☆☆

Dr. Sahar Afroz
Head, Dept. of Urdu, G.D.
College, Begusarai (Bihar)
Mob. 7667633813

مزاحیہ ادب وصحافت پر 'اودھ پنچ' کے اثرات

سید الفت حسین

کسی تحریر یا تقریر میں طنز و مزاح کی رنگ آمیزی کا مقصد ہنسی اور طنز کے پس پردہ زندگی کی اصلاح ہے۔ مزاحیہ ادب تندرستی فکر اور صحت کو بحال رکھنے میں بھی بڑا موثر اور معاون ثابت ہوتا ہے، ساتھ ہی ادب وصحافت کے تئیں جاذبیت پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ادبی اور صحافتی تخلیقات میں طنز وظرافت کی پرتیں فکر انگیز ہوتی ہیں۔ اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ظریفانہ صحافت نے بہت حد تک تخلیقی اسلوبیات کو اعتبار بخشا اور اسے ہردلعزیز بنایا۔

ظرافت ہنسی اور قہقہے کی محرک سمجھی جاتی ہے، جب کہ طنز معاشرتی ناہمواریوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ہنسی اور طنز ومزاح انسانی جبلت میں بھی شامل ہے۔ کسی فن کار کا اپنی تحریر میں طنز و مزاح کے عنصر کو راہ دینے کا راز محض انسان کو ہنسانا اور طنز و تمسخر کا نشانہ بنانا نہیں ہے، بلکہ ایک ظریف کا عزم طنز کے پس پردہ سماج اور افراد میں پائی جانے والی کمزوریوں کے تئیں متنبہ کرنا اور زندگی کے بہت سے پیچیدہ مسائل اور مشکلوں کا سدباب کرنا ہے۔ اسی لیے ایک ظریف یا طنّاز پہلے اپنی باتوں میں ہنسی کا رس گھولنے کی مساعی کرتا ہے اور اس کے بعد ہمارے مختلف شعبہ ہائے حیات میں پائی جانے والی کمزوریوں اور خامیوں کو اپنے طنز کا ہدف بنانے پر مجبور ہوتا ہے۔

دنیا کا کوئی بھی رائٹر ہو یا اُوریٹر وہ اپنی فکر انگیز طنزیہ تحریروں اور تقریروں میں ظرافت کا لیپ اس لیے چڑھاتا ہے کہ اس کی تلخ باتوں میں تلخی کے احساس کو کم کیا جاسکے۔ وہ یہ حربے انسان کے ذہنی دریچے میں جھانکنے اور اس کی فکر تک رسائی کی خاطر اپناتا ہے جو کم وبیش اپنا اثر بھی رکھتے ہیں۔ اسی لیے ادبی یا صحافتی تحریر میں طنز و مزاح کا عنصر ناگزیر ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ اور مسائل زندگی کے پیش نظر طنز نگاروں نے اپنی تحریروں میں طنز و تنقید سے بہت کام لیا۔ آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد بے اعتدالی، بے ایمانی، تعصب،

نسل کشی اور بے حیائی جیسی خرابیوں کے پیش نظر ادیبوں اور صحافیوں نے طنز و ظرافت سے خوب کام لیا۔

اردو میں طنز و مزاح کو نئی شکل دینے میں مزاحیہ صحافت کا بڑا عمل دخل رہا ہے۔ جدید ظرافت نگاری کو نئی سمت و رفتار دینے میں ان ادیبوں اور صحافیوں کے کردار ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے جنہوں نے اپنے طنزیہ و مزاحیہ کلام، فکاہیہ مضامین اور کالموں کے ذریعہ مختلف شعبہ ہائے حیات میں پیدا ہوئے مسائل کے خاتمے کے لیے کئی نئے تجربے کیے۔

عام طور پر اخبار و جرائد میں ادبی کالم یا گوشے کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اخبار میں اس کے لیے خاص جگہیں بھی ہوتی ہیں جو اخبار و رسائل کے معیار اور استناد کی ضامن ہوتی ہیں۔ صحافت کی تاریخ میں بہت سے پرچوں کا ذکر ملتا ہے جہاں کم و بیش ظرافت آمیز تحریریں ملتی ہیں مگر ظریفانہ صحافت کی دنیا میں منشی سجاد حسین کے 'اودھ پنچ' (۱۸۷۷ء) کو جو معیار اور استناد نصیب ہوا اس کی مثال دیکھنے کو نہیں ملتی۔ ادب و صحافت کے میدان میں اس اخبار کو سنگ میل کا درجہ اس لیے بھی حاصل ہے کہ جہاں اس نے قومیت دشمن عناصر کو مات دیا وہیں نفس اور دولت کے پجاریوں کی بے اعتدالی، ناانصافی اور گندی سیاست کے خلاف بھی آواز بلند کی۔ اگرچہ حفیظ احمد کے 'مذاق' (رام پور) نے بھی اپنی ایک الگ پہچان بنالی تھی لیکن اس کا پایہ 'اودھ پنچ' تک نہیں پہنچتا۔ اردو کی صحافتی دنیا میں کئی مشہور اخبارات و رسائل کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً 'اردو اخبار'، 'سیدالاخبار'، 'نور مشرق' اور 'فوائدالناظرین'، 'کشف الاخبار'، 'کوہ نور'، 'شرف الاخبار'، 'وکٹوریہ پیپر'، 'کارنامہ'، 'اودھ اخبار' وغیرہ لیکن ان کی نوعیت مزاحیہ نہیں ہے۔ تاہم یہ بھی طنزیہ تحریریں شامل کرتے رہے۔

انیسویں صدی کے ربع آخر میں کئی ایسے ادیب و صحافی نظر آتے ہیں جنہوں نے زندگی کے ہر شعبے پر نگاہ ڈالی اور جو کمیاں نظر آئیں ان کو اپنے طنز و تمسخر کا نشانہ بنایا۔ جب بیسویں صدی کا سورج طلوع ہوا تو سامراجی طاقت اور مغرب کی سوچ کا زندگی پر بہت منفی اثر پڑا۔ ایسے میں اس وقت کے ادیب و صحافی ان طاقتوں سے لڑنے، نپٹنے، چوٹیں پہنچانے اور للکارنے کا خوب کام کرتے رہے۔ ان کی طنز و تنقید کا نشانہ ہمارے سماج کے کچھ ایسے بے حس اور نادان افراد بھی بنے جن کا ضمیر مردہ ہو چکا تھا اور وہ ظالم و جابر حکمرانوں کے پٹھو بنے بیٹھے تھے۔ ظریفوں نے ایسے افراد کو ان کی غلط فکر کا احساس دلا کر ان کی حمیت کو جگانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ یہ ذمہ داری تو متعدد پرچوں نے نبھائیں لیکن 'اودھ پنچ' نے خصوصی طور پر بھٹکے ہوئے اذہان کو جھنجھوڑنے کا کام کیا۔

'اودھ پنچ' اردو کا ایسا مزاحیہ پرچہ ثابت ہوا جو یکجہتی اور سالمیت کا علم بردار بنا رہا اور سماجی و تہذیبی زندگی اور روایتی رسم و رواج کے دشمن عناصر کا زبردست حریف بن کر ابھرا۔ اس کے مشن کو دیکھتے ہوئے

اس دور کے کئی پرچوں نے اس کا تتبع بھی کیا جس کی آواز کا اثر اپنے عہد اور ماحول پر براہ راست پڑا اور اسے تادیر محسوس کیا گیا۔

'اودھ پنچ' کا اپنا ایک اصول تھا جس سے اس نے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ اس کے وسیع و وقیع مضامین اور منظوم تحریریں، حکمراں طبقوں اور حاکموں کی بدعنوانیوں اور بداعمالیوں کو بے نقاب کرتی رہیں جن کے غلط رویے سے ہمارا معاشرہ تباہی و بربادی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مغربی فرماں رواؤں کے جابرانہ اور غاصبانہ رویے اور دوہری پالیسیاں خصوصیت سے اس کا نشانہ بنتی رہیں۔

'اودھ پنچ' سے وابستگی کے دوران جن اہل قلم کے فکر و فن کی سحر انگیزی اپنا اثر دکھاتی رہیں ان میں مرزا مرتضیٰ عرف مچھو بیگ عاشق بھی تھے جن کا قلمی نام ستم ظریف تھا۔ وہ ۳۳؍ برسوں تک اس کے لیے مزاحیہ مضامین لکھتے رہے۔ نواب سید محمد آزاد، اکبرالہ آبادی، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، پنڈت جوالا پرشاد برق، منشی احمد علی شوق جیسے اہل قلم کے علاوہ برق آشیانوی، ضاحک اور سید علی اصغر قابل ذکر ہیں۔ اس اخبار کے نورتنوں میں اکبرالہ آبادی کی ذات اس لیے سرخیل کا درجہ رکھتی ہے کہ ان کی اعلیٰ فکر اور ذہنی اپج نے جہاں ظلم و زیادتی کے خلاف نبرد آزمائی کی دعوت دی وہیں لوگوں کو باخبر کرنے کا کام بھی کیا۔ 'اودھ پنچ' ہندو مسلم اتحاد اور انڈین نیشنل کانگریس کا موید تھا اور مغربی تہذیب کا حریف اور مشرقی اقدار کا علمبردار بنا رہا۔ یہ اخبار چھتیس برس تک نکلتا رہا اور ۱۹۱۲ء میں منشی سجاد حسین کی زندگی میں ہی بند ہوا۔

'اودھ پنچ' سرسید تحریک کے ردعمل میں سامنے آیا تھا جو پرانی تہذیب کا حمایتی اور جدید تعلیم کا مخالف تھا۔ جب کہ یہ تحریک بھی قوم کی آزادی و خوشحالی اور تعلیم و ترقی کی خاطر شروع ہوئی تھی۔ بہرکیف! 'اودھ پنچ' نے سماجی و سیاسی مسائل سے لڑنے کے ساتھ کئی ادبی معرکے بھی سر کیے۔ اس نے دہلی، لکھنو اور پٹنہ کے ادیبوں اور شاعروں کے فن پاروں اور ان کی زبان و بیان کے پیش نظر جس قدر بحثیں کیں وہ اظہر من الشمس ہے۔ اس نے شادؔ، حالیؔ اور آتشؔ کی زبان اور ان کے کلام کی تصحیح کے حوالے سے بھی لکھا۔ اسی لیے جب زبان کی صحت کی بات آئی تو اس کا یہ عنوان سامنے آیا:

ہم ان کے حسن بیاں کے اثر کو دیکھتے ہیں　　وہ کون ہیں کہ جو پہلے ادھر کو دیکھتے ہیں

ادبی اعتبار سے 'اودھ پنچ' کی شوخی و ظرافت، طنز نیز لفظی بازی گری وغیرہ توجہ طلب ہیں۔ وزیر آغا نے اپنی کتاب میں برج نرائن چکبستؔ کے دیباچے 'گلدستۂ پنچ' کے حوالے سے تحریر کیا ہے:

''اودھ پنچ' نے چار بڑے معرکوں میں حصہ لیا۔ پہلا معرکہ فسانۂ آزاد...... دوسرا حملہ مولانا حالی کو سہنا پڑا...... 'اودھ پنچ' کے تیسرے حملے کا نشانہ داغؔ کی شاعری تھی......

’اودھ پنچ‘ کا آخری معرکہ گلزار نسیم سے متعلق ہے......‘‘(۱)

ویسے تو’اودھ پنچ‘ سے قبل اوراس کے بعد’پنچ‘ اخبارات کے کئی بیخ و بن سامنے آئے جن میں بطور خاص’سرپنچ‘، ’بنگال پنچ‘، ’دہلی پنچ‘، ’مدراس پنچ‘ اور’اِلپنچ‘ پٹنہ وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں،لیکن’لندن پنچ‘ کے طرز پرلکھنو سے شائع ہونے والے ہفت روزہ’اودھ پنچ‘ کو منشی سجاد حسین نے جو معیار بخشااس کی مثال نہیں ملتی۔لوگوں کا ماننا ہے کہ یہ اخبار سیاست کوظرافت کا جامہ پہنا کر پیش کرتا تھا۔بقول وزیر آغا:

’’اودھ پنچ‘اپنی طرز کا پہلا اخبار تھااوراس کی مقبولیت کا اندازہ محض اس بات سے ممکن ہے کہ یہ اخبار ایک باقاعدہ تحریک کا پیش رو ثابت ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستان بھر میں پنچ اخبارات کاایک سلسلہ شروع ہوگیا۔۱۸۷۸ء میں’پنجاب پنچ‘ نکلا۔’بنگال پنچ‘، ’دہلی پنچ‘ ۱۸۸۰ء میں ظاہر ہوئے۔’باوا آدم پنچ‘ اور’راجپوتانہ پنچ‘ نے ۱۸۸۱ء میں جنم لیا۔’سرپنچ‘ ۱۸۸۳ء میں بمبئی سے نکلا۔ ۱۸۸۵ء میں’جعفرزٹلی‘اور’دکن پنچ‘ نکلے۔ ۱۸۸۶ء میں’سرپنچ‘ نے میرٹھ سے سر نکالا اور ۱۸۸۷ء میں’چلتا پرزہ‘ اور’ملا دو پیازہ‘ نمودار ہوئے۔ان کے علاوہ ظریفانہ رنگ میں کئی اور پرچے بھی نکلے جن میں’اخباروں کا قبلہ گاہ‘، ’بانکی پور پنچ‘، ’پائے خاں‘، ’شیخ چلی‘اور’البیلا‘ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔اس زمانے میں گورکھ پور سے ریاض خیرآبادی نے’ریاض الاخبار‘ نکالا۔’فتنہ‘اور’عطر فتنہ‘ بھی اس کے ساتھ ہی نکلا کرتے تھے۔’فتنہ‘ میں مختصر نثر کے شوخ ظریفانہ مضامین ہوتے تھے اور’عطر فتنہ‘ میں اس زمانے کے شعرا کا منتخب کلام۔مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ان میں سے کسی بھی اخبار کو وہ مقبولیت نصیب نہ ہوسکی جو’اودھ پنچ‘ کو حاصل تھی۔‘‘(۲)

’اودھ پنچ‘ کے معاصر یااس سے قبل اور بعد بھی کئی اہم اخبارات سامنے آئے اوراپنی اہم ذمہ داریوں کو بھی نبھایا۔ چراغ حسن حسرت کا’شیرازہ‘ اور ریاض خیرآبادی کے’ریاض الاخبار‘اور’فتنہ‘ و’عطر فتنہ‘ اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں جن پر لوگوں کی نظریں پوری طرح جمی رہیں۔ ان اخباروں نے زمانے کی ناہمواریوں کے پیش نظر طنز وظرافت سے خوب کام لیا۔ریاض نے’تار برق‘، ’صلح کل‘، ’گل کدۂ ریاض‘ میں بھی ظرافت کے رنگ کو اپنایا اور زمانے کو ابتلا کی منزل سے نجات دلانے کی کوشش کی۔ان کی تحریریں ماحول کی خوشگواری اور زندگی کی پریشانیوں کے سدباب میں بہت موثر بنیں لیکن’اودھ پنچ‘ نے ادب اور زندگی کے لیے جو کام کیا اس کی وجہ سے اپنا رعب ودبدبہ قائم کرلیا۔

منشی سجاد حسین کے انتقال کے بعد جب’اودھ پنچ‘ کا شیرازہ بکھرنے لگا تو اس دوران ۱۸۸۶ء میں

’سرپنچ‘ سامنے آیا جس نے اپنے پُرکشش کارٹونوں اوراپنی مزاحیہ تحریروں سے بہت کم وقت میں شہرت حاصل کرلی۔اس نے اچھا لکھنے والوں کو جگہ دے کر اپنے Motive کو کامیابی کے ساتھ آگے بڑھانے اور زمانے کو حالات سے آگاہ کرانے کا کام کیا۔ اس نے جن مزاح نگاروں کو اپنی طرف راغب کیا اور جنھوں نے ادب وصحافت کو رفعت و بلندی بخشنے کی سعی مستحسن کی، ان ذی وقار فن کاروں میں ظریف لکھنوی، چودھری محمد شہباز، احمق پھپھوندوی وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔یہ افراد اپنی قلمی معاونت کی وجہ سے بہت مشہور ہوئے جن کی ذات سے اخبار کو بھی شہرت ملتی رہی۔

ریاض خیرآبادی کا’فتنہ‘اور’عطر فتنہ‘ اس لیے خصوصیت کا حامل ہے کہ’اودھ پنچ‘ کے دنوں سے ہی اس میں ادبی مضامین شائع ہوتے تھے اور یہ خاص اسلوب کی وجہ سے جاذب نظر تھا۔یہ خبروں کی نوعیت کے اعتبار سے بھی دیگر پرچوں سے منفرد تھا مگر اپنے عہد کی سماجی، تہذیبی اور سیاسی زندگیوں کو خوب چیلنج کرتا رہا۔اس کی لطف انگیز اور مزاحیہ تحریریں قہقہہ لگانے پر مجبور کردیتی تھیں۔’شاہدان ناز‘ فتنہ کا ایک اہم موضوع تھا۔’فتنہ‘ کے مزاج اور مذاق کو دیکھتے ہوئے حسرتؔ موہانی کو کہنا پڑا تھا کہ’’اس میں ایسے ایسے مضامین نکلتے ہیں جن کو دیکھ کر طبیعت بے قابو ہوجاتی ہے۔‘‘’فتنہ‘ کے ذریعہ ریاض کی شوخ مزاجی اور برق طبعی کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اس اخبار کو حکومت کا نشانہ بھی بننا پڑا،لیکن جب یہ دوسری بار سامنے آیا تو اس کے نام میں ایک لفظ کا اضافہ کردیا گیا اور پھر یہ’عطر فتنہ‘ کے نام سے نکلا۔حسرتؔ موہانی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

’’......ابتدا میں اس میں زیادہ تر نثر کے شوخ اور چلبلے مضامین ہوا کرتے تھے مگر کئی سال بعد اس کا ایک نظم کا حصہ بھی نکلنے لگا جس میں اردو زبان کے تمام گلدستوں سے چوٹی کے اشعار چھانٹ کر درج کیے جاتے تھے۔ چنانچہ اس کا نام’عطر فتنہ‘ بہت صحیح تجویز کیا گیا اور جناب ریاض کا یہ شعر:

پسلی پھڑک اٹھی نظر انتخاب کی　　　چھانٹا وہ دل کہ جس کو ازل سے نمود تھی

زیر عنوان’عطر فتنہ‘ ہونے کے سبب تمام دنیائے ادب میں ضرب المثل کی طرح مشہور ہوگیا......’فتنہ‘ کے بعد اور بھی پرچے اس انداز پر نکلے مگر کسی کو کامیابی نصیب نہیں ہوئی......‘‘(۳)

مزاحیہ ادب وصحافت کی دنیا میں سرزمین بہار کی بھی اپنی تاریخ رہی ہے۔ یہاں کے ادیب، شاعر اور صحافی نے ادب وصحافت کو ایک نئی جہت دی۔’اِلپنچ‘ یہاں کا ایک اہم مزاحیہ پرچہ تھا جو اپنی خاص مزاحیہ

تحریروں کی وجہ سے مشہور تھا۔ یہ پرچہ ۱۸۸۵ء میں جاری ہوا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب اس کی تحریر نظروں سے گزرتی تھی تو لوگ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جایا کرتے تھے۔ اسے بے باک صحافی اور اچھا لکھنے والوں کی قلمی معاونت حاصل رہی۔ انگریز انتظامیہ اور ظالم و جابر حکمرانوں پر خاص نظر رکھتا تھا۔ اس نے مغرب کے جَور وستم اور عوام مخالف پالیسیوں سے پردہ اٹھانے کا کام کیا۔ ملک اور سماج کے دشمن عناصر اس کے خاص ہدف بنے۔ گویا اس کی آواز ناانصافی اور ظلم وتشدّد کے خلاف تھی۔ مظلوموں کے حق کی حمایت کرنا اور ظالموں کی بربریت کے خلاف احتجاجی نعرہ بلند کرنا اس کا ایمان تھا۔ اس کی ایک رپورٹ میں سال کے اختتام پذیر ہونے اور نئے سال کی آمد پر یہاں کے حالات وحادثات کے جو مناظر پیش کیے گئے ہیں انھیں پڑھ کر دل لرز اٹھتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''اے انٹھانوے! تو بڑا ہی موذی، ظالم، بے رحم، دغاباز و سرکش تھا۔ تیرے مظالم کا اثر زمانۂ دراز تک لوگوں کے دلوں پر طاری رہے گا، تیری بے رحمی کا خار ایک مدت تک ہمارے دل میں کھٹکتا رہے گا۔ تیری سرکشی کے کارنامے صفحۂ تاریخ میں سیاہی سے لکھے جائیں گے۔ اے کاش تو نہ ہوتا۔ ہائے تو نے ہم پر آفتیں نازل کیں، قہر توڑے، بجلیاں گرائیں، مصیبتوں میں ڈالا، جلاوطن کیا، ایک خلق کو زلزلہ میں ڈال کر تہ وبالا کیا، ہم کہاں تک اپنے جانکاہ صدمہ کو شمار کریں۔ ایسی کون سی مصیبت تھی کہ جھیلنی نہ پڑی اور ایسا کون سا صدمہ تھا کہ اٹھانا نہ پڑا۔'' (۴)

مذکورہ بالا اقتباس کو پڑھنے کے بعد ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ انسانی زندگی کو ماضی میں کس قدر سنگینی کا سامنا رہا جس کے منفی اثرات تعلیمی، اقتصادی وترقیاتی زندگی کو مجروح کرتے رہے۔ ایسے میں انسان اور سماج دشمن عناصر کے غلط رجحان کو بڑھاوا دینے والے مجرم جو ناقابل معافی استعماریت کی جڑیں مضبوط کرنے میں منہمک تھے، 'اپنچ' نے انھیں اپنا ہدف بنایا۔

'اپنچ' اپنی آواز کو بڑے زور وشور کے ساتھ دوسروں تک پہنچاتا تھا۔ یہ اپنے قاری کو قہقہہ لگانے پر بھی مجبور کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب ہنسی اور قہقہے سے کام لیتا تھا، تو اس کی ایسی ایسی مزاح آمیز تحریریں سامنے آتیں کہ قارئین بے تحاشہ ہنس پڑتے تھے۔ اس نے شادؔ عظیم آبادی کی تصنیف 'نوائے وطن' کے ان جملوں کو خاطر خواہ ہدف بنایا جن میں پٹنہ کے باہر سے آئے افراد کی اردو گفت وشنوشت کی بات کہی گئی ہے۔ اس پاداش میں شادؔ کی دیگر تحریروں نیز کلام کے زبان وبیان پر اس نے جس قدر حملے کیے اس کی مخاصمت کی بنا پر اس پر سوال بھی اٹھتے رہے۔

چراغ حسن حسرت کا فکاہیہ ہفت روزہ 'شیرازہ' جب سامنے آیا تو اس کے عزائم ومقاصد کو دیکھتے ہوئے لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ چوں کہ یہ زمانہ اردو ادب کی ترقی پسندی کا تھا، اس لیے جدید نظریہ رکھنے والے ادیب وشاعر اس کے مزاج کے پیش نظر اس سے وابستہ ہوئے اور ادب میں زندگی کی تلاش کو ساتھ لے کر چلے جس کا اثر اس پرچے پر دیکھا جانے لگا۔

غور طلب ہے کہ حسرت نے اپنے ساتھ چلنے والے مزاح نگاروں کی جو خاص جماعت تیار کی تھی ان میں سے کئی صاحبان فکر آگے چل کر اردو کے درخشندہ ستارے کے مانند آسمان طنز وظرافت پر نظر آئے۔ عبد المجید سالکؔ، حفیظؔ ہوشیار پوری، میراجی، عطاء اللہ سجاد، محمود نظامی، خضر تمیمی، محمد فاضل، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، کنہیا لال کپور، ضمیر جعفری اور عاشق محمد غوری اسی سلسلے کے نام ہیں۔ عاشق نے نظمیں بھی لکھیں، لیکن ان کی مزاحیہ نظموں کا تخلیقی سلسلہ تادیر باقی نہ رہ سکا۔

'اودھ پنچ' کی روشنی گل ہونے اور 'شیرازہ' کی روشنی منور ہونے کے دوران مزاحیہ شاعروں اور نثر نگاروں کی ایک بڑی کھیپ سامنے آئی جن کی قلمی معاونت سے ظریفانہ ادب وصحافت کو فروغ ملتا رہا جس سے مزاحیہ ادبی سرمائے میں قابل ذکر اضافہ ہوتا رہا۔ پریم چند، عباس حسینی، مہدی افادی، قاضی عبد الغفار، خواجہ حسن نظامی، ملا رموزی، ظفر علی خاں، ابو الکلام آزاد، امتیاز علی تاج، عظیم بیگ چغتائی، فرحت اللہ بیگ وغیرہ علم وادب کی نہایت معتبر کڑیاں ہیں۔ ان میں سے کچھ تو مزاح نگار کی حیثیت سے مشہور ہوئے اور کچھ ناول، افسانہ، مضمون اور دیگر ادبی تحریروں کی وجہ سے پہچانے گئے۔ اس فہرست میں کچھ فن کاروں کی حیثیت ظراف نگار کی نہیں ہے لیکن ان کے یہاں کم ہی سہی مگر تحریروں کو دلکش اور موثر بنانے کی غرض سے طنز اور مطایبات کا رنگ چڑھا ملتا ہے۔

ہفتہ وار اور روزناموں کے فکاہیہ کالم نویسوں نے بھی بعض مقامات پر طنز وتنقید سے کام لیا ہے۔ ابو الکلام آزاد کا 'الہلال' جو کلکتہ سے ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء کو جاری ہوا تھا، اپنی کئی خوبیوں کی وجہ سے زمانے پر چھایا رہا بلکہ یہ دیگر پرچوں کے لیے مشعل راہ بھی بنا۔ اس اخبار کا فکاہی کالم 'افکار وحوادث' اس قدر جاذب ہوتا تھا کہ اس کے طرز کو دوسرے کئی پرچوں نے سراہا اور اس انداز کو اپنانے پر مجبور بھی ہوئے۔ چوں کہ اس کے کالم میں ملک کے سیاسی حالات طنز وتمسخر کا خاص نشانہ بنتے رہے، اس لیے اکثر لوگوں کی نگاہیں اس پر جمی رہیں۔ 'الہلال' کے بارے میں مولانا آزاد نے فرمایا کہ مسلمانوں کے اندر مذہبی رواداری اور سیاسی بیداری پیدا کرنا اس پرچے کا خاص مقصد رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ہندو اور مسلمانوں سے بلاتفریق قوم وملت متحد ہونے کی تلقین کی اور مسلمانوں کو اپنی تعداد کے بجائے اپنے ایمان پر اعتماد کرنے کی ہدایت دی۔

متذکرہ اخبار کے علاوہ 'ہمدرد' بھی اپنے زمانے میں ملک وملت کا ہمدرد اور مسیحا بن کر سامنے آیا۔ دہلی سے نکلنے والے مولانا محمد علی جوہر کے اس پرچہ کو اپنے وقت کا ترجمان کہہ سکتے ہیں جس نے اپنے دور کے حالات اور مسائل پر خوب تبصرہ کیا۔ اس میں سید محفوظ علی بدایونی اور بمبوق کے بھی مضامین شائع ہوئے۔ بدایونی اور بمبوق نے اپنے مزاحیہ مضامین میں سیاسی حالات کے پیش نظر اچھی سوجھ بوجھ دکھائی۔ حالاں کہ جہاں زندگی کے مسائل کی ریل پیل میں زمانہ تیزی سے کروٹ بدل رہا تھا، وہیں معاشرتی افکار و نظریات میں تغیرات سے زندگی کے کئی شعبے ابتری کا شکار بھی ہورہے تھے جن کے مضر اثرات پوری طرح نمایاں تھے۔ چنانچہ ہماری سوسائٹی میں مثبت فکر وعمل کے اعادہ کی خاطر اس اخبار نے رہنمائی کے لیے لکھنے کا انوکھا انداز اپنایا اور تنگ نظری سے نپٹنے کا بھی کام کیا۔

مولانا محمد علی جوہر (۱۹۳۱ء-۱۸۷۸ء) بھی ایک ہندوستانی سیاسی رہنما، نامور صحافی، دانشور اور اچھے شاعر تھے۔ خلافت تحریک کے سرگرم کارکن بھی رہے۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج و جامعہ ملیہ (۱۹۲۰ء) کے شریک بانی بھی رہے۔ کچھ دنوں کے لیے انڈین نیشنل کانگریس کے صدر بھی بنائے گئے۔ محمد علی کے بلند رتبہ کے پیش نظر ادھر کچھ سال قبل رام پور میں محمد علی جوہر یونیورسٹی قائم کی گئی ہے۔ محمد علی جوہر نے ۱۹۱۱ء میں 'ہمدرد' نکالا۔ اس کے علاوہ انگریزی پرچہ 'کامریڈ' بھی جاری کیا جو اپنی بے باک تحریروں کی وجہ سے مشہور تھا۔

آزادی سے قبل اور اس کے بعد بہت سے پرچے افق صحافت پر نمودار ہوئے۔ اکثر پرچے روشن مستقبل کی خاطر شمع ہدایت بنے رہے۔ 'الہلال'، 'ہمدرد' اور 'زمیندار' اس بابت بہت اہم ہیں کہ یہ اپنی بے مثل کارکردگی اور قومی ہمدردی کی وجہ سے لوگوں کے دلوں پر چھائے رہے۔ ان اخباروں نے انگریزوں کے ناپاک ارادوں، سیاسی عزائم و میلانات کے خلاف ہر حربے اپنائے اور بہت سے معرکے سر کیے۔ فاشسٹ وفسطائیت کے حوصلے کو پست کرنے کی خاطر ان اخباروں نے جو کردار ادا کیے، اسے دنیا ہمیشہ یاد رکھے گی۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور محمد علی جوہر کے علاوہ ظفر علی خاں بھی ایسے مجاہد ہیں جنہوں نے ملک کی تحریک آزادی اور یہاں کی سالمیت کو سامنے رکھ کر بڑی ذمہ داریوں کا ثبوت دیا۔ وہ ایک بے باک صحافی تھے اور لاہور سے 'زمیندار' نکالتے تھے۔ ان کی بے باکی کا یہ عالم تھا کہ انگریزوں کے ہر وہ اقدام اور رویے جو ہماری قومی وتہذیبی قدروں کے خلاف تھے، اپنے زور قلم سے کچلنے کی کوشش کی۔ جلیاں والا باغ (امرتسر) کا جو واقعہ پیش آیا تھا وہ آج بھی ہمیں خون کے آنسو رُلا دیتا ہے۔ اس المیہ کا اندازہ ہم صرف ایک شعر سے لگا سکتے ہیں جو اس زمانے کے کشت وخون اور خونچکاں واقعات کی داستان اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے لیکن یہ آزادی اور مساوات کی خاطر عوام کے دلوں سے خوف کو ختم کرتا اور نئے حوصلے اور

امنگ کو مضبوطی بھی بخشتا ہے:

جب امرتسر میں ہم پر گولیاں آئیں تو ہم سمجھے ۔۔۔ کہ بوندیں ہیں یہ اہل ہند کے خون تمنا کی

حالات سے نبرد آزما ہونے اور شہادت کے جذبے نے دشمنان ملک کو ہماری یکجہتی اور طاقت کا بخوبی احساس دلایا۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ظفر علی خاں کی شعلہ بار تقریر اور مزاحیہ تحریر ملک کے تحفظ اور سالمیت کے لیے بہت موثر ثابت ہوئیں۔ انہوں نے شرپسندی اور فسطائیت کے خلاف جو آواز بلند کی اس کی مثال کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ انہوں نے 'زمیندار' کے ذریعہ تحریک آزادی میں روح پھونکنے کا کام کیا اور اپنے عزائم اور مقاصد کو بہت دور دور تک پہنچایا۔ 'زمیندار' میں چھپنے والی طنز آمیز تحریریں زمانہ کے پیش نظر منافرت پھیلانے والوں کے حوصلے پست کرنے اور دشمنان ملک وملت کی سازشوں کو بے نقاب کرنے کے لیے ہوتی تھیں۔ ظفر علی خاں کے پرچے نے جہاں سیاسی دنیا میں اپنا اثر قائم کیا وہیں، طنز آمیزی کے عنصر کو بھی شعر وادب میں راہ دی۔ بقول وزیر آغا:

> ''روزنامہ 'زمیندار' کا ایک خوشگوار پہلو مولانا ظفر علی خاں کی اس طنزیہ شاعری کا آغاز تھا جس نے اردو شاعری میں نہ صرف امتیازی حیثیت حاصل کی بلکہ جس نے ملک کے سیاسی واقعات وتحریکات پر بھی اپنے اثرات مرتسم کیے۔'' (۵)

ظفر علی خاں صحافی اور ادیب ہونے کے ساتھ تاریخ داں بھی تھے۔ وہ حساس فکر رکھتے تھے اور گاندھیائی خیال کے حامی تھے لیکن نہ جانے بابائے قوم مہاتما گاندھی کا وہ کون سا نظریہ تھا جسے انہوں نے لائق اعتنا نہیں سمجھا اور خفگی کے بعد بابائے قوم گاندھی کے حامیان سے علیحدگی اختیار کرلی۔

ہمارے ملک کی تاریخ میں بیسویں صدی کے نصف اول کا زمانہ بڑا کربناک رہا۔ اس عہد کی تاریخ ایک سیاہ باب سے کم نہیں۔ اس لیے کہ ہمارے ملک کے امن وامان اور سلامتی کو بڑے چیلنج کا سامنا کرنا پڑا۔ اتحاد اور سیکولر دشمن طاقتوں اور حاکموں کے پٹھوؤں نے غلط پالیسیاں اپنا کر آپسی منافرت پھیلانے کا کام کیا۔ مغرب کے اس قابل ملامت رویے سے ہماری زندگی پوری طرح مفلوج ہوتی رہی جس کا ہمارے ملک کی اقتصادیات نیز تعلیمی، تہذیبی اور اخلاقی زندگی پر بہت بُرا اثر ہوا۔ مغرب کے بڑھتے ہوئے غلط رجحانات سے ایک طرف جہاں لوگوں کے وقار کو دھچکا پہنچ رہا تھا تو وہیں دوسری جانب آبرو کے ساتھ زندگی کی تباہی کی تصویریں بھی سامنے تھیں۔ ایسے میں دشمنوں کے ظلم واستبداد اور ملک کی تباہی سے تحفظ کے لیے ذمہ داران اپنی پرانی تہذیبی قدروں کے تحفظ کے لیے آگے بڑھے اور انسان وسماج دشمن عناصر سے پوری طرح نبرد آزما ہوئے۔ ملک کی سالمیت، خوشحالی، اتحاد اور اعتدال کی خاطر جو بڑی ادبی ہستیاں سامنے

آ ئیں ان میں سرسید اور اکبرالہ آبادی وغیرہ کا نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔

ایک طرف تجدد پسندی سے تعلیم وترقی کی نئی راہیں ہموار ہو رہی تھیں تو دوسری جانب مغرب کی شاطرانہ چال اور دوہری پالیسی سے یہاں کی پرانی تہذیبی وراثت بھی تار تار ہو رہی تھی۔ یہی سبب ہے کہ اکبر نے مغربی علوم وفنون اور اس کے بڑھتے ہوئے امکانات اور غلط رجحانات کی سخت مخالفت کی اور جدید تعلیم کو طنز کا زبردست نشانہ بنایا۔ اکبر نے براہ راست عصری تعلیم کی مخالفت کی تھی جب کہ سرسید نے مادیت کے شکار اور مذہب سے متنفر اور برگشتہ ہو رہے نوجوانوں کی اصلاح کے لیے عصری تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم کو بھی لازم بتایا۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید نے جدید تعلیم اور ہماری تہذیب کے پیش نظر ایک تاریخی کنونشن میں مسلم طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''میں چاہتا ہوں کہ تمہارے ایک ہاتھ میں قرآن ہو اور دوسرے میں علوم جدید اور سر پر 'لا الہ الا اللہ' کا تاج ہو۔''

غرض جب بیسویں صدی کا سورج طلوع ہوا تو ۱۹۰۱ء سے لے کر آزادی کے آخری ایام تک نہ جانے کتنے ہفتہ وار اور روزنامے معرض وجود میں آئے جن کی تحریریں آزادی کی تحریک کو تقویت بہم پہنچاتی رہیں اور ہمیں آزادی اور زندگی کی نئی سمت ورفتار کا پتہ دیتی رہیں۔ اس صدی کی الگ الگ دہائیوں میں جن اخباروں کا نمایاں کردار رہا ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کا ہفت روزہ 'الہلال' اور 'البلاغ'، مولانا ظفر علی خاں کا روزنامہ 'زمیندار'، مولانا حسرت موہانی کا 'اردوئے معلیٰ'، شانتی نارائن بھٹناگر کا ہفتہ وار 'سوراجیہ'، مولانا محمد علی جوہر کا 'ہمدرد'، مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی کا 'مسلم گزٹ' نیز بجنور سے نکلنے والا 'مدینہ'، طالب دہلوی کا 'ہمدم'، جواہر لال نہرو کا 'قومی آواز' بہت اہم ہیں۔ ان کے علاوہ ممبئی سے شوکت علی کا 'خلافت'، لاہور سے نکلنے والا 'انقلاب' بھی ہیں جن کے ایڈیٹر غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالکؔ تھے۔ ان اخبارات نے بھی خاصی مقبولیت حاصل کی۔

آزادی کی جنگ میں اخباروں کے علاوہ کئی رسالوں نے بھی مضامین شائع کر کے آزادئ ہند کی تحریک کو قوت بخشی اور آزادی کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا۔ اس ذیل میں جن رسائل کی اہم کارکردگی رہی ہے ان میں ماہنامہ 'بیسویں صدی' کو بڑی اہمیت حاصل ہے جس کے ایڈیٹر خوشتر گرامی تھے۔ انہوں نے اس ماہنامہ میں 'تیرونشتر' کے عنوان سے لکھا۔ ان کی تحریریں سماج کی تعمیر میں کارگر ثابت ہوئیں۔ اس سلسلے میں ظفر پیامی نے بھی اپنے قلم کا زور دکھایا اور کئی مزاحیہ مضامین لکھے۔ حیدرآباد سے نکلنے والا ڈیڑھ ماہی 'شگوفہ' بھی اپنی شگفتہ بیانی کی وجہ سے زمانے پر چھایا رہا۔ بہار سے شائع ہونے والا رسالہ 'ندیم' اور ممبئی سے شائع ہونے والے 'صبح امید' کی مزاحیہ تحریریں بھی آزادی کی لہر کو تیز کرنے میں موثر ثابت ہوئیں۔

اس دوران کالم نویسوں نے بھی اپنے قلم کا زور دکھایا بلکہ انھوں نے اپنے دور کی سنگینی کو سامنے رکھ کر بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تحریک آزادی میں روح پھونکنے کا کام کیا۔ 'ہمدرد' میں مولوی محفوظ علی 'تجاہل عارفانہ' کے عنوان سے مستقل کالم لکھتے رہے۔ بمبوق اور جان دہلوی نے بھی اس میں کالم لکھ کر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مولانا شوکت علی نے 'خلافت' میں مزاحیہ کالم 'باغ وبہار' کے عنوان سے لکھا۔ 'مدینہ' بجنور کا مزاحیہ کالم 'سرراہ'، 'انقلاب' میں غلام رسول مہرؔ اور عبدالمجید سالکؔ 'زمیندار' کے بعد 'افکار وحوادث' کے عنوان سے فکاہی شذرات لکھتے رہے۔ عبدالمجید سالک نے 'زمیندار' میں 'افکار وحوادث' کے تحت حکایتی کالم لکھنے کی ابتدا کی تھی۔ 'پیغام' کے مدیر قاضی عبدالغفار خود ہی مزاحیہ کالم لکھتے تھے۔ 'ملاپ' میں فکر تونسوی نے 'پیاز کے چھلکے' لکھ کر خوب شہرت پائی۔ 'سیاست' میں 'شیشہ و تیشہ' کے عنوان سے شروع میں شاہد صدیقی نے لکھا۔ مجتبیٰ حسین نے بھی یہ ذمہ داری نبھائی، اس کے بعد احمد جمال پاشا نے 'قومی آواز' لکھنو سے وابستہ ہو کر اس میدان میں شہرت پیدا کی۔ عبدالماجد دریابادی نے 'صدق'، محمد علی جوہر نے 'ہمدرد'، ظفر علی خاں نے 'زمیندار'، چراغ علی حسرت نے 'امروز' اور 'نوائے وقت'، مجید لاہوری نے 'نمکدان' نیز احمد ندیم قاسمی نے 'امروز' اور 'چٹان' میں کالم لکھا۔ ان ادیب اور صحافیوں کی تحریریں شعروادب کے فروغ اور سماج کی تعمیر وترقی میں موثر اور کارگر ثابت ہوئیں۔

آزادی کے بعد جب ہماری زندگی کی نئی صبح نمودار ہوئی تو جہاں ایک طرف خوشیاں محسوس کی جا رہی تھیں تو دوسری طرف ہمارے سماج میں عدم اعتمادی اور گمراہی جیسی خرابیاں بھی پیدا ہو گئی تھیں۔ آزادی کے بعد ہمارا ملک جو یہاں کے باشندوں اور شہریوں کے لیے ایک گھر آنگن کے مانند تھا پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد دو حصوں میں منقسم ہو گیا اور لوگ جب ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے تو عزیز و اقارب کی فرقت اور جدائی نے بھی لوگوں کے دلوں میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا کر دی۔ جہاں لوگوں کو اپنے بھائی، بہن اور رشتہ داروں سے چھوٹنے کا صدمہ رلا رہا تھا تو وہیں ان کی آنکھیں ماحول کی اضطرابیت اور ملک کے اندر کے انتشار کو بھی دیکھ رہی تھیں۔ ایسے حالات میں لوگوں کو دلاسہ دینے اور سمجھانے کی ضرورت تھی۔ ایسے میں اردو کے ظریف ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں نے اپنی فنکارانہ بصیرت کا ثبوت دیتے ہوئے لوگوں کے دلوں سے خوف وہراس کو ختم کرنے کی کوشش کی تاکہ یقین واعتماد بحال ہو سکے۔ ایسے میں ظریف ادیب وصحافی محتاط رویہ اپنا کر ان چیلنجوں سے نبرد آزما ہوتے رہے۔ آزادی کے بعد زبان، نسل اور رنگ کے امتیاز نے فرقہ وارانہ کشیدگی کو جس قدر راہ دی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں مگر ادیب و صحافی بڑی سنجیدگی سے ان خرابیوں سے نپٹنے کی کوشش میں منہمک رہے۔ ہم اس کا عکس آزادی کے آس

پاس کی ادبی تحریروں میں دیکھ سکتے ہیں۔

آزادی کے بعد ہم آزاد اور خود مختار کہے جا رہے ہیں لیکن شاید حقیقت بہت حد تک اس کے برعکس ہے۔ وجہ یہ ہے کہ زندگی کی مختلف النوع دشواریوں نے ہمیں کچھ اس قدر جکڑ رکھا ہے جن سے آج کے لوگوں کو کل کی غلامی کی زندگی سے کہیں زیادہ گھٹن کا احساس ہونے لگا ہے۔ بہت سی ادبی وصحافتی تحریریں اس بات کی غماز ہیں کہ ہمارے سماج میں مساوات اور انصاف کا فقدان تشویش کا باعث ہے۔ آج کے اکثر ادیب، شاعر اور صحافی کی خاص نظر ان خرابیوں پر مرکوز رہتی ہے۔ شاید اسی لیے آج کے اکثر ظریف شاعر اور ادیب انصاف اور صداقت کو ٹھیس پہنچانے والی طاقتوں کی خبر لینے پر مجبور ہیں۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اکیسویں صدی کا زمانہ بڑی تیزی سے بدل رہا ہے اور نئی نسلوں کی زندگی کے ہر شعبے پر بڑی گہری نظر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے حالات کو دیکھتے ہوئے عوام بڑی خاموشی سے اب ایسے رہنمایان ملک وملت کی تلاش کے قائل ہیں جو ذات پات اور مذہب کی سیاست سے اوپر اٹھ کر نئی ترقی کی راہیں ہموار کرنے میں کوشاں ہیں۔

☆☆☆

حواشی

(۱) اردو ادب میں طنز ومزاح، وزیر آغا، ص ۷ ۳

(۲) ایضاً، ص ۴۷ ۳

(۳) اردوئے معلیٰ، علی گڑھ، جنوری ۱۹۳۱ء

(۴) اپنچ، ۳۰ر دسمبر ۱۸۹۸ء، ص ۵-۶

☆☆☆

Dr. Syed Ulfat Husain
Guest Faculty Dept. of Urdu,
G.D. College, Begusarai (Bihar)
Mob. 6201788749
E-mail: hussain5ulfat@gmail.com

ترقی پسند ناولوں کے سماجی سروکار

محمد جاوید

ترقی پسند تحریک اردو کی بے حد فعال اور ہمہ جہت تحریک رہی ہے۔ اس تحریک نے اردو ادب پر اپنے دیرپا اثرات مرتب کیے۔ اس کے زیر اثر فکر ونظر کے ساتھ ساتھ فن اور تکنیک کے اعتبار سے بھی اردو ادب کی مختلف اصناف متاثر ہوئیں۔ ناول، افسانہ، غزل، نظم اور تنقید جیسی شعری ونثری اصناف خارجی وداخلی دونوں سطحوں پر بہت سی تبدیلیوں سے دوچار ہوئیں۔ عالمی منظر نامے پر رونما ہونے والے نئے نئے حالات ومسائل نے دنیا بھر کی ادبیات کو اپنے دائرۂ اثر میں لیا۔ ہندوستان کے مختلف زبان وادب کے قلم کاروں نے بھی اس انقلابی صورت حال کو خوش آمدید کہا۔ اردو ادب کے فن کاروں اور دانشوروں نے بھی ترقی پسند تحریک کے اصول ونظریات اور اس کے مقاصد کا خیر مقدم کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند تحریک کے قیام یعنی ۱۹۳۶ء کے بعد تخلیق پانے والے ادب پاروں میں اس تحریک کا گہرا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ اردو ناولوں پر بھی 'ادب برائے زندگی' کا گہرا عکس نظر آتا ہے۔

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو میں سماجی وسیاسی حقیقت نگاری کی ایک نئی روایت شروع ہوتی ہے۔ ترقی پسند تحریک کی روشنی میں انسانی زندگی کے ٹھوس حقائق اور بنیادی مسائل ہی فن پاروں میں جگہ پا سکے۔ اس تحریک کی نظر میں خواب وخیال اور تصوراتی دنیا کی کوئی اہمیت باقی نہ رہی۔ اس نئی روایت کے مطابق انسانی زندگی کے خارجی مسائل کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ ناول کا فن انسانی زندگی کے حقائق کو تنوع اور وسعت کے ساتھ پیش کرنے کا نام ہے۔ ترقی پسندوں نے صنف ناول کو اپنے اصول وعقائد کی تشہیر وترجمانی کے لیے استعمال کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند تحریک کے قیام کے بعد منظر عام پر آنے والے ناولوں میں اس عہد کی زندگی کے تلخ تجربات ومشاہدات آشکار ہیں۔ ترقی پسند فکشن نگاروں نے ڈپٹی نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، مرزا رسوا، علامہ راشد الخیری اور عبدالحلیم شرر کی تخلیقی روایات سے قطع نظر اردو

ناول نگاری کو فکر ونظر کی نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔

اس تحریک کے زیر اثر ترقی پسند اردو ناولوں میں سماجی، سیاسی، اقتصادی، معاشی اور تاریخی حالات ومسائل فکری بصیرت اور سیاسی ادراک کے ساتھ بیان کیے گئے۔ ناول نگاروں نے خواب وخیال، تصور پرستی، مثالیت پسندی، رومانویت اور جذباتیت کے رویے کو ترک کر کے راست گوئی اور عقل پسندی کا راستہ اختیار کیا۔ اس تحریک کے اغراض ومقاصد کا مطالعہ ہمیں باور کراتا ہے کہ ترقی پسندوں کے نزدیک سماجی حقیقت نگاری اوّلین شرط تھی۔ ترقی پسند ادیبوں نے اشتراکی فکر وفلسفے کے تحت ادب کو عوام کی خدمت کا ذریعہ بنایا۔ یہی سبب ہے کہ ترقی پسند ناول 'ادب برائے زندگی' کے فارمولے سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ معروف ترقی پسند نقاد ڈاکٹر قمر رئیس نے ان نکات پر روشنی ڈالتے ہوئے نہایت معروضی انداز میں لکھا ہے:

> ''مارکسزم اور جدید سائنسی اور سماجی علوم کی روشنی نے ترقی پسند ادیبوں کے ذہن کو اس تصور پرستی، یاس انگیزی، رومانیت اور اصلاحی جوش سے بڑی حد تک دور رکھا جو اس صدی کی ابتدائی دہائیوں میں اردو افسانوی ادب کی خصوصیات تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا ہی سے بظاہر زندگی کے بارے میں ان کا رویہ زیادہ بے باک، راست اور حقیقت پسندانہ تھا۔''(۱)

ترقی پسند ناول نگاروں نے سماج ومعاشرے کے فرسودہ رسم ورواج، غیر انسانی روایات، غربت و مفلسی، ظلم واستحصال، مذہبی جبر وتشدد، جنسی انتشار اور تہذیبی انحطاط وغیرہ کا بے باکانہ تخلیقی اظہار کیا۔ ترقی پسند موضوعات کو ناول کا روپ دینے والے فکشن نگاروں میں سجاد ظہیر، عصمت چغتائی، عزیز احمد اور کرشن چندر وغیرہ کو خاص مقام حاصل ہے۔ واضح رہے کہ اس تحریک کے باضابطہ قیام سے قبل پریم چند نے اس کے لیے زمین ہموار کر دی تھی۔ اس تحریک کے آغاز سے پہلے ہی ان کے تمام ناول منظر عام پر آ گئے تھے۔ 'گئودان'، 'میدانِ عمل'، 'گوشۂ عافیت'، 'بازارِ حسن'، 'نرملا'، 'اسرارِ معابد'، 'ہم خرما ہم ثواب' اور 'جلوۂ ایثار' جیسے ناولوں میں اس تحریک کے موضوعات ومسائل کی خوبصورت عکاسی ملتی ہے۔ انھوں نے ان تمام سماجی و سیاسی، اقتصادی ومعاشی اور تہذیبی و مذہبی ناہمواریوں پر بھرپور تنقید کی۔ ان کے یہاں فکری آزادی اور انسان دوستی کی قابل ذکر عکاسی موجود ہے۔ ان کا آخری ناول 'گئودان' ترقی پسند تحریک کے افکار ونظریات اور اغراض و مقاصد کا ٹھوس جواز فراہم کرتا ہے۔ سجاد ظہیر، عصمت چغتائی، عزیز احمد اور کرشن چندر جیسے ترقی پسند فکشن نگاروں نے بھی پریم چند کی روایات کو استحکام بخشا۔

مذکورہ بالا قلم کاروں نے ترقی پسند موضوعات ومسائل کے علاوہ جدید فنی وتکنیکی لوازمات کو بھی اپنے

فن پاروں میں خصوصیت کے ساتھ جگہ دی۔ ترقی پسند ادیبوں نے ہی پہلی بار اردو میں شعور کی رو (Stream of Consciousness) جیسی تکنیک کا استعمال کیا۔ سجاد ظہیر نے اپنے مشہور زمانہ ناول 'لندن کی ایک رات' میں شعور کی رو کو نہایت کامیابی اور خوبصورتی کے ساتھ برتا ہے۔ انھوں نے اس ناول کے ذریعہ عصری تقاضوں اور جدید مسائل کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ انھوں نے عالمی سطح پر پیش آنے والی متعدد تبدیلیوں کے پیش نظر اپنی داخلی کیفیات اور ذہنی کرب واضطراب کا اظہار نئے انداز فکر کے ساتھ کیا ہے۔ پیش نظر ناول لندن میں زیر تعلیم ہندوستانی نوجوان طلبا کے ذہنی انتشار، داخلی کرب و اضطراب، نظریاتی کشمکش نیز ان کے سماجی و سیاسی شعور کو اچھوتے انداز میں سامنے لاتا ہے۔ سجاد ظہیر نے مختلف کرداروں کے توسط سے اس عہد کی سماجی، سیاسی، اخلاقی، جنسی، مذہبی اور اقتصادی شکست وریخت کو مرکزیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انھوں نے ماضی کے تجربات ومشاہدات کو عصری زندگی سے ہم آہنگ کرنے کی عمدہ کوشش کی ہے۔ سجاد ظہیر کا ناول 'لندن کی ایک رات' اپنی فکری وفنی ترجیحات کے اعتبار سے اردو میں ایک نیا تخلیقی تجربہ تھا۔ بعد ازاں دوسرے فن کاروں نے بھی اس مخصوص طرز تحریر کی پیروی کی اور اردو ناول نگاری کو فکر وفن کی نئی بلندیوں سے ہم کنار کیا۔ ترقی پسند اردو ناول کی فہرست میں اسے خاص انفرادیت حاصل ہے۔ بقول یوسف سرمست:

> ''لندن کی ایک رات اردو ناول نگاری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ مواد اور ہیئت دونوں اعتبار سے یہ اس دور کی ناول نگاری کے سارے اہم رجحانات کو پیش کرتا ہے۔ اردو میں نہ صرف جدید ناول نگاری کی ابتدا اس ناول سے ہوتی ہے بلکہ اس ناول سے اردو ناول نگاری 'شعور کی رو' کی تکنیک سے سب سے پہلے متعارف ہوتی ہے۔''(۲)

سجاد ظہیر کے ناول 'لندن کی ایک رات' کے علاوہ عصمت چغتائی کا 'ٹیڑھی لکیر'، عزیز احمد کا 'آگ' اور کرشن چندر کا 'شکست' وغیرہ بھی ہماری خصوصی توجہ کا مرکز ہیں۔ ان ناولوں میں حقیقت نگاری کا ایک نیا روپ اور سماجی سروکار کا ایک نیا تصور ملتا ہے۔ مذکورہ بالا قلم کاروں کے یہاں جدید نفسیاتی طرز تحریر کی انفرادیت موجود ہے۔ ان ناولوں میں جنسی کرب واضطراب اور اخلاقی انتشار کی عمدہ مثالیں نظر آتی ہیں۔ یہ تخلیقی رویہ انھیں اپنے پیش رو فن کاروں سے ممتاز ومنفرد بناتا ہے۔ اس طور پر کہا جا سکتا ہے کہ روایت شکنی اس تحریک کے خمیر میں شامل تھی۔ عزیز احمد ترقی پسند ناول نگاروں میں انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔ 'آگ'، 'ایسی بلندی ایسی پستی'، 'گریز'، 'مرمر اور خون'، 'جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں'، 'شبنم' اور 'ہوس' ان کے اہم

ناول ہیں۔ مذکورہ ناولوں پر ترقی پسند موضوعات ومسائل کے گہرے اثرات محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ عزیز احمد جنسی ونفسیاتی مسائل کی عکاسی میں بعض اوقات سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی سے بھی دو قدم آگے نکل گئے ہیں۔ اردو ادب کے اہم نقادوں نے اس جانب اشارہ کیا ہے۔ لیکن اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ انہوں نے دوسرے ترقی پسند مسائل کو یکسر نظر انداز نہیں کیا۔ ان کے ناولوں میں سرمایہ دارانہ نظام کے جبر وتشدد، طبقاتی ظلم واستحصال، بھوک ومفلسی، لاچاری وبے بسی، اخلاقی وتہذیبی زوال اور فرسودہ روایات جیسے غیر انسانی افعال وحرکات کی ایک جیتی جاگتی دنیا آباد ہے۔ ان کے ناول 'آگ' اور 'ایسی بلندی ایسی پستی' میں کشمیر اور حیدرآباد کی شکستہ حال زندگی اور زوال پذیر انسانی واخلاقی قدروں کے نقوش نظر آتے ہیں۔ 'شبنم' عزیز احمد کا آخری ناول ہے، جس میں انہوں نے یونیورسٹی کے پروفیسروں کی اخلاقی کمزوریوں کو بے نقاب کیا ہے۔ یہ ناول اپنے موضوع اور انداز پیش کش کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ 'آگ' اور 'ایسی بلندی ایسی پستی' کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان دونوں ناولوں کے موضوعات ومسائل براہ راست ترقی پسندی سے تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں ناول جاگیر دارانہ نظام میں غریبوں اور مزدوروں کی بدحال زندگی اور پسماندہ طبقات پر ڈھائے جانے والے مظالم کو نہایت جذباتیت کے ساتھ بے نقاب کرتے ہیں۔ پیش نظر دونوں ناولوں کے عنوانات بھی اس جانب واضح اشارہ کرتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں مارکس اور لینن سے زیادہ فرائڈ کا نظریہ حاوی ہے۔ ناول 'آگ' ان کے سیاسی اور اقتصادی موقف کو قطعیت کے ساتھ نمایاں کرتا ہے۔ یہ ناول جاگیر دارانہ نظام کے سبب پیدا ہونے والی تباہی وبربادی کو نہایت شدت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

''واقعتاً کشمیر میں آگ کے سوا ہے کیا..... مگر کیا یہ آگ اس کو اور اس مہاجنی نظام، جاگیرداری نظام کو نہ جلائے گی۔ ہر طرف آگ ہی آگ۔ بھوک کی آگ، چنار کی آگ، لالے کی آگ، بیماریوں کی آگ۔''(۳)

ترقی پسند ناولوں کا مطالعہ ہمیں باور کراتا ہے کہ اس تحریک سے وابستہ ادیبوں اور تخلیق کاروں نے سماج کو گلے سڑے رسم ورواج اور فرسودہ روایات سے نجات دلانے کی دانستہ کاوشیں کی ہیں۔ ترقی پسند ناول نگاروں نے مغربی مفکروں اور دانشوروں مثلاً مارکس، لینن اور فرائڈ وغیرہ کے نظریات وعقائد سے خاطر خواہ استفادہ کیا۔ ترقی پسند قلم کاروں نے طبقاتی کشمکش، سماجی ناانصافی وغیر برابری، تہذیبی شکست وریخت اور سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت کے ساتھ ساتھ جنسی اور نفسیاتی موضوعات ومسائل کو بھی بے باکی کے ساتھ پیش کیا۔ جنسی مسائل کی راست بیانی کے سلسلے میں ترقی پسندوں پر فحاشیت کے الزامات بھی عائد

ہوئے۔ لیکن اس تحریک کے حامیوں نے جنسی ونفسیاتی موضوعات کو کبھی قابل اعتراض نہیں سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسندوں نے جنسی مسئلے کو انسانی زندگی کا اٹوٹ حصہ سمجھتے ہوئے ان کے بعض پیچیدہ مسائل کو سلجھانے کی بھی کوششیں کیں۔ اس تحریک سے وابستہ بعض ادیبوں نے محبت وجنسی مسائل کا ترقی پسندانہ نظریہ بھی پیش کیا جسے لوگوں نے ناقابل اعتنا سمجھا۔ معروف ترقی پسند فکشن نگار کرشن چندر نے محبت اور جنسی مسائل کے متعلق صاف لفظوں میں کہا ہے:

''ترقی پسند ادیبوں نے موجودہ دور میں محبت کی صحیح حقیقت کو اجاگر کیا ہے۔ وہ شمع و پروانہ کی بے معنی حکایتوں میں الجھ کر نہیں رہ گئے بلکہ انہوں نے ہمیشہ یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اس طرح موجودہ سماج کی بہیمیت وشقاوت، محبت کی شمع کو گل کر دیتی ہے۔''(۴)

عصمت چغتائی کے ناول 'ٹیڑھی لکیر' اور عزیز احمد کے 'گریز' میں جنسی انتشار اور نفسیاتی کشمکش کی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ عصمت چغتائی نے ناول 'ٹیڑھی لکیر' میں ہم جنسیت جیسی سماجی لعنت سے نقاب اٹھایا ہے۔ انہوں نے سماجی ونفسیاتی بے راہ روی کو نمایاں طور پر پیش کیا ہے۔ عصمت چغتائی نے 'ٹیڑھی لکیر' کے ذریعہ سماج ومعاشرے کی بے جا پابندیوں، فرسودہ رسم ورواج، مذہبی انتشار، تہذیبی بدعنوانی اور طبقاتی کشمکش پر سخت تنقید کی ہے۔ انھیں فرائڈ کے نظریۂ عشق سے ذہنی مناسبت ہے۔ موصوفہ کے یہاں عشق میں رونا دھونا اور آنسو بہانا فضول ہے۔ انہوں نے 'ٹیڑھی لکیر' کے اہم خواتین کردار شمن، بلقیس، استانی مس چرن، نجمہ اور رسول فاطمہ وغیرہ کے ذریعہ ہم جنسیت (Lesbianism) کے بھیانک روپ کو آئینہ دکھایا ہے۔ بلقیس اور شمن کے تعلقات ملاحظہ ہوں:

''بلقیس اور شمن کی دوستی ایسی بڑھی کہ دن رات ساتھ رہتیں، ساتھ اٹھتی بیٹھتیں اور ساتھ ہی پڑھتیں۔ بلقیس اسے بہت پسند تھی۔ سعادت سے بھی زیادہ۔ پتہ نہیں نجمہ سے کم یا زیادہ! نجمہ اور چیز تھی۔ دہکتی ہوئی شراب اور بلقیس صاف نتھرا ہوا میٹھا پانی۔''(۵)

ترقی پسند نظریات سے ذہنی مناسبت رکھنے والے معروف فکشن نگار کرشن چندر کی ذہنی تشکیل وتعمیر میں اشتراکی فکر وفلسفہ کا اہم کردار رہا ہے۔ وہ تاعمر اسی نظریے سے وابستہ رہے۔ اپنی تخلیقی زندگی کے آغاز میں انہوں نے کشمیر کی حسین وادیوں، آبشاروں، پہاڑوں، جھیلوں اور خوبصورت پیڑ پودوں کی منظر کشی کی۔ ان کی نثر نہایت دلکش اور پرکشش ہے۔ یہ سچ ہے کہ ان کی نظر قدرتی مناظر کے حسن وخوبصورتی پر رہتی ہے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو یکسر نظر انداز کیا ہے۔ کرشن چندر کے یہاں غریبوں، مزدوروں اور مظلوم طبقات کے دکھ درد، مشکلات ومصائب اور بے بسی

ومجبوری وغیرہ کا بھی قریب سے مشاہدہ ملتا ہے۔ان کی تخلیقات میں رومان وحقیقت کا انوکھا امتزاج موجود ہے۔کرشن چندر نے متعدد اہم ناول تخلیق کیے ہیں۔'شکست'،'جب کھیت جاگے'،'غدار'،'طوفان کی کلیاں'، 'دل کی وادیاں سوگئیں'،'ایک گدھے کی سرگزشت'،'ایک عورت ہزار دیوانے'،'لندن کے سات رنگ'،'باون پتے'اور'گدھے کی واپسی' وغیرہ ان کے مشہور ومعروف ناول ہیں۔کرشن چندر نے زندگی کے تغیر پذیر حقائق کو اپنے ناولوں کی فکری اساس بنایا ہے۔ان کی تخلیقات میں سیاسی،سماجی اور اقتصادی حقیقت نگاری کی رنگارنگی اور وسعت نظر آتی ہے۔اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ وہ رومانیت سے حقیقت نگاری کی طرف مائل ہوئے۔رومانی اور تصوراتی دنیا میں پرواز کرتے ہوئے ان کا ایک قدم ہمیشہ زمین پر ہوتا ہے۔ انھیں محبوب کی اداؤں کی خوشبو اور مزدور کا پسینہ دونوں عزیز ہے۔اشتراکی افکار ونظریات سے گہری وابستگی اس دعوے کو دلیل فراہم کرتی ہے۔اس طرح رومان اور حقیقت کا حسین امتزاج ہی کرشن چندر کی امتیازی شناخت قرار پاتی ہے۔ان کا اوّلین ناول'شکست' اس کی عمدہ مثال ہے۔انہوں نے اس ناول کے مرکزی کرداروں کے توسط سے سماجی اور اقتصادی نابرابری اور فرسودہ روایات پر کڑی چوٹ کی ہے۔بقول ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی:

''کرشن چندر اس ناول میں بھی رومانیت ہی کے راستے آئے ہیں۔اس کا ہیرو شیام سرتاپا شاعرانہ مزاج رکھتا ہے اور اس کی زندگی کا سب سے اہم مسئلہ موجودہ معاشی اور طبقاتی نظام میں محبت کی ناکامی کا مسئلہ ہے لیکن اس ناول کے بین السطور میں کرشن چندر نے معاشی کشمکش،فرسودہ رسوم وعقائد اور ذات پات کے بندھنوں کی بڑی اچھی عکاسی کی ہے۔''(۶)

اردو کے بیشتر ناقدین اور محققین اس امر سے اتفاق رائے رکھتے ہیں کہ اردو ناول نگاری کی ابتدا ڈپٹی نذیر احمد کی تخلیقات سے ہوتی ہے۔واضح رہے کہ پریم چند سے قبل اردو ناول کی دنیا مخصوص طرح کے موضوعات ومسائل تک محدود تھی۔اس عہد کے ناول نگاروں کے یہاں تبلیغی اور اصلاحی رنگ حاوی ہے۔پریم چند وہ پہلے تخلیق کار ہیں،جنہوں نے اردو ناول نگاری کو گاؤں کی زندگی اور اس کے حقیقی مسائل سے روشناس کرایا۔بلکہ یہ کہا جائے تو مناسب ہوگا کہ پریم چند نے پہلے پہل اردو ناول کو گاؤں کے کھیت کھلیانوں کی سیر کرائی۔ان کی کاوشوں سے ہی اردو ناولوں وافسانوں میں کسانوں اور مزدور طبقے کی زندگی کی تلخی اور کڑواہٹ کی ترجمانی شروع ہوئی۔ترقی پسند فکشن نگار کرشن چندر نے بھی اپنے چند ناولوں میں ان مسائل کو نمایاں انداز میں پیش کیا۔ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں تقسیم ہند کا المیہ غیر معمولی حیثیت کا حامل

ہے۔اس المناک حادثے کے بعد سرحد کی دونوں جانب فرقہ وارانہ فسادات،بھوک ومفلسی،جبر وتشدد،ظلم و زیادتی،دکھ درد اور لاچاری و بے بسی کا ایک ناقابل برداشت منظر پیش آیا۔ایسے دردناک و بھیانک واقعات کو دیکھ کر فن کاروں کی روح کانپ اٹھی۔اردو ادیبوں اور قلم کاروں نے ان قابل رحم حالات وواقعات کے خلاف اپنی آوازیں بلند کیں۔اردو فکشن نگاروں نے بھی اس عبرت ناک عہد میں پیش آئے غیر انسانی مسائل کے خلاف اپنا تخلیقی ردعمل پیش کیا۔تقسیم ہند کی خوفناک صورت حال کو موضوع بحث بنانے والے قلم کاروں میں خدیجہ مستور،عبداللہ حسین،کرشن چندر،عبدالصمد، جوگندر پال،قرۃ العین حیدر، انتظار حسین،حیات اللہ انصاری،ظفر پیامی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ان میں سے بیشتر فکشن نگار تقسیم ہند کی چیرہ دستیوں اور جبر وتشدد سے براہ راست متاثر بھی ہوئے۔واضح رہے کہ تقسیم ہند کے مسائل مثلاً فرقہ وارانہ قتل وفسادات،طبقاتی نفرت وتعصب،مذہبی خوں ریزی،جنسی ظلم واستحصال،جسم فروشی اور بھوک و مفلسی جیسے مسائل ترقی پسند تحریک کے دائرۂ فکر میں شامل رہے۔ترقی پسند ناول نگاروں نے تقسیم ہند کے نتیجے میں پیدا شدہ حالات ومسائل کو بھی پورے شدومد کے ساتھ پیش کیا۔

تاریخ شاہد ہے کہ ترقی پسند تحریک نے دنیا بھر کی ادبیات پر اپنے دوررس اثرات مرتب کیے۔ بلاشبہ اس تحریک نے انسانی زندگی اور انسانی معاشرے کے ہر پہلو کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔اس تحریک سے وابستہ فن کاروں نے عوام کی خدمت کی غرض سے فن پارے تخلیق کیے۔ان کا تخلیقی موقف'ادب برائے زندگی' سے وابستہ تھا۔ترقی پسندوں کے نزدیک سماجی موضوعات ومسائل فن اور اسلوب سے کہیں زیادہ اہم تھے۔یہی وجہ ہے کہ اس تحریک سے وابستہ ناول نگاروں نے سماجی،سیاسی،اقتصادی،تہذیبی اور مذہبی موضوعات ومسائل کو کلیدی ومرکزی اہمیت دی۔ترقی پسند تحریک کے مقاصد کی تفہیم کے لیے پریم چند کی رائے بے حد اہم ہے:

''ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو،آزادی کا جذبہ ہو،حسن کا جوہر ہو،تعمیر کی روح ہو،زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت،ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے،سلائے نہیں کیوں کہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہے۔''(۷)

پریم چند کے مذکورہ بالا خیالات کا اطلاق اردو ناول پر بھی ہوتا ہے۔ان مباحث کی روشنی میں یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ترقی پسند فکشن نگاروں نے انسانی زندگی کے بنیادی مسائل مثلاً انسان دوستی،بھوک، مفلسی،سماجی انصاف پسندی،سماجی حقیقت نگاری،توہم پرستی اور فرسودہ رسم ورواج جیسے موضوعات ومسائل کو نہایت انہماک کے ساتھ پیش کیا۔اشتراکیت پسند قلم کاروں نے سماجی انصاف پسندی اور انسانی حقوق

کی راہ میں حائل ہونے والی ہر طرح کی رکاوٹوں کو دور کرنے کی عملی کوشش کی۔ پریم چند، سجاد ظہیر، کرشن چندر، بیدی، عصمت چغتائی اور عزیز احمد وغیرہ نے اردو ناول کو افکار و نظریات کی نئی نئی جہتوں سے ہم آہنگ کرنے کی ہر ممکن سعی کی۔ مختصر یہ کہ اردو ناول نگاری کی روایت کو استحکام بخشنے میں ترقی پسند تحریک کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

☆☆☆

حواشی:

(۱) تنقیدی تناظر، ڈاکٹر قمر رئیس، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۷۸ء، ص ۱۶۶-۱۶۷
(۲) بیسویں صدی میں اردو ناول، یوسف سرمست، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی ۱۹۹۵ء، ص ۳۲۳
(۳) گریز، عزیز احمد، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی ۱۹۸۲ء، ص ۱۲۴
(۴) نئے زاویے، کرشن چندر، میری لائبریری، لاہور، ص ۱۵
(۵) ٹیڑھی لکیر، عصمت چغتائی، کتابی دنیا، دہلی ۲۰۰۶ء، ص ۹۵
(۶) اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، خلیل الرحمٰن اعظمی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۲۰۰۷ء، ص ۲۰۹
(۷) بحوالہ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، خلیل الرحمٰن اعظمی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۲۰۰۷ء، ص ۴۵

☆☆☆

Md. Javed
Dept. of Urdu, BHU,
Varanasi, U. P, Pin- 221005
Mobile: 8953944717

فاخری کے افسانوں میں معاشرتی اقدار کا زوال

محمد سیف الاسلام

نثری اصناف میں مقبول صنف 'افسانہ' ہے۔ اس کی مقبولیت دراصل زمینی حقائق سے جڑا ہوا ہونا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک اچھے افسانے کو قارئین ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں یا چند اقتباسات پڑھنے کے بعد تکمیل کے مرحلے تک ہر حال میں پہنچانا چاہتے ہیں۔ افسانہ بہت کچھ بیان کرنے اور سب کچھ سمیٹنے کی صلاحیت چند صفحات میں رکھتا ہے۔ افسانوں میں ساری توجہ صرف مخصوص نقطۂ نظر پر مرکوز ہوتی ہے۔

فکشن میں سماجی مسائل اور اس کے تدارک پہ ابتدا سے ہی غور و فکر کیا گیا ہے۔ شائستہ فاخری عہد حاضر کی ایک مشہور افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے معاشرتی مسائل پر خاص توجہ دی۔ ان کے یہاں کوئی نئے موضوعات نہیں ہیں لیکن انداز بیان، ایما و اشارہ، استعارہ و کنایہ ان کی انفرادیت اور پہچان ہے۔

شائستہ فاخری کے بیشتر افسانوں کے موضوعات مسلم گھرانوں سے لیے گئے ہیں۔ وہ خانقاہی خانوادے سے تھیں اور جب خانقاہ دائرہ اجمل شاہ میں سال میں دو مرتبہ لوگوں کا ہجوم ہوتا تو عورتیں اور بچے شہر اور گاؤں سے خانقاہ آتیں تو وہ عورتوں کے درمیاں جا کر ان کے حالات کو دیکھتیں، سنتیں اور ان کے درمیان وقت گزارتی تھیں۔ مسلم گھرانوں کے حالات و واقعات اور مسائل کا ان کو علم ہوتا اور پھر انھیں حالات و واقعات کی بنا پر مسلم گھرانوں کے اندر پائی جانے والی برائیوں کو موضوع بحث بناتے ہوئے 'اداس لمحوں کی خودکلامی'، 'کنور فتح علی' اور 'گلی کا دوسرا کنارہ' جیسے بہت سارے افسانے لکھے۔

افسانہ 'اداس لمحوں کی خودکلامی' جو 'شعر و حکمت' میں 'پنک پینتھر' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ درحقیقت اس کے موضوع پر غور کریں تو آپ کو عصمت کا افسانہ 'لحاف' یاد آ جائے گا۔ وہی موضوع، وہی اشارہ و کنایہ، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ کرداروں کی تبدیلی کے ساتھ کہانی کو آگے بڑھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہاں بیگم جان اور ربو تھیں یہاں زینی اور روبینہ علی ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے دونوں افسانہ

ایک ہی ہے۔لیکن 'اداس لمحوں کی خود کلامی' کہانی در کہانی ہے، اور اس کہانی در کہانی کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ عصمت نے جہاں اپنا افسانہ 'لحاف' ختم کیا تھا شائستہ فاخری نے وہیں سے شروع کیا ہے اور کہانی کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔

'اداس لمحوں کی خود کلامی' میں ایک ایسی لڑکی کی کہانی پیش کی گئی ہے جس نے بچپن میں اپنی 'خالہ' ریا اور ان کی سہیلی ایمن کو کئی بار ایک کمرہ میں بند ہوتے دیکھا تھا۔زینی کے معصوم ذہن میں یہ سوال بار بار آتا کہ وہ ریا خالہ جو مجھے بے پناہ پیار کرتی ہیں ڈھیر ساری چاکلیٹس لاکر دیتی ہیں، وہ ایمن کے آتے ہی کیوں بدل جاتی ہیں؟ کیوں مجھے چھوڑ کر چلی جاتی ہیں؟اس سوال نے اسے پریشان کر دیا۔بالآخر ایک بار اس نے اس کمرے میں جانے کا فیصلہ کیا اور گیٹ کھولا تو اس نے دیکھا۔خالہ آہستہ آہستہ کچھ بُد بُدا رہی تھیں۔زینی نے اپنا کان خالہ کے ہونٹوں کے قریب کرلیا۔خالہ نے سمجھا ایمن آنٹی جھکی ہوئی ہیں۔وہ کہہ رہی تھیں ایمن دروازہ مت کھولنا، زینی ہوگی، زینی کو اندر آنے مت دینا۔اسے یہاں سے بھگا دو۔ اسے کہو یہاں سے چلی جائے۔

اس کمرے کا منظر دیکھ کر اس بات کا اندازہ ہو چکا تھا کہ یہاں کیا ہو رہا تھا اور وہ واقعہ زینی کے خالی ذہن پر نقش ہو گیا۔زینی بڑی ہو گئی، ہاسٹل کا رخ کیا، وہاں اس نے 'ریا' اور 'ایمن' کو ڈھونڈھا، لیکن سہارا پینتھر کا لینا پڑا۔دھیرے دھیرے اس کے ساتھ رہنے والی روبینہ علی پینتھر کی کیفیت سے واقف ہو گئی۔ دونوں پینتھر کے ذریعہ قریب آئے اور پھر دونوں کے درمیان سے پینتھر غائب رہنے لگا۔دھیرے دھیرے ہاسٹل کے ہر روم میں پینتھر ملنے لگا۔

انسانی خاصیت ہے کہ بری چیزوں کو بہت جلدی قبول کرلیتا ہے اور اچھی چیزوں کو قبول کرتے کرتے برسوں ہو جاتا ہے۔روبینہ علی جس ماحول کی پروردہ تھیں وہ پورا کا پورا ماحول ارکان اسلام کا پابند تھا، جہاں کھڑکیاں قبرستان کی طرف کھلتی تھیں تاکہ موت اور آخرت کا خوف دل میں ہمیشہ رہے۔لیکن زینی کی عادت نے پورا ماحول ہی بدل دیا۔ہاسٹل کا کوئی ایسا کمرہ نہ تھا جہاں پینتھر نہ ہو۔موضوعاتی اعتبار سے افسانہ بہت ہی معنویت رکھتا ہے۔دور حاضر کی حقیقت کا عکس بھی نظر آتا ہے۔آئے دن ایسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔

فاخری نے جنسی موضوع پر افسانہ لکھا ہے، لیکن ادبی دنیا میں کہیں بھی چوں چرا نہ ہوئی۔عصمت نے لکھا تھا تو عدالت کا دروازہ بھی دیکھنا پڑا تھا۔وقت بدلا، حالات بدلے، معاشرے میں تبدیلی رونما ہوئی۔لوگوں کے فہم و ادراک میں تنوع پیدا ہوا کہ ادیب حقیقت کی طرف ہی اشارہ کرتے ہیں۔اسی

معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں جہاں وہ جو چیز محسوس کرتے ہیں۔

جنسی بے راہ روی معاشرے کو کھوکھلا کرنے والا ایک ناسور ہے۔جب قدم ڈگمگاتا ہے تو پھر زینی اور روبینہ علی کے درمیاں سے پینتھر غائب ہو جاتا ہے، اور جب دولت کے نشے میں ڈوبتا ہے تو غربت کی اجڑی اور چھوٹی کوٹھری کی طرف ننگی نگاہ اٹھتی ہے اور پھر غربت اس پیاسی نگاہ کو ہمدرد نگاہ سمجھ کر قبول کرلیتی ہے۔ افسانہ 'گلی کا دوسرا کنارہ' اسی کا غماز ہے۔اس افسانے میں انھوں نے ایک ایسی لڑکی کی داستان کو پیش کیا ہے جس کے سر سے باپ کا سایۂ شفقت اٹھ جاتا ہے اور ساتھ ہے تو صرف اور صرف ایک لاچار اور بے بس ماں کا سہارا۔لڑکی بچپن سمجھ کر خود کو آزاد محسوس کرتی ہے۔اسے اس عمر میں اس بات کا کہاں احساس تھا کہ اسے بھی اب لوگ ننگی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔وہ تو بس یہاں وہاں کھیلتی رہتی لیکن اس کی ماں تو معاشرے کی اس نگاہ کو خوب جانتی تھی اسی لیے اس بات کا اسے احساس دلانا ضروری تھا اور پھر ماں نے ایک شام اسے اس بات کا احساس ان لفظوں میں دلایا:

> ''کیسے اونٹنی کی طرح چلتی رہتی ہے، لٹیں بکھرائے، سینے اُچھالتی بھاگا کرتی ہے۔کرم جلی جانتی نہیں جو گھر مردوں سے خالی ہوتا ہے وہ گھر نہیں دوسرے مردوں کی سرائے بن جاتا ہے۔تیرا کوئی بھائی نہیں، باپ مر گیا ہے، تو سر اور سینے ڈھانپ کر چلا کر۔''

ہندوستانی مٹی تہذیب و ثقافت کا سنگم ہے۔یہاں کی لڑکیاں حیادار اور فرمانبردار ہیں، خصوصاً شادی بیاہ کے معاملے میں وہ والدین کے فیصلے کو آخری فیصلہ سمجھ کر تسلیم کرتی ہیں اور خوشی خوشی ان کے کیے ہوئے فیصلے پر اس لڑکے کے ساتھ پوری زندگی گزار دیتی ہیں جن سے بالکل ناواقف اور انجان ہوتی ہیں اور حرف شکایت بھی نہیں لاتیں۔

عموماً لڑکیاں جب حد بلوغت کو پہنچتی ہیں تو والدین فکر مند ہو جاتے ہیں اور ایک خوبصورت اور اچھے رشتے کی تلاش و جستجو میں رہتے ہیں۔لڑکیاں بھی تصورات کے محل تیار کرتی ہیں اور اپنے شہزادے کو تصور کی خوبصورت نگاہوں سے دیکھتی ہیں، لیکن صرف ماں کا سہارا ہو تو اس ماں کی بے چینی کیسی ہوگی، اس کا اندازہ مشکل ہے۔فاخری کے اس افسانے کو پڑھنے کے بعد اسی کرب اور تکلیف کا احساس ہوتا ہے۔ایک امیر شہری کی کار میں اپنی بیٹی کو الوداع کر دیتی ہے لیکن جب اس کے کانوں میں ایک آواز ٹکرائی تو احساس ہوا شاید ماں کا فیصلہ غلط تھا۔

> ''میں یہاں زمین خریدنے آیا تھا اور خرید کر لے بھی جا رہا ہوں۔اب اپنی مرضی سے جیسے چاہوں گا، جب چاہوں گا اور جس طرح چاہوں گا جوتوں گا۔''

افسانہ ’گلی کا دوسرا کنارہ‘ موضوعاتی اعتبار سے دلچسپ ہے۔ فلیش بیک کی تکنیک کے ساتھ موضوع کو خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے اور معاشرہ کا ترجمان بھی ہے۔ ایسے معاشرہ کا ترجمان جہاں اگر گھر مردوں سے خالی ہو تو جنسی بھوکی نگاہیں وہیں مرکوز ہو جاتی ہیں اور مجبوری تلاش کر کے اس کا ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ طبقہ جہاں مرد سے گھر خالی ہو، دشواریاں اور پریشانیاں آ ہی جاتی ہیں۔ اسی بنا پر ہمیشہ اس کی ماں کہا کرتی تھیں ”سر اور سینے ڈھانپ کر چلا کر۔“ اور یہی خوف اور ان کی لاچاری نے اپنی بیٹی کی خوشی کے لیے امیر شہری کے در پر جھکنے پر مجبور کر دیا۔

امیر شہری سے شادی کے بعد جب وہ حاملہ ہوئی اور الٹرا ساؤنڈ کے ذریعہ بیٹی کی خبر اس شہری کو معلوم ہوئی تو اس نے ابارشن کا فیصلہ سنا دیا:

”اولاد کے نام پر بیٹی۔ اسے کئی راتیں یاد آ گئیں جب اس نے بستر پر نہ جانے کتنی ہی بیٹیوں کو بے دردی سے روندا تھا۔ ہرگز نہیں اس کی بیٹی کسی مرد کے روندے گئے وجود کا حصہ نہیں بنے گی۔“

انسان اس وقت تک گناہوں کی لذت کے حصول میں رہتا ہے جب تک اسے اس کا احساس نہیں ہو جاتا، اور یہ احساس اس وقت ہوتا ہے جب خود اس کے ساتھ ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ امیر شہری نے نہ جانے کتنی بیٹیوں کے ارمانوں کو نرم گداز بستر پر روندا ہوگا۔ اس لیے اسے بیٹی کے نام پر عجیب سا محسوس ہوا اور اس نے ابارشن کا فیصلہ کیا۔

اس کی ماں نے مجبوری میں اپنی بیٹی کا ہاتھ امیر شہری کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ لیکن ایسا نہیں کہ بیٹی کے بدلے اس نے دولت خریدا، بلکہ سچ یہ ہے کہ غیرت بچانے کے لیے بیٹی کے کم سن جذبات کو بیچا۔ ثانیہ بھی ایک ایسی خاتون تھیں جس کی شادی انٹرمیڈیٹ کرتے ہی والدین نے پھوپھی زاد بھائی سے کرا دیا تھا۔ نوعمری کے خواب ابھی بیدار بھی نہیں ہو پائے تھے کہ بیاہ دی گئی اور شادی کے دو مہینے بعد اس کے جسم سے رنگین لباس چھن گیا۔ پھر کسی نے غفور ملک کا رشتہ دیا جو نام کا کنوارا تھا اور رئیس بھی، لیکن ہر رات بستر بدلنے کی عادت تھی اور ثانیہ کو پہلی رات میں اندازہ ہو گیا کہ وہ بیاہی نہیں بلکہ خریدی گئی ہے اور پھر ذہنی و جسمانی اذیتوں کا لمبا سلسلہ شروع ہوا۔ عورتیں ہمارا تہذیبی ورثہ ہونے کی وجہ سے ظلم و ستم بھی سہ لیتی ہیں اور خاموشی کے ساتھ اپنی زندگی گزار بھی دیتی ہیں۔ وہ اپنے شوہر کے ہر ستم کو برداشت کرتی ہیں لیکن ان کے شوہر کسی اور کے ساتھ شب بسری کریں، وہ بھی ان کے سامنے، کبھی برداشت نہیں کر سکتی ہیں۔ لیکن ثانیہ غفور اسے بھی نظر انداز کر گئی جب آفاق نے [جو غفور ملک کے پاس بچپن سے رہتا تھا اور اس کا ہر کام انجام دیتا تھا] اسے اپنے باپ کی دہلیز پر ہمیشہ کے لیے جانے کو کہا تو ثانیہ نے کہا:

”کھونٹے بدلنے سے مقدر نہیں بدلا کرتے آفاق! کل ابو کے کھونٹے میں تھی تو غربت نے خاموش رکھا۔ آج غفور ملک کے کھونٹے میں ہوں تو عزت کے بھرم نے خاموش رکھا۔ اللہ پاک نے عورت کے نصیب میں کوئی تیسرا کھونٹا گاڑا نہیں۔“

ہمارا معاشرہ عورتوں سے تہذیب و ثقافت، عفت و پاکدامنی، عزت و آبرو کی خوب امیدیں کرتا ہے لیکن پھر یہی ان کی عزت کو تار تار بھی کرتا ہے۔ کبھی ان کی پاکدامنی کو چھین کر اور کبھی اولاد کے نام پر لڑکی سن کر ابارشن کروا کر۔ ثانیہ غفور کئی بار اس ابارشن کا شکار ہو چکی تھی لیکن اس کی امنگ ماں بننے کی اب بھی جگی تھی۔

”نہیں آفاق! اس بار نہیں، میں ماں بننا چاہتی ہوں۔ چاہے میرے شکم میں لڑکی ہی کیوں نہ ہو۔“

اور پھر غفور ملک کو دھوکے میں ڈال کر ثانیہ نے جب بچی کو جنم دیا تو اسے طلاق نامہ مل گیا۔ یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے اور مجھے منٹو کی بات یاد آتی ہے کہ ہر مرد بستر پر عورت چاہتا ہے لیکن وہی معاشرہ اسی عورت سے بدظن کیوں ہے۔ کیوں عورت کو اس کا اپنا حق اور اپنی جائز مرضی سے بھی روکا جاتا ہے۔

دور جاہلیت میں جب لڑکی کی پیدائش ہوتی تھی تو عزت و ناموس پر دھبہ سمجھ کر اسے زندہ درگور کر دیا جاتا تھا اور اب حمل میں ہی اس معصوم کے جسم کے ریزے ریزے کر دیے جاتے ہیں اور قدرت کی اس حسین خلقت کو گندے نالے میں بہا دیا جاتا ہے۔ فاخری پوچھتی نظر آتی ہیں آخر نسل کشی کیوں؟ اولاد کے نام پر لڑکی سن کر ماتھے پر شکن کیوں؟ کیوں آخر اس کی مرضی معاشرہ نہیں پوچھتا ہے؟ کیوں صرف اسے جسم کی تسکین کا ایک آلہ سمجھا جاتا ہے؟

یہ ایک حقیقت ہے جہاں رات کے اندھیروں میں رنگین لباس پہن کر شراب و شباب کے نشے میں دھت اسی عورت کی تلاش ہوتی ہے جو ان کی اس رات کو اور رنگین کر دے اور صبح کی روشنی پھیلتے ہی سفید اور بے داغ شرافت کی چادر اوڑھ لیتے ہیں۔ ایسے میں ظاہر ہے جو گھر مردوں سے خالی ہو وہاں خوف و حراس کا عالم ہی ہوگا۔ پھر یہ مجبوری کسی شہزادے کا انتظار کرنے نہیں دیتی بلکہ ایک اچھا رشتہ دیکھتے ہی اس کی شادی کر دی جاتی ہے اور پھر عمر بھر وہ لڑکی اپنے ماں باپ کی عزت و ناموس اور اسی معاشرہ کے خوف سے ایسے آفتاب کو امید کی نظروں سے دیکھتی ہے جو ڈھلنے کے قریب تر ہو اور پھر خاموش کمزور کھونٹے سے بندھی پوری عمر گزار لیتی ہے۔

فاخری کا افسانہ ’جھبری‘ بھی اسی معاشرہ پر ایک کڑی تنقید ہے۔ جھبری بڑی ہوئی تو اس کی ماں

کہا کرتی تھی بلکہ جب اس کی ماں مرنے لگی تو بھی اس نے کہا تھا:

''کٹاکھنی بنی رہے گی تو کتے نہیں کاٹیں گے۔''

جھبری کی ماں اس معاشرہ کی اس حالت سے بخوبی واقف تھیں۔ انھوں نے اپنی زندگی اسی سزا میں گزارا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ جھبری سے کہتی رہتی تھی کہ دیکھو دور رہنا سیکھو ان مردوں کی ذات سے، تاکہ تم بھی میری طرح در در نہ بھٹکو۔ جھبری ہمیشہ اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی لیکن اس کی ماں ہر بار کوئی نیا بہانہ بناتی، کبھی کہتی اس کا باپو مر گیا، کبھی کہتی اس کا باپو گاؤں میں ہے۔ جھبری کی ماں نگینہ کے حالات کسی پر ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ ہر کوئی جانتا تھا جھبری کا باپ کون ہے۔ نگینہ کے مرنے کے بعد جھبری گاؤں بھی گئی تھی اپنے باپ کی تلاش میں اور گاؤں کے اس سیلاب میں ہر ڈوبتے شخص میں اس کو اپنا باپ نظر آتا:

''بوڑھا مر جائے گا۔ کہیں سے آواز اٹھی۔''

''جھبری تڑپ اٹھی۔ اگر یہ اس کا باپو ہوا تو۔''

سیلاب میں ڈوبتے ہر شخص کو وہ بچانا چاہ رہی تھی۔ ہر ڈوبتے شخص میں اس کو اپنا باپ نظر آتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جان کی پروا کیے بغیر ہر شخص کی مدد کر رہی تھی اور اس کارنامے کی وجہ سے اس کی شہرت ہر طرف ہونے لگی۔ اس کے چرچے عام ہو گئے اور اس شہرت کی وجہ سے جھبری کے ماں باپ کو دعائیں ملنے لگیں۔ جھبری بڑی ہوئی تو اس کی ماں کہا کرتی تھی اور جب اس کی ماں مرنے لگی تو بھی اس کی ماں نے کہا تھا۔ بابو بھائی نے اس شہرت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سچ کو تسلیم کر لیا جس سچ کے لیے جھبری تڑپ رہی تھی اور جب اس حقیقت کی خبر جھبری کو لگی تو:

''وہ بڑبڑائی 'ماں' آج سمجھ میں آیا کہ تیرے کلیجہ میں ہوک کیوں اٹھتی رہتی تھی؟ کیوں ہمیں چھاتی سے لپٹا کر رویا کرتی تھی؟ کیوں ہمیں ڈھکیلتی تھی کہ جا بابو بھائی کے گھر میں جا کر رہ۔''

جس کالونی میں جھبری کی ماں نگینہ عمر بھر نوکری کرتی رہی، جھبری کی انگلی پکڑ کر اس کالونی کے در در ٹھوکریں کھاتی رہی اس کالونی کا سب سے امیر آدمی ہی اس کا باپ تھا۔ وہ اس سے نفرت کرنے لگی اور اس انجان رشتے کی طرف بڑھنے لگی جہاں صرف ایک کراہتی آواز نے بیٹا کہہ کر پکارا تھا۔

یہ انسانی فطرت ہے۔ سستی شہرت اور سیاسی دنیا میں رتبہ بڑھانے کے لیے اور فائدہ اٹھانے کے لیے وہ اس حقیقت کو بھی تسلیم کر لیتا ہے جس سے عمر بھر بھاگتا رہا۔ جھبری کی شہرت کی وجہ سے اس سے ملنے کے لیے نیتاؤں اور منتریوں اور میڈیا کی بھیڑ تھی۔ ایسے میں بابو بھائی جو وہاں کے ایک نیتا ہیں اس سچ کو

تسلیم کر کے سب کی نگاہ کو اپنی طرف مرکوز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جھبری جو بچپن سے جوانی تک روٹی کے ٹکڑے کے لیے دربہ در ٹھوکریں کھاتی رہی دروازوں پر دھتکاری گئی۔ ماں کے بعد تو وہ بے سہارا ہو گئی تھی۔ ہر رات خوف کے سائے میں سوتی تھی۔ اس وقت بھی بابو بھائی کی روح نہیں کانپی تو آج کیوں؟ عمر کی ایک خاص دہلیز پر جب عموماً باپ بھائی کی ضرورت ہوتی ہے اس وقت وہ نیم کے درخت کو سہارا بنا کر اپنی حفاظت خود کر رہی تھی۔ اسے ماں کی بات اچھی طرح یاد تھی کہ ''کٹاکھنی بنی رہے گی تو کتے نہیں کاٹیں گے۔''

فاخری کے افسانوں میں دو طبقہ کی کشمکش بھی ملتی ہے ایک اعلیٰ طبقہ اور ایک ادنیٰ۔ ان کے افسانے پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج بھی نچلے طبقے کا استحصال جاری ہے جب کہ ہم اکیسویں صدی میں سانس لے رہے ہیں اور اس استحصال کا ذمہ دار پورا کا پورا معاشرہ ہے، گویا اجتماعی استحصال ہے۔ ظلم کے خلاف آواز نہ اٹھانا، خاموش تماشہ دیکھنا، یہ بھی تو ظلم کو بڑھاوا دینا ہے۔ یہاں تو پورا کا پورا معاشرہ جانتا تھا کہ جھبری کا باپ کون ہے لیکن اسے انصاف نہیں ملا اور وہ در در بھٹکتی رہی، اور پھر یہی خاموشی معدودے چند کو پورا کا پورا معاشرہ خراب کرنے کا بڑھاوا دیتی ہے۔ ہر شخص اگر خود کی اصلاح کرے تو معاشرہ گرتی تہذیب کا شکار نہیں ہوگا، لیکن امیری اور غریبی ایک ایسا فرق ہے جہاں دنیا دو طرف تقسیم ہو جاتی ہے اور پھر استحصال اسی غریبی کا ہوتا ہے۔ افسانہ 'کنور فتح علی' اسی طبقاتی کشمکش کی طرف اشارہ کرتا ہوا ایک دلچسپ افسانہ ہے۔ موضوعاتی اعتبار سے افسانہ اپنا سفر بہت ہی خوبصورت انداز میں طے کرتا ہے۔ فاخری نے اس افسانے میں دو طبقہ کی نمائندگی کی ہے۔ ایک ولایت حسین خان کا طبقہ ہے جو عیش و عشرت کی آماجگاہ ہے اور دوسرا فتح علی کا طبقہ ہے جہاں سکھ چین کی زندگی کے لیے دربہ در ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔ کنور فتح علی کو اس بات کی ترغیب بچپن سے ہی دی گئی تھی:

''بیٹا ہر انسان کے کندھے پر دو تھیلے لٹکے ہوتے ہیں، داہنی طرف نیکی کا تھیلا اور بائیں طرف بدی کا، کوشش کرنا میرے بچے کہ تمہاری نیکی کا تھیلا زیادہ وزنی ہوتا رہے۔''

آج بھی کنور فتح علی کے ذہن میں یہی بات تھی۔ وہ سرکاری دفتر میں ادنیٰ ملازم تھا۔ برسوں سے پرموشن چاہتا تھا۔ ولایت حسین خان کی شکل میں اسے ایک امید نظر آئی۔ امید ہوتی بھی کیوں نہیں، وہ اس کے گاؤں کے قریب کا جو ٹھہرا، اور اسی امید میں وہ نہ صرف افسر کے کام کو انجام دیتا بلکہ وہ افسر کی بیوی کے آگے پیچھے بھی رہتا۔ ''افسر کا کتا اور افسر کی بیوی وہ کام کروا سکتے ہیں جو دوسرا کوئی نہیں کروا سکتا۔'' لیکن بات تو اس سے بھی آگے بڑھ گئی تھی۔

میں اس کی بات کیسے مان سکتا ہوں، میں کیوں اپنے جسم کو مکمل طور پر اس کے سپرد کردوں، اس کا بن جاؤں۔اس کے ساتھ شب بسری کروں۔یہ ممکن ہی نہیں عبداللہ۔''

یہاں ایک طرف ولایت حسین خان جیسے لوگ بستے ہیں جو اپنی بیوی کے حقوق کو پورا نہیں کر سکتے اور اس بات سے باخبر بھی ہیں لیکن بیوی کا دل بہلانے اور گھر کے ماحول کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے ملازم کا استعمال کرتے ہیں، اور وہ ادنیٰ سا ملازم تذبذب کا شکار ہے۔ایک طرف حسن ہے جو دستک دے رہا ہے کہ ساری حدیں توڑ دو۔دوسری طرف اس کی امانت داری، دیانت داری اور پاکیزگی ہے جو اس کی زندگی کا اصل سرمایہ ہے۔لیکن غربت کا خوف وخط افلاس بھی ہے اور پرموشن کا شوق بھی۔ان سب کے باوجود وہ غربت سے لڑنے کو تیار ہے لیکن اس گہرے کنوے میں ڈوبنا نہیں چاہتا۔

انسان کی اس حسین بستی میں اب رشتے صرف نام ونمود کے ہوتے ہیں۔ایسا لگتا ہے جیسے اب رشتے میں قحط پڑ گیا ہو۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب انسان کی اس بستی میں رشتے کی اہمیت نہ رہی۔'آتش زیر پا' رشتے کی تلاش وجستجو کی ایک کڑی ہے جہاں لڑکی اپنے ایسے ساتھی کی تلاش کرتی ہے جس کے ساتھ کئی خوشگوار راتیں اس نے گزاری ہیں اور اچانک وہ ایک صبح غائب ہو گیا۔جب وہ لوگوں سے اپنے ساتھی کے بارے میں پوچھتی تو جواب ملتا ''یہاں پہچان والے لوگ تو ملتے نہیں ہیں اور جن کے رشتے کی کوئی پہچان نہیں ہوتی ان کا حال کون جانے۔'' لیکن یہ حقیقت ہے کہ ''جب رشتوں میں قحط آجاتا ہے تو زبان کی طرح جسم بھی نیا ذائقہ تلاش کرتا ہے۔'' اور گاؤں والوں نے اس لڑکی کے ساتھی کو اس کی سہیلی کے ساتھ گاؤں سے باہر جاتے دیکھا تھا۔

شائستہ فاخری کے بیشتر افسانے پڑھنے کے بعد اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے افسانے میں مظلوم عورت کے درد والم اور ستم زدہ عورت کی داستان پیش کی ہے۔اسی طرز کا ایک اور افسانہ 'درد شور انگیز' ہے۔ارجمند ایک خوبصورت اور گول جسم کی مالک ہے، شوہر کے انتقال کے بعد گاؤں کے بدمعاش سجن بابو کی نگاہ اور بھی زیادہ اس کا پیچھا کرنے لگی۔لیکن بابا صاحب نے ہمیشہ اس سے ہوشیار رکھا:

''سجن بابو اچھا آدمی نہیں ہے، تم باہر مت نکلا کرو۔''

''کہاں نکلتی ہوں بابا صاحب! ہفتہ پندرہ دن پر جب جی بہت گھبراتا ہے تو اپنے کنویں کی منڈیر پر بیٹھ جاتی ہوں۔کہیں دور تو جاتی نہیں۔''

''بیٹھنا بری بات نہیں ہے ارجمند، دروازے کے پاس کا یہ کنواں ہمارے باپ دادا کا ہی بنوایا ہوا ہے۔دشواری یہ ہے کہ ابھی تم جوان ہو اور زمانہ خراب ہے۔''

''بابا زمانہ تو اس وقت بھی خراب تھا جب عبدالغنی ہمارے ساتھ رہتا تھا۔''

''تب اور اب میں فرق ہے ارجمند! تب لوگ دروازے کے باہر سے پکارتے تھے اب دروازے کے اندر آکر آوازیں کسیں گے۔بغیر مرد کے عورت ایسی کھلی ہانڈی ہے، جس کی مہک بھرے پیٹ والوں کو بھی بھوکا بنا دیتی ہے۔تم تو جانتی ہو کہ ہماری بستی کا ایک ہی بھوکڑ ہے، سجن بابو۔''

شائستہ فاخری نے معاشرے کی نبض شناش بن کر عورت کو مرکز میں رکھ کر کئی افسانے تحریر کیے ہیں۔'درد شور انگیز' میں معاشرے کا سچ اتنی فن کاری سے پیش کیا ہے کہ قاری افسانہ ختم کرنے کے بعد محو حیرت ہو جاتا ہے۔ایک بیوہ عورت کے ساتھ معاشرے کے بد چلن افراد جیسا برتاؤ کرتے ہیں، اس کی بڑی عمدہ نقاب کشائی کی ہے۔تخلیق کار نے یہ بھی دکھایا ہے کہ کس انداز میں ارجمند کے شوہر کو قتل کر کے اس کو پانے کی کوشش کی جاتی ہے۔مجبور ہو کر ایک بیوہ کو مسجد کے بوڑھے موذن کی زوجیت میں آنا پڑتا ہے، جسے وہ اپنا پیر و مرشد سمجھتی رہی ہے۔معاشرے میں صرف مرد ہی عورت کا استحصال نہیں کرتا بلکہ عورت بھی مرد کا استحصال کرتی ہے۔ہاں لیکن یہ شرح مردوں کے حوالے سے زیادہ پائی جاتی ہے۔معاشرتی اقدار کے زوال پر فاخری نے جنسی موضوع کو جگہ دی ہے۔ان کا ماننا ہے کہ یہ برائی تمام برائیوں کی جڑ ہے اور ایسی راہ پر لے جاتی ہے جہاں سے لوٹنا مشکل ہے، اور نہ جانے کتنے رشتوں اور کتنے گھروں کو اجاڑ کر رکھ دیتی ہے۔

ان تمام افسانوں کا موضوع بہت دلچسپ ہے، لیکن کردار کے مکالمے کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔فاخری کے افسانوں کی کمی یہی ہے کہ ان کے یہاں کرداروں کو زبان بہت کم دی گئی ہے۔لیکن جہاں ضرورت محسوس ہوئی ہے وہاں انھوں نے کرداروں کو زبان دیا ہے۔بیانیہ انداز ہے۔فلیش بیک کی تکنیک ہے۔لیکن یہ تو مسلم حقیقت ہے کہ انداز بیان کی وجہ سے ان کے افسانوں میں قاری آخر تک ڈوبا رہتا ہے۔

☆☆☆

Mohd. Saiful Islam
Research Scholar, Dept. of Urdu,
MANUU, Hyd-32
Mob. 9700338948,
E-Mail: saifqasmi2@gmail.com

صادقہ نواب سحر عصر حاضر کی ایک ممتاز فکشن نگار

عشرت رسول

عہد حاضر کی خواتین شاعروں اور ادیبوں کی خاصی طویل فہرست ہے۔جس میں صادقہ نواب سحر ایک انفرادی مقام رکھتی ہیں۔صادقہ نواب سحر ۱۸/اپریل ۱۹۵۷ءکو آندھرا پردیش کے علاقہ گنٹور میں پیدا ہوئیں۔ان کا اصل نام صادقہ آرا ہے اور ان کے والد کا نام خواجہ میاں۔جب صادقہ نواب کی عمر پانچ مہینے کی تھی تب ہی وہ اپنے والدین کے ساتھ اپنے آبائی وطن گنٹور سے ممبئی گئیں اور پھر وہیں رہ کر اپنی تمام تر تعلیمات پوری کیں۔ابتدائی اور ثانوی تعلیم ممبئی کے امام باڑہ میونسپل اسکول اور انجمن اسلام گرلز ہائی اسکول سے اول درجے کے ساتھ حاصل کیں۔اسکول کی تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے صوفیہ کالج، ممبئی کا رُخ کیا اور پھر ایس۔سی کے امتحانات پاس کیے۔اسی دوران ان کی شادی محمد اسلم نواب سے ہوگئی اور پھر شادی کے بعد انھوں نے تین مضامین اُردو، ہندی اور انگریزی میں اول درجات کے ساتھ ایم۔اے کیا۔ ۱۹۹۹ء میں ’ہندی غزل ۱۹۶۰ء کے بعد‘ کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کی۔بعد میں مہاراشٹر کے ایک کالج میں صدر شعبہ (ہندی) اور درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔آج کل وہ ممبئی میں یو۔این۔آئی (UNI) میں ریسرچ گائڈ ہیں۔

ڈاکٹر صادقہ نواب سحر اردو ادب کی دنیا میں بیک وقت ایک تخلیق کار، ڈراما نگار، ناقد، محقق، شاعرہ، مترجم اور بچوں کی ادیبہ کی حیثیت سے معروف ہیں۔اُردو کے ادبی حلقوں میں ان کے ناولوں، افسانوں، ڈراموں اور شاعری کو نہایت دلچسپی سے پڑھا جارہا ہے۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ’انگاروں کے پھول‘ ۱۹۹۶ء میں منظر عام پر آیا جس کی اشاعت کے لیے انھیں مہاراشٹر اُردو ساہتیہ اکادمی کا مالی تعاون حاصل رہا۔ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ’خلِش بے نام سی‘ ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا۔انھوں نے اپنے افسانوں میں مرکزیت اس

انسان کو دی ہے جو ذہنی انتشار کا شکار ہو چکا ہے جس کا اثر اس کی زندگی کی نفسیاتی اُلجھنوں میں دکھائی دیتا ہے۔صادقہ نواب سحر کے افسانوں کا اصل موضوع عہد جدید کے افراد کی ذہنی اور نفسیاتی زندگیاں ہیں جوان کے گہرے تجربات، مشاہدات اور عصری آگہی کا نتیجہ ہے جس کے بیان میں افسانہ نگار نے کہیں بے باکی تو کہیں سنجیدگی سے کام لیا ہے۔ان کے اکثر افسانے ’فیمینیزم‘ پر پورے اُترتے ہیں۔انھوں نے اپنے افسانوں میں ان بے بس اور مجبور لڑکیوں کے مسائل کو پیش کیا ہے جو پڑھنا تو چاہتی ہیں لیکن ان کے گھر والے ان کی پڑھائی میں دلچسپی نہیں لیتے۔افسانہ ’شریاں والی‘ میں انھوں نے عورت کے استحصال کو موضوع بنایا ہے۔عورت کا جسمانی استحصال ہماری زندگی کا مقصد بن گیا ہے۔کبھی وہ جبر کا شکار ہوتی ہے تو کبھی مذہبی عقیدے کا۔اس افسانہ میں انھوں نے قدرت اور مادیت کو اپنے اسلوب میں ایسے ہم آہنگ کیا ہے کہ ’شیریاں والی‘ خاتون کا ذاتی کرب علامتی نظام بن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔انھوں نے اپنے ہر افسانہ میں کسی نہ کسی مسئلہ کی طرف اشارہ کیا ہے ’خلش بے نام سی‘ ایک عشقیہ کہانی ہے لیکن مصنفہ نے بڑے خوبصورت انداز میں ایک لڑکے اور لڑکی کی محبت کو بیان کرتے ہوئے جہیز اور لالچی ذہنوں پر وار کیا ہے۔

صادقہ نواب سحر کے تمام افسانوں کے مطالعہ کے بعد جن نکات پر روشنی پڑتی ہے ان میں موصوفہ کے پیش کردہ مختلف النوع موضوعات جن سے نہ صرف وہ واقف ہیں بلکہ وہ اپنے مشاہدات کو بخوبی فن کے قالب میں ڈھالنے کا ہنر بھی جانتی ہیں۔ان کے افسانے سماجی، سیاسی، معاشرتی، ثقافتی، فکری اور تاریخی پہلوؤں کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ان کے زیادہ تر افسانے عصری حالات اور مسائل پر مبنی ہوتے ہیں۔انھوں نے بچوں کے لیے بھی نظمیں لکھی ہیں جو ۲۰۱۳ء میں ’پھول سے پیارے جگنو‘ کی شکل میں منظر عام پر آیا۔

صادقہ نواب سحر کو جس تخلیقی فن پارے نے شہرت ومقبولیت کی بلندیوں پر پہنچایا وہ ان کا ناول ’کہانی کوئی سناؤ متاشا‘ ہے۔اس ناول کی پذیرائی اور کامیابی کے نتیجے میں کئی سرکاری اور غیر سرکاری اداروں نے انھیں انعامات واعزازات سے نوازا۔یہ ناول ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا ہے۔ناول ’کہانی کوئی سناؤ متاشا‘ کا مرکزی کردار متاشا ہے جو ایک غائب راوی کی فرمائش پر کہانی سناتی ہے۔اس کردار کی پوری کہانی ذاتی درد وکرب کی ایک المناک داستان ہے۔کہانی کی ہیروئن متاشا کو زندگی کے ہر موڑ پر اس کے حقیقی رشتوں نے دغا دی۔

عصر حاضر میں تانیثیت کے موضوع پر یہ ایک اہم ناول ہے۔متاشا سماج کی بے جا رسم ورواج کے

سامنے اپنا سر نہیں جھکاتی ہے بلکہ ان کا مقابلہ پورے اعتماد، حوصلہ اور عزم کے ساتھ کرتی ہے۔ جن حالات میں اس کی پرورش ہوتی ہے وہ اس کو باغی بنا دیتے ہیں۔ متاشا مکمل طور پر اپنے خاندان والوں کے خلاف بغاوت نہیں کر پاتی، لیکن اس کی حرکات وسکنات سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے ظالم باپ یا کسی دوسرے شخص کے ظلم وتشدد کے سامنے سر نہیں جھکائے گی۔ اس کا اپنا ایک وجود ہے، اپنی ایک پہچان ہے۔ اس ناول میں سماج میں عورت کے استحصال کی داستان بڑی دل سوز ہے۔

'کہانی کوئی سناؤ متاشا' کو سوانحی ناول قرار دیا گیا ہے۔ پورا ناول متاشا کی زندگی کے تلخ جذبات سے معمور ہے۔ اس ناول میں متاشا کے کردار کے بیان کے بارے میں جبر و استبداد کی مختلف صورتیں پڑھنے والوں کے دل و دماغ میں غم والم کا احساس پیدا کر دیتی ہیں۔ اس ناول میں سماج کے مختلف طبقے، ان کے رسم ورواج کی بھی عکاسی ملتی ہے۔ مختلف مذاہب کے طور طریقے، رہن سہن کا علم اس ناول کے ذریعہ ہوتا ہے۔ مصنفہ کی سنجیدہ سوچ اور گہری نظر عصری مسائل اور تہذیبی قدروں کا بھرپور جائزہ لیتی ہے۔ کہانی پن اس ناول کی اہم خوبی ہے۔ اس میں مصنفہ نے ایک حامی طبقے کے لوگوں کی زندگی کے نشیب و فراز کا فراخ دلی سے جائزہ لے کر عمدگی سے پیش کیا ہے۔ یہ ناول ایک عورت کی دکھ بھری داستان ہے جس میں وہ زندگی کے بہت سارے مراحل سے گزرتی ہے۔ آج اس ترقی یافتہ دور میں بھی عورت کی وہی حالت ہے جو آج سے ۱۰۰ رسال قبل تھی۔

مختصراً اس ناول کی ہیروئن نچلے طبقے کی ہے جس کا کردار ایثار وقربانی سے مزین ہے۔ جو زندگی کے ہر پڑاؤ پر مرد کے ظلم و زیادتی کا شکار ہوتی ہے۔ اس میں عورت کا جنسی استحصال بھی دکھایا گیا ہے۔ یہ ناول عورت کے اجتماعی لاشعور سے گہرا رشتہ قائم کرتا ہے اور حقیقی دنیا میں ہونے والے واقعات کی تصویر کشی کرتے ہوئے سماج کے کڑوے پن کو ظاہر کرتا ہے۔ سلام بن رزاق اس ناول کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "......اپنے تخلیقی اظہار، رواں دواں بیانیہ اور حقیقی کردار نگاری کے سبب یہ ناول شروع سے آخر تک قاری کو نہ صرف باندھے رکھتا ہے بلکہ ورق ورق اُس کے اندر ایک دبی دبی سی کسک کا احساس بھی پیدا کرتا ہے۔"

مجموعی طور پر یہ ایک کامیاب ناول ہے۔ عورت ذات کو محور بنا کر اسے لکھا گیا ہے۔ اسی لیے اس کا مرکزی کردار ایک عورت ہے جو اپنی زندگی کی آپ بیتی خود بتاتی ہے۔ جگہ جگہ اس کی خود کلامی عورت کی نفسیاتی شبیہ کی عکاسی کرتی ہے۔ متاشا کی مظلومیت ایک علامت کے طور پر سامنے آتی ہے اور تانیثیت کے

موضوع پر یہ ایک اہم ناول قرار پاتا ہے۔

۲۰۱۶ء میں صادقہ نواب سحر کا دوسرا ناول 'جس دن سے' منظر عام پر آ گیا جو مہاراشٹر کے پس منظر میں لکھا گیا ہے، جس میں انھوں نے ایک متوسط گھرانے کی کہانی کو پیش کر کے ہمارے معاشرتی نظام کی خرابیوں پر مختلف انداز میں گہرا طنز کیا ہے۔ یہ ایک بچے کی کہانی ہے جس کا نام 'جتیش' ہے اور لوگ پیار سے اُسے 'جیتو' کے نام سے پکارتے ہیں۔ وہ اپنے ماں باپ کے ٹوٹے رشتہ میں کڑی نہ بن سکا جو دونوں کو جوڑتی ہے۔ زندگی قدم قدم پر جیتو کا امتحان لیتی ہے۔ اس کو دلی سکون کسی حال میں نہیں ملتا۔ اگر کوئی خوشی ملتی بھی ہے تو اس کے ماضی کی تلخی اس کے حال پر غالب آ جاتی ہے۔ اس کی زندگی میں چار لڑکیاں آتی ہیں لیکن سچی محبت حاصل نہیں ہو پاتی۔ اس ناول میں افراد خاندان کی بے راہ روی نے انسانی رشتوں کو بکھیر کر رکھ دیا ہے، جس کی وجہ سے خاندان کا ہر فرد پریشانی اور مصیبت میں مبتلا نظر آتا ہے جو اپنی خواہشات و انا کی وجہ سے خود غرض ہے اور خونی رشتوں کو بھی بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنی جنسی ونفسیاتی خواہشات کی تکمیل میں لگا ہوا ہے جس کی وجہ سے گھر کا ہر فرد ذہنی اور روحانی طور پر پریشانی کا شکار ہے۔ رتن سنگھ اس ناول کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "گتھے ہوئے واقعات، چست جملے، نفسیاتی اعتبار سے حقیقی تجزیہ اور فکری سطح پر مکمل کہانی، صرف جیتو کی داستان ہی نہیں رہ جاتی بلکہ یہ داستان اس ملک کے اُن لاکھوں کروڑوں گھروں کی داستان بن جاتی ہے، جہاں زندگی اسی قسم کے بدنما حالات کا شکار ہو کر اندھیروں میں بھٹکتی رہ جاتی ہے۔" (تقریظ، جس دن سے، ص۱۰)

صادقہ نواب سحر نے اپنے ناولوں میں زیادہ تر شہری زندگی کو پیش کیا ہے کیونکہ ان کا تعلق حیدرآباد اور ممبئی جیسے بڑے شہروں سے رہا ہے اس لیے انھوں نے اپنے آس پاس جو کچھ دیکھا اس کو ناول کے پیرائے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔

ہندی میں ان کی جو کتابیں چھپ چکی ہیں ان میں 'پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ'، 'مجروح سلطان پوری کی کلیات کا ہندی میں ترجمہ' (۲۰۰۰ء)، 'ہندی غزل - فکر و فن' (تحقیقی مقالہ) ۲۰۰۷ء، 'منت' ۲۰۱۲ء میں کتابی صورت میں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ صادقہ نواب سحر کی تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی نگارشات کا ترجمہ پنجابی، تیلگو، انگریزی اور مراٹھی زبانوں میں ہوا ہے۔ ان کی تحریریں 'سب رس'، 'اُردو دنیا'، 'ابجد'، 'جدید ادب'، 'تکمیل' اور 'عالمی سہارا' وغیرہ رسائل وجرائد میں چھپ چکی ہیں۔

صادقہ نواب سحر کو بچپن ہی سے شعر و ادب سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ یہ دلچسپی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ اُردو ہندی کے علاوہ دیگر زبان و ادب کی شاعری اور قصے کہانیاں پڑھنا نہ صرف ان کے شوق میں شامل تھا بلکہ خود بھی اشعار کہنا اور ہندی و اُردو میں چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھنا ان کے معمول کا حصہ بن گیا ہے۔ چنانچہ ان کا یہی وہ فطری ادبی ذوق وشوق ہے جو گزرے ہوئے ایام کے ساتھ پروان چڑھتا گیا اور آج انھوں نے ایک کہنہ مشق فنکار کی صورت اختیار کر لی ہے۔

مجموعی طور پر صادقہ نواب سحر کی شخصیت بڑی ہمہ جہت ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں سے قارئین کو اپنی جانب پوری طرح سے متوجہ کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں وہ بڑی حد تک کامیاب نظر آتی ہیں۔ ان کی تحریریں اردو اور ہندی دونوں کے ادبی سرمایوں میں قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ صادقہ نواب سحر کا تخلیقی سفر جاری ہے۔ امید ہے کہ وہ آنے والے دنوں میں اپنے فکر و فن کی جولانیاں دکھاتی رہیں اور مستقبل میں ایک نسائی لہجہ کی پاسدار بن کر اسی حوالے سے جانی پہچانی جائیں گی۔

☆☆☆

Ishrat Rasool
AMU, Aligarh-202002,
E-Mail: ishurdu5u@gmail.com

اردو ناول: سمت و رفتار

فردوس تقی

قدیم زمانے میں جب انسان جنگلوں میں زندگی گزار رہا تھا تب اس کے پاس تہذیب کی دولت نہ تھی اور نہ ہی دور دراز کے رہنے والے لوگوں سے رابطہ کا کوئی ذریعہ تھا۔ اس وقت انسان کے پاس زندگی گزارنے کے لیے کچھ محدود طریقے تھے جن سے وہ بہ ظاہر مطمئن تھا اور اس کے سامنے وقت گزاری کے لیے صرف قصے کہانیاں ہی تھیں جن کے ذریعہ وہ واقعات اور داستانوں سے دل بہلانے کے ساتھ ساتھ زندگی کی مشکلات کے احساس کو بھی کم کرنے کی کوشش کرتا تھا کیونکہ خواہشات کی تکمیل جب حقیقی عنوان سے نہیں ہو پاتی تو تخیل کے سہارے ان کو پورا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس خامی کے باوجود ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ قدیم داستانوں میں ہمارے ادب کا وقیع سرمایہ موجود ہے۔ انہیں داستانوں کے ذریعہ سے ہم اس دور کے تہذیب و تمدن اور ادب و معاشرت سے واقف ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی لکھتے ہیں:

> ”جس طرح شراب ذرا دیر کے لیے آدمی کے دکھ درد کو بھلا دیتی ہے اسی طرح داستان بھی وقتی سکون سے ہمکنار کرتی ہے لیکن داستان نے صرف یہی کام نہیں کیا۔ اس نے اپنے دور کے انسانوں کی ذہنی و جذباتی، نفسیاتی اور ادبی ضرورتوں کو بھی پورا کیا۔ اسے ماضی کی چیز، بے کاری کا مشغلہ، بے پر کی اڑان کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔“
> (اردو داستان تحقیق و تنقید، قمر الہدیٰ فریدی، ص ۳۹)

یہ حقیقت ہے کہ داستانیں قصے اور کہانیاں صرف تفریح کے لیے ایک ذہنی اپج تھیں کیونکہ انسانی ذہن تفریح کی باتوں کو جلدی قبول کر لیتا ہے، مگر ذہنی تفریح کی بھی ایک حد ہوتی ہے، اس لیے جب اس کا ذہن غیر فطری باتوں کو سن کر تھک گیا تو وہ ان مربوط اور فطری واقعات کو ناول کی شکل دینے پر مجبور ہو گیا اور اسی وقت سے ادب میں ناول کی داغ بیل پڑی۔ پھر یہ صنف اس قدر مقبول ہوئی کہ اس نے شاعری اور

دوسری اصناف کو بھی بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ ادب کی تمام اصناف میں ناول ہی ایک ایسی صنف ہے جس میں اجتماعی اور خارجی زندگی کے حقائق کی مکمل تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔

افسانہ، ناول، ڈراما اور انشائیہ سب میں کسی نہ کسی صورت میں بنیادی خیال میں زندگی کا کوئی گوشہ صنفی صورت اختیار کرتا ہے۔ ان سبھی اصناف کے مقابلے میں ناول کا کینوس زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ ناول کے ذریعہ فرد اور اس کی سماجی تہذیب کی عکاسی اور سماج کی مصوری، انسانی رشتوں کی پیچیدگیاں اور جذبہ کی گہرائیوں کی عکاسی کی جاتی ہے۔

ناول تہذیب، اخلاق، سماج، فلسفہ اور سیاست سب کو ایک ساتھ لے کر چل سکتا ہے۔ اس میں زندگی کے ہر پہلو کی جھلک پیش کرنے کے ساتھ ساتھ معاشرے کی سچی تصویر بھی پیش کی جاتی ہے۔ جس دور میں وہ لکھا جائے۔ ناول کا انسانی زندگی و معاشرت سے کیا رشتہ ہوتا ہے اس کو واضح کرتے ہوئے اردو کے اہم نقاد پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا ہے:

''ناول اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے، ناول ایک مسلسل قصے کا دوسرا نام ہے۔ اس کے ذریعہ طنز کے تیر برسائے گئے، وعظ و نصیحت کے دفتر کھولے گئے، سیاسی مسائل حل کیے گئے، یہ زندگی کی تصویر بھی ہے اور تعبیر بھی، اور سب سے بڑھ کر ناول زندگی کے چہرے سے نقاب کشائی بھی کرتا ہے اور پھر زندگی کے اس رخ کو دیکھنے کے بعد اسے دوسروں کو دکھانا بھی ناول نگار کا فرض ہے۔'' (اردو ناول کا ارتقا، آل احمد سرور، مشمولہ: اردو نثر کا فنی ارتقا، فرمان فتح پوری، ص ۱۳۹)

زبان حقیقت میں وہ بنیادی قوت ہے جس پر ناول کی کامیابی منحصر ہوتی ہے جو عام طور پر معاشرے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اگر موضوع دلچسپ ہونے کے باوجود اس کے پیش کرنے کا طریقہ اچھا اور دلکش نہیں ہے تو وہ موضوع پھیکا پڑ جائے گا۔ اس کے برخلاف اگر موضوع دلچسپ نہیں ہے لیکن اس کے بیان کرنے کا طریقہ پرلطف ہے تو موضوع بے مزہ ہونے پر بھی ناول دلکشی کا ذخیرہ بن جاتا ہے۔

ایسا کہا جاتا ہے کہ اردو میں ناول نگاری اپنے نئے معنوں میں نذیر احمد سے شروع ہوتی ہے اور اس صنف میں سرشار، رسوا اور پریم چند کی کوششیں اپنی بعض کوتاہیوں یا کمزوریوں کے باوجود بہت وقیع ہیں اور ہندوستان کی سماجی و معاشرتی زندگی اور نئی اور پرانی قدروں کے تصادم کا جتنا بھرپور عکس ہم ان مصنفین کے کارناموں میں دیکھ سکتے ہیں اس سے ان ناول نگاروں کے مشاہدے کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ جہاں تک ناول کی تکنیک کا تعلق ہے تو نئے ادیبوں نے اس صنف میں پرانے ناول نگاروں کی بہ نسبت ترقی کی

ہے اور اسے داستان یا قصے کی سرحد سے نکال کر خالص ناول کی حدود میں لائے ہیں۔

نذیر احمد کی ناول نگاری کا بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اسلامی سوسائٹی اور خاص کر مسلم معاشرے کی تصویر ایسی سچی اور بے لاگ کھینچی ہے کہ آنکھوں کے سامنے اس کا نقشہ پھر جاتا ہے۔ نذیر احمد نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ لڑکیوں کے دل و دماغ کو تعلیم یافتہ بنانے کی کوشش کی اور عورتوں کی زبان اور ان کے حالات کی ایسی ہو بہو عکاسی کی ہے کہ ان کے فن کا جائزہ لیتے ہوئے علی عباس حسینی لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر نذیر احمد کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ان تمام قصوں میں ہماری معاشرتی زندگی کی بالکل سچی تصویر کشی کی ہے۔'' (اردو ناول کی تاریخ و تنقید، علی عباس حسینی، ص ۱۵۴)

نذیر احمد کے ناولوں میں کچھ خامیوں کے باوجود ان کے ناول زندہ رہیں گے۔ اس لیے کہ اردو ناول نگاری کی تاریخ میں اولیت کا سہرا نذیر احمد کے ہی سر باندھا گیا ہے۔ نذیر احمد کے بعد اردو ناول نگاری کی تاریخ میں سب سے اہم نام پنڈت رتن ناتھ سرشار کا آتا ہے۔ ادب کی تاریخ میں سرشار کا مرتبہ بہت بلند ہے، سرشار نے اس میدان میں ایسے وقت میں قدم رکھا جب پرانی تہذیب کے چراغ ٹمٹمار ہے تھے۔ پرانی قدریں دم توڑ رہی تھیں اور اس کی جگہ نئی تہذیب اپنی جگہ ہموار کر رہی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے غدر نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا تھا۔ سرشار کی ناول نگاری میں اودھ کا پورا کلچر خصوصاً لکھنو کی پوری سماجی اور تہذیبی حالت پوشیدہ ہے۔ ساتھ ہی اردو ناول کو 'فسانۂ آزاد' کی شکل میں وہ عظیم تحفہ دیا کہ جس کے ذکر کے بغیر اردو ناول کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ ان ہی کی بدولت اردو ناول نگاری میں مزاح کی بنیاد پڑی۔ مجموعی طور پر سرشار نے لکھنو کے زوال آمادہ تمدن کو اپنی تحریر کا موضوع بنایا ہے، اس لیے اردو ناول نگاری کی تاریخ سرشار کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ بقول پروفیسر آل احمد سرور:

''سرشار 'فسانۂ آزاد' کی وجہ سے زندہ ہیں اور سرشار کی تصنیفات سرشار کی وجہ سے زندہ ہیں۔''

سرشار نے لکھنو کے زوال آمادہ تمدن کے مختلف مرقعے اپنے جس ملے جلے طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں پیش کیے ہیں وہ انتہائی دلچسپ ہیں۔ ان سے سرشار کی فنی مہارت کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود سرشار کی ناول نگاری میں کچھ خامیاں بھی نظر آتی ہیں کیوں کہ سرشار کے ناولوں میں جس طرح سے لکھنو کے معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے اس کو پوری طرح صحیح نہیں کہہ سکتے، کیوں کہ اس وقت نوابین اودھ میں شرفا کے گھروں میں پردے اور مرد و خواتین کے درمیان ایک محدود دائرہ ہوا کرتا تھا جو سرشار کی تصنیف

میں مزاح کے آئینہ میں چھپ سا گیا ہے۔

اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ایک زبردست موڑ اس وقت آیا جب ناول نگاری کے میدان میں مرزا ہادی رسوا نے قدم رکھا اور 'امراؤ جان ادا' کا ایک ایسا لاثانی اور لافانی تحفہ دیا کہ جس نے ناول کی تاریخ میں مرزا ہادی رسوا کو حیات جاودانی عطا کر دی۔اس کے بارے میں کے۔کے کھلر لکھتے ہیں:

''انیسویں صدی کے آخر میں مرزا ہادی رسوا نے پانچ ناول لکھے۔'افشائے راز' جو نامکمل رہا،'اختری بیگم' جو زیورات کے صندوقچے کی طرح بند ہی رہا۔'ذات شریف' اور 'شریف زادہ' جن میں شرافت بالکل ناول نگار کی ذات کی طرح کردار بن گئی اور پھر 'امراؤ جان ادا' جو انگریزوں کے اودھ پر قبضہ کرنے سے پہلے کے لکھنو اور اس کے گرد و نواح کی داستان ہے۔سارا ناول ایک طوائف کی زندگی پر استوار ہے۔'' (اردو ناول کا نگارخانہ، کے۔کے کھلر، ص۲۹)

مرزا رسوؔا کی ناول نگاری کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے کہانی چاہے جس سے بھی لی ہو لیکن اس کہانی کا انداز بیان پڑھنے والے کے دل و دماغ پر ایک انبساطی کیفیت طاری کر دیتا ہے۔

مرزا رسوؔا نے کئی ناول لکھے لیکن زندہ صرف 'امراؤ جان ادا' ہی رہا۔یہ ایک ایسی عورت کی خودنوشت سوانح ہے جس نے آوارگی میں زمانے کی سیر کی اور حالات کو مختلف انداز میں دیکھا۔طوائف کی زندگی کو موضوع بنا کر اس سے پہلے بھی ناول لکھے گئے لیکن اودھ کی محفلیں بیگماتی انداز بیان میں وہ محاورات جو یہاں استعمال ہوئے ہیں وہ بہت کم ہی کہیں نظر آتے ہیں۔اپنی انہیں خوبیوں کے تحت 'امراؤ جان ادا' کا ایک منفرد مقام ہے جو پڑھنے والوں کے دلوں پر ایک نقش چھوڑنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔علی عباس حسینی لکھتے ہیں:

''امراؤ جان ادا ایک ایسا ناول ہے جسے انہوں نے دل لگا کر لکھا اور اس طرح لکھا کہ وہ اردو ادب کے تاج میں کوہ نور بن کر ہمیشہ چمکے گا۔'' (اردو ناول کی تاریخ و تنقید، علی عباس حسینی، ص ۲۶۰)

اردو ناول نگاری کی تاریخ پر اگر مختصراً بھی نظر ڈالی جائے تو پریم چند ایک نام ہی نہیں بلکہ ایک عہد ہے اور انہوں نے اردو ناول نگاری کو وہ وقیع سرمایہ دیا ہے جو کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پریم چند ایسے ادیب ہیں جنہوں نے ادب میں انسان دوستی کی طرف قدم بڑھایا۔

پریم چند سے قبل ہمارا ادب کچھ مخصوص طبقے تک محدود تھا اور ادب کا دروازہ عام انسانوں کے لیے

بند تھا،لیکن پریم چند نے ادب کے میدان میں قدم رکھتے ہی اپنے افسانوں اور ناولوں کے ذریعہ ادب کا راستہ عام انسانوں کے لیے ہموار کیا اور اپنے ناولوں میں سب سے زیادہ ستائے ہوئے اور دبے کچلے طبقے کے کسانوں کو ابھارا۔کسانوں کے ماتھے پر شکن، ان کے کھیت کھلیانوں کی لہک، ان کی جھونپڑیوں کی بڑھتی ہوئی غربت سبھی کچھ ان کے ناولوں میں موجود ہے۔ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

''پریم چند ایسا ادیب ہے جس کا دل دردِ انسانیت سے اس طرح گداز معلوم پڑتا ہے کہ اس کی تحریروں کو پڑھ کر روح انسانی پگھل جاتی ہے۔پریم چند نے ہمیں کیا دیا؟ زندگی سمجھنے کی کوشش، سوچنے کا ایک پرسکون انداز، رفاقت اور انسانیت کا وہ احساس جو انسانی معاشرے کی اجتماعی زندگی کو بہشت بناتا ہے۔'' (مباحث، ڈاکٹر سید عبداللہ، ص ۲۹۸)

پریم چند کی زندگی میں دوست احباب کی کمی نہیں تھی۔ان کی دوستی کا دائرہ بہت وسیع تھا۔انہوں نے ملک و قوم، معاشرے اور ساری انسانیت کو خوشحال دیکھنے کا خواب دیکھا تھا۔پریم چند نے اپنے ناولوں کے ذریعہ لوگوں میں حب الوطنی کا جذبہ اجاگر کیا اور اپنی تصنیفات کے ذریعے برطانوی حکومت پر زبردست چوٹ کرتے رہے۔پریم چند کی حب الوطنی کے سلسلے میں ان کے افسانوں کا مجموعہ 'سوز وطن' بھی قابل ذکر ہے جس کا ہر لفظ وطن کی محبت سے سرشار ہے۔

سجاد ظہیر کا ناول 'لندن کی ایک رات' ناول کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔اسے صحیح معنوں میں ہم ناول نہیں کہہ سکتے اور اس کا اعتراف خود سجاد ظہیر نے کیا ہے۔یہ دراصل ایک طویل افسانہ ہے جو ان کے زمانہ طالب علمی کی یادگار ہے۔اگر دیکھا جائے تو شاید یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ اس ناول کا موضوع اس اعتبار سے بالکل نیا ہے کہ اس میں ان ہندوستانی طلبا کی ذہنی و جذباتی کشمکش کی عکاسی کی گئی ہے جو انگلستان بغرض تعلیم جاتے تھے اور انہیں وہاں مغربی تہذیب کے جگمگاتے ہوئے مناظر اور سرمایہ دارانہ نظام کے تضادوں سے بیک وقت سابقہ پڑتا ہے۔طلبا کے اس گروپ میں وہ بےفکرے بھی ہیں جن کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں اور جن کے مقالے ختم ہونے کا نام نہیں لیتے اور ناکام و نامراد واپس آنے کے لیے مجبور ہیں۔لیکن مصنف کو انداز بیان پر کافی قدرت حاصل ہے۔اس ناول کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر سجاد ظہیر اس صنف کی طرف توجہ کرتے تو یقیناً اردو ناول کے سرمائے میں قابل قدر اضافہ کر سکتے تھے۔

عصمت چغتائی کا ناولٹ 'ضدی' ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جو طبقاتی نظام میں محنت کی آزادی نہ پانے کی وجہ سے ضدی بن جاتا ہے اور اس کا انجام ایک دردناک موت ہوتی ہے۔یہ ناول خالص

جذباتیت اور رومانیت پر مبنی ہے۔عصمت کا سب سے اہم کارنامہ ان کا ناول 'ٹیڑھی لکیر' ہے۔ یہ ایک نفسیاتی ناول ہے۔اس میں زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل اور جزئیات کے ذریعہ نفسیاتی گرہوں کو کھولا ہے اور ساتھ ہی جن حقیقتوں کی عکاسی کی تھی وہ اس ناول میں ایک مکمل تصویر بن کر سامنے آئی ہے۔

نئے ادیبوں میں ناول کے فن پر سب سے زیادہ عبور عزیز احمد کو حاصل ہے۔ان کے ناول 'ہوس' اور 'مرمر اور خون' ہیں جو کہ زیادہ مقبولیت نہ حاصل کر پائے۔لیکن بعد کے تین ناول 'گریز'، 'ایسی بلندی ایسی پستی' اور 'آگ' ناول نگاری کے معیار پر پورے اترتے ہیں اور اپنے نظریات کو معاشرے کے سامنے بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

تقسیم ہند سے قبل نوجوان ادیبوں نے جتنے ناول لکھے وہ متوسط طبقے سے متعلق تھے۔تقسیم کے بعد فسادات کے موضوع پر رامانند ساگر کا ناول 'اور انسان مر گیا' کچھ دن تک ادیبوں میں بحث کا موضوع بنا رہا۔اس ناول میں ۱۹۴۷ء کے بعد ہونے والے فسادات اور اس میں انسانوں کی درندگی کی کامیاب عکاسی کی گئی ہے۔ ناول کے لیے جذباتیت کے بجائے سکون واعتدال اور خارجی زندگی میں ڈوب کر ابھرنے اور اس کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت بہت ضروری ہے۔ ہمارے ادب کی تمام اصناف میں ناول ہی ایک ایسی صنف ہے جس میں واقعات اور کرداروں کی آویزش کے ذریعہ تمام موضوعات کو سمیٹا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ۱۹۷۰ء کے بعد کے تمام ناول نگاروں نے فنی بصیرت کے ساتھ ان تمام موضوعات کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

☆☆☆

Dr. Firdaus Taqi
337/153 Hata Burhan Saheb,
Kazmain Road, Lucknow-3
Mob. 9335776544
E-Mail: shamsabbas1211@gmail.com

مرزا دبیرؔ کا فارسی نوحہ

یاسر عباس

شاعری زبان کی سب سے متاثر کن صورت ہے ۔ شاعری کے ذریعہ انسان اپنے جذبات واحساسات کو الفاظ کا جامہ پہنا کر اشعار کی شکل میں موتی کی طرح پرو کر پیش کرتا ہے جس سے سامعین متاثر ہوتے ہیں۔اگر وہ اشعار خوشی وانبساط کی وجہ سے لکھے گئے ہیں تو سامعین کے دلوں کو جوش وولولہ، راحت و سکون حاصل ہوتا ہے لیکن اگر ان اشعار کا موجب غم ہے تو شاعر کا انداز، اس کا سوز وگداز سامعین کے قلوب کو جھنجھوڑ دیتا ہے۔جس طرح قصیدہ ممدوح کی مدح سرائی، اس کی رضا حاصل کرنے کے لیے موزوں کیا جاتا ہے، غزل میں محبوب کے سراپے کی تعریف کی جاتی ہے۔اسی طرح غم والم بیان کرنے کے لیے بھی مخصوص اصناف سخن ہیں جن میں مرثیہ اور نوحہ پیش پیش ہیں۔

نوحہ یعنی بکا، گریہ، بین، آہ وزاری، مرنے والے کے صفات بیان کر کے آہ وزاری کرنا۔مرثیہ ہی کی طرح 'نوحہ' بھی حضرت محمد مصطفیؐ اور ان کی آل پاک پر گزری ہوئی مصیبتوں، ان کے غم وآلام بیان کر کے ان پر گریہ وبکا کرنے سے مخصوص ہوگئی ہے۔نوحہ ایک حزنیہ نظم ہے جس کی اولین شرط رثائیت ہے۔ نوحے میں اہل بیت اطہار علیہم السلام کے مصائب بیان کیے جاتے ہیں۔نوحہ نے بھی سلام ومرثیہ کے ساتھ ساتھ ترقی کی ہے۔نوحہ وسلام میں ہیئت کے اعتبار سے مماثلت ہے یعنی لفظی پیکر ونظمی ہیئت میں یکسانیت ہے۔لیکن اصل موضوع میں بہت فرق ہے۔یعنی سلام کا مطلع اور اس کے اکثر اشعار فضائل پر مشتمل ہوتے ہیں لیکن نوحے کا مطلع اور تمام اشعار بین وبکا سے پر ہوتے ہیں۔ جریدہ 'اشارہ' کے نوحہ نمبر میں سلام ونوحہ کے اس فرق کو ان الفاظ میں واضح کیا گیا ہے:

''ویسے تو نوحہ وسلام کا ظاہری رنگ وروپ بادی النظر میں یکساں دکھائی دیتا ہے اور دونوں میں مماثلت بھی پائی جاتی ہے مگر دراصل دونوں میں کافی فرق ہے اور اس

فرق کو نظر انداز کرنے والے کامیاب نوحہ گو نہیں کہے جا سکتے۔ سلام کا بیشتر مواد مدح پنجتن وشہدائے کربلا کے صبر وشجاعت وفضائل پر مشتمل ہوتا ہے۔ مگر نوحہ میں صرف کربلا میں ڈھائے گئے مظالم، اہلِ حرم کی بیکسی، اطفالِ حسینی کے درد وتڑپ اور امام حسین کی مظلومی کا المناک، غمناک، غم انگیز موثر بیان ہوتا ہے۔ نوحہ سادہ اور سہل الفاظ کا متقاضی ہوتا ہے۔ نوحہ کی زمین آسان وغمناک ہونا چاہیے۔ (۱)

نوحہ کے سلسلے میں ڈاکٹر سید رضا کاظم تقوی رقمطراز ہیں:

''کسی کی موت پر اس کے چاہنے والے، اس شخص کے مختلف اوصاف کا تذکرہ کرکے جو بین کرتے ہیں وہی نوحہ ہے۔ نوحہ کسی مرنے والے سے اظہارِ عقیدت کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ نوحہ اور مرثیہ اگرچہ ایک ہی مقصد کو پورا کرتے ہیں۔ دونوں ہی اصناف میں کسی مرنے والے کے اوصاف کا تذکرہ ہوتا ہے لیکن ان دونوں میں ایک واضح فرق یہ ہے کہ مرثیہ میدانِ جنگ میں لڑ کر جان دینے والے کا تذکرہ مکمل طور پر کرتا ہے جب کہ نوحہ میں اختصار ملحوظِ خاطر رہتا ہے۔ نوحوں کے لیے نہ تو بحریں معین ہیں اور نہ ردیف وقافیہ کی کوئی شرط۔ نوحے، سلام کے انداز میں کہے جاتے ہیں۔ ان میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ ہر نوحہ بینیہ ہو۔ نوحوں میں اگر بین نہ ہو تو وہ نوحہ کے بجائے سلام کی حد میں جاتے ہیں۔ (۲)

مرزا دبیرؔ نے جس طرح مراثی وسلام وافر مقدار میں کہے ہیں اسی طرح نوحہ جات کی بھی اچھی خاصی تعداد ہے۔ مرزا دبیرؔ کے سلام ونوحہ جات کے مطالعہ سے سلام ونوحہ کا فرق بھی بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ جریدہ 'اشارہ' میں سلام ونوحہ کے فرق کو کس خوبصورتی کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔

''مرزا دبیرؔ ومیر انیسؔ کے زمانے میں یہ رواج تھا کہ مرثیہ پڑھنے سے پہلے رباعی وسلام سنانا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ مرثیہ گو پہلے ایک رباعی پڑھ کر سامعین کے حسن ذوق کو ابھارتا پھر سلام پیش کرکے مجلس کو اپنے ساتھ لے کر مجمع کو گوش بر آواز بنا کر اپنے فن کا مظاہرہ کر دیتا۔ مجلس کے خاتمہ کے بعد نوحہ خوانی ہوتی تھی۔ اس طرح سلام کو ہم بارگاہِ ممدوح میں اذنِ دخول اور نوحہ کو رخصتی نامہ کہہ سکتے ہیں، کیونکہ اول الذکر میں سلامی ومجرئی کا استعمال عام تھا اور نوحہ میں الوداع وخدا حافظ کا۔ (۳)

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی تحریر فرماتے ہیں:

توریت میں مختلف انبیا کے نوحوں کا وجود اس صنفِ سخن کی قدامت کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔ (۴)

نوحہ کے متعلق مولانا مرتضیٰ کا بیان ہے:

''اردو ادب کی زندہ اصنافِ سخن غزل کے ہم دوش ایک مختصر المیہ منظومہ اور اہم صنف ہے جسے 'نوحہ' کہتے ہیں۔ 'نوحہ' عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں میت پر رونا، بین کرنا۔ نوحہ ومرثیہ میں یہی فرق تھا کہ اگر کوئی المیہ نظم فقط لکھی جائے یا عام طریقے سے پڑھی جائے تو مرثیہ اور اگر فریاد وبکا کے ساتھ مخصوص مجمع میں پڑھی جائے تو نوحہ۔ تکنیک، ہیئت، اسلوب، زبان وبیان، روح ومفہوم کے لحاظ سے دونوں میں کسی فرق کی نشاندہی مشکل ہے۔ (۵)

نوحہ کے بارے میں پروفیسر سید مہدی جعفر کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

''نوحے کے تخلیقی آغاز ہی سے اختصار کی شکل میں 'نوحیت' یعنی بین اور غم والم کا اثر انگیز برتاؤ مرثیے اور نوحے کے درمیان خطِ امتیاز کھینچتا ہے۔ یہی اس کی فنی جہت ہے۔ شاعر کا کمال اس نقطۂ عروج پر منحصر ہے کہ نوحہ سننے والے کا دل سنگین اور غمناک صورت گری سے تڑپ اٹھے۔ تخلیق کار کے لیے یہ جانکاہ کوشش انگلیوں کو خونِ دل میں ڈبو لینے کے مترادف ہے۔'' (۶)

نوحہ کی سب سے اہم خصوصیت جس پر آج تک کسی نے غور نہیں کیا وہ یہ ہے کہ یہ صرف عورتوں کے بین وبکا کا ترجمان ہے۔ (مرد کی زبانی نوحوں کے باوجود) اس کے تمام تر جذباتی اظہار جو شدتِ غم اور گریہ سے معمور ہیں وہ صرف عورتوں سے مخصوص ہیں۔ مرثیہ چاہے جناب عباس کے حال کا ہو یا جناب علی اکبر، یا جناب قاسم اور علی اصغر کی شہادت کا۔ اس میں امام حسینؑ کی زبانی جو بین ہیں وہ اس وقت تک ہیں جب تک شہدا کے لاشے مقتل میں ہیں۔ خیموں میں لاشوں کے پہنچنے کے بعد سارا بین وبکا زینب وکلثوم، بانو ولیلیٰ اور جناب سکینہ کی دردناک آوازوں میں ڈھل کر نوحہ بن جاتا ہے۔

مرثیہ پر تو محققین وناقدین نے توجہ کی ہے لیکن نوحہ کو وہ توجہ نہیں حاصل ہوئی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ نوحہ عموماً شہدائے کربلا اور مصائبِ اہلِ بیت پر نظم کیا جاتا ہے۔ کوکب قدر سجاد علی مرزا نے اپنی تصنیف 'واجد علی شاہ کی ادبی اور ثقافتی خدمت' کے صفحہ نمبر ۵۹۹ پر نوحہ کے حوالے سے اپنا نظریہ اس طرح تحریر کیا ہے:

''سلام اور نوحہ گوئی کو مرثیہ نگاری کی شق سمجھا جاتا ہے۔ عہدِ واجدی کے

مرثیہ نگاروں کو مرثیہ نگاری اتنی عزیز تھی کہ انہوں نے سلام اور نوحے کی طرف وہ توجہ نہ دی کہ زمین تنگ ہونے کی شکایت پیدا ہوجاتی۔ اس صنف میں غزل جیسی صناعی بھی معیوب تھی کیوں کہ سلام اور نوحے کا پر اثر اور دل نشیں ہونا اس کی جان ہے۔ سلام اور نوحے عموماً اثنا عشری عقیدے کے شاعر کہتے ہیں اور اس کے کہنے اور سننے میں ان پر ویسا ہی وجد طاری ہوتا ہے جیسا صوفیانہ کلام سے صوفی شعرا پر۔'' (۷)

نوحہ کے لیے کوئی خاص بحر، وزن، ہیئت نہیں ہے بلکہ نوحہ ہر ہیئت میں کہا گیا۔ مسدس، مخمس، مربع، ترکیب بند، ترجیع بند، مثلث اور مستزاد سبھی ہیئت میں نوحہ کہے گئے۔ خاص طور پر مستزاد میں نوحے لکھے گئے۔ آج بھی نوحہ گوئی کے لیے کوئی قید نہیں ہے، لیکن زیادہ تر غزل کی ہیئت میں نوحے لکھے گئے۔ چونکہ یہ آسان بھی ہے زود اثر بھی۔ غزل و نوحے میں مماثلت ہیئت کے علاوہ اس کے موضوع میں بھی ہے یعنی غزل میں غم دنیا، غم دوراں، غم جاناں بیان کیے جاتے ہیں اور نوحے میں غم کربلا، غم سید الشہدا علیہ السلام۔ مرزا دبیرؔ نے مرثیہ، سلام، رباعی و قطعات کی طرح نوحہ گوئی میں بھی کمال فن کا اظہار کیا ہے:

زینب و حال تباهش نگرید   گریۂ شام و پگاهش نگرید
سینه اش ز آتشِ غم یکسر سوخت   تا بزن شعله آهش نگرید

کسی بھی کلام کی مقبولیت میں اس کا مطلع سب سے زیادہ دخیل مانا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اگر مطلع ہی بے جان ہو تو سامعین کی توجہ مکمل طور پر نہیں ہو پاتی اور اگر مطلع جاندار ہو تو سامعین شروع ہی سے جڑے رہتے ہیں۔ خصوصاً نوحے کا مطلع جو ہر شعر پڑھنے کے بعد اکثر دہرایا جاتا ہے۔ اب اس نوحہ کا مطلع دیکھیے۔ مرزا دبیرؔ نے جو حسن تعلیل اس مطلع میں بیان کی ہے وہ قابل تقلید ہے۔ آسمانی شفق ایک قدرتی معاملہ ہے۔ کیونکہ جب سورج غروب ہوتا ہے تو اس کی شعاعیں آسمان کی جانب بلند ہوجاتی ہیں جس کی وجہ سے آسمان کا رنگ سرخ نظر آتا ہے۔ لیکن مرزا دبیرؔ نے آسمان کی اس سرخی کی الگ ہی علت بیان فرمائی۔ آپ فرماتے ہیں کہ زینب مضطر کے حال پر آسمان بھی بے حال ہے یعنی آسمان زینب کی حالت پر گریہ کناں ہے جس کی وجہ سے اس میں سرخی نظر آ رہی ہے۔ اس سرخی کا سبب غم حسینؑ میں اشک باری ہے۔

شدت گریہ سے اکثر آنسو سوکھ جاتے ہیں۔ جس کے بعد دم گھٹنے لگتا ہے جس کو خون کے آنسو سے تعبیر کیا جاتا ہے، جیسا کہ میر تقی میرؔ نے کہا ہے:

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا   لہو آتا ہے جب نہیں آتا

روتے روتے دم سوکھ گیا ہے۔ آنسو خشک ہو گئے ہیں۔ حالت یہ ہے کہ کوئی آہ کی چنگاری

شعلہ نہ بن جائے۔

حلقه چون داغ زده در ماتم   به عزا جامه سیاهش نگرید

غم حسین میں سیاہ لباس پہنا جاتا ہے۔ مرزا دبیرؔ نے اس کی علت یہ بیان کی ہے کہ شدت گریہ سے آنکھوں کے نیچے سیاہ داغ ہوجاتے ہیں۔ یہ سیاہ داغ غم و گریہ کی زیادتی کی علامت ہیں۔ اسی لیے سیاہ ملبوس پہننا بھی غم کی علامت ہے۔

پیش چشمش شده مذبوحِ حسین   حسرتِ دل به نگاهش نگرید

دنیا میں بہن بھائی کی محبت سب سے زیادہ پاک و پاکیزہ اور بے لوث مانی جاتی ہے۔ اس لیے اگر بھائی پر کوئی پریشانی آتی ہے تو بہن پریشان ہو اٹھتی ہے۔ اسے کسی کل چین نہیں ملتا۔ چھوٹی چھوٹی پریشانی میں بھائی کا ساتھ دینے والی بہن کے سامنے یا وہ بہن جو کبھی اپنے بھائی سے جدا نہ رہی ہو اس کے سامنے، اس کے بھائی کے گلے پر خنجر چلایا جائے، سرتن سے جدا کیا جائے تو بہن کس طرح برداشت کرے گی:

شاهٔ بر چهره پریشان زلفش   گرد مهِ ابرِسیاهش نگرید

نوحہ کے لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں شاعرانہ فن کاری نہیں ہوتی، ایسے افراد کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ مرزا دبیرؔ کے نوحوں کا مطالعہ کریں۔ ان کے تمام شک و شبہات رفع ہوجائیں گے۔ اب اسی شعر کو لے لیجیے۔ مقتل میں امام حسینؑ کے چہرے پر زلف پریشان کی کیا خوبصورت تشبیہ دی ہے۔ اس شعر میں غزل کا بھرپور رنگ موجود ہے۔ اس لیے کہ مرزا دبیر نے امام حسینؑ کے چہرے کو ماہ سے اور پریشان زلفوں کو ابر سیاہ سے تشبیہ دی ہے۔

تابزن در تتق ظلمتِ شام   شفق خون رُخِ ماهش نگرید

امام حسین کی شہادت کے بعد یزید کی تمام سازشیں و کاوشیں بے کار ہوگئیں اور دین اسلام کو بقائے دائمی حاصل ہوئی۔ اسی مفہوم کو مرزا دبیرؔ استعاراتی انداز میں بیان کرتے ہوئے مذکورہ شعر میں امام حسینؑ کے رخ انور کو چاند سے تشبیہ دی ہے اور آپ کے خون کے رنگ کو شفق سے تعبیر کیا ہے، یعنی آپ کے خون کے رنگ نے یزید کے سیاہ کارناموں کی سیاہی کو ختم کر دیا۔

بسرِ خاک بخون غلطیده   باهمه رفعت جاهش نگرید
هر که او بود پناهِ دو جهان   کس نکرد آه پناهش نگرید

نواسہ رسولؐ کا مرتبہ و مقام سب سے اعلیٰ ہے۔ اس کے بعد بھی ان کے ساتھ یہ ستم کیا گیا کہ آپ خاک پر خون میں ڈوبے ہوئے ہیں، جو دنیا والوں کے لیے بہترین پناہ ہے ہائے افسوس خود اسی کو پناہ نہ ملی۔

پاره پاره شده پیراهن تن   از کتان جامۀ ماهش نگرید

بدن کے زخموں کو کپڑوں کے ٹکڑوں سے تشبیہ دی ہے یعنی جس طرح کپڑے پھاڑ دیئے جائیں تو اس کا دھاگا اس کے کپڑے کا ریشہ ریشہ جدا ہو جاتا ہے ٹھیک اسی طرح مظلوم کربلا کا بدن پارہ پارہ ہو گیا ہے۔

چه بود باعثِ قتلِ معصوم   بی گناهیست گناهش نگرید

معصوم کو قتل کرنے کی وجہ کیا تھی؟ کیوں بے خطا کو تہ تیغ کیا؟ اس لیے کہ بے گناہ کو ستانا بھی تو ایک گناہ ہے، چہ جائے کہ اسے قتل کرنا۔ یہ تو اس سے بھی بڑھ کر گناہ ہے۔

ناظرِ مهدیِ هادیست دبیرؔ   چشم و ابرو سرِ راهش نگرید

انتظار کی کیفیت ایسی ہوتی ہے کہ پلکیں، نظریں، ذہن، دل، دھڑکن سب راہ کی جانب متوجہ رہتی ہیں۔ یعنی آنے والے کے انتظار میں راستے پہ نگاہیں گڑی رہتی ہیں۔ اسی لیے بھی نظریں راستے پر جمی ہوئی ہیں کیوں کہ وہ مہدی موعود کی منتظر ہیں۔

☆☆☆

حوالہ جات:

(۱) اشارہ (محرم نمبر)، ص ۱۵
(۲) ذاخر لکھنوی حیات اور شاعری، ڈاکٹر سید رضا کاظم تقوی، ص ۱۱۶
(۳) اشارہ (محرم نمبر)، ص ۱۳
(۴) دبستان دبیر، ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی، ص ۲۰
(۵) الواعظ (محرم نمبر) (مئی ۱۹۶۱ء)، مولانا مرتضیٰ، ص ۳۸
(۶) اشارہ (نوحہ نمبر)، پروفیسر سید مہدی جعفر، ص ۴۷
(۷) واجد علی شاہ کی ادبی اور ثقافتی خدمت، کوکب قدر سجاد علی مرزا، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، جولائی ستمبر ۱۹۹۵ء، ص ۵۹۹
(۸) کلیات میر تقی میرؔ، ج ۱، ص ۲۱۲

☆☆☆

Dr. Yasir Abbas
Dept. of Persian, JMI,
New Delhi-25, Mob. 8076492437
E-mail: yasirabbasgazi.yr@gmail.com

فارسی شاعری پر عربی شاعری کے اثرات اور اردو شعرا کی تقلید

سید حسن سردار

شعر میں اکثر و بیشتر یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ ایک شاعر جب اپنے ماقبل استاد شاعر کی تقلید کرتے ہوئے اس کے منکشف جوہر کو اپنی تخلیق میں اتارنا چاہتا ہے تو روح جوہر کو منتقل کرنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ جوہر ایک ایسی تاثیر ہے جو اپنے کمالات کے ساتھ وجود شاعر میں اترتا ہے۔ نہ وہ شاعر کے وجود سے جدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی دوسرے وجود میں اتارا جا سکتا ہے۔ اسی سلسلے میں استاد آیتی لکھتے ہیں: ''جوہر روح انسان کی مانند ہے جو ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل نہیں کی جا سکتی۔''

کسی بھی تخلیق کا وجود میں آنا دوسری تخلیقات کے لیے مایۂ تاثیر ہوتا ہے اور یہ تاثیر پذیری زمان و مکان کی قید و بند سے پاک ہوتی ہے۔ اگر شاعر اپنے حسی اور ذوقی جوہر کو تخلیقی شکل دیتا ہے تو اس پر علاقائی اور عصری تحولات کا اثر حتمی ہے مگر اسی جوہر سے متاثر ہو کر کسی اور زمانے اور علاقے کا شاعر جب ان عناصر کو اپنی تخلیق میں اتارتا ہے تو وہی عناصر ایک نئے احساس کے ساتھ دوبارہ جنم لیتے ہیں۔ اسی لیے ہر تخلیق اور شعر کے وجود میں آنے پر اس کے قبل اور بعد زمانے پر تحقیق کرنا ضروری قرار پاتا ہے۔

تخلیق کی خصوصیات میں سے ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ وہ قید و بند زمان و مکان سے بہت بلند و بالا ہوتی ہے اور تمام حدود کو توڑ کر ہر صاحب ذوق کو متاثر کرتی ہے۔ دیگر زبانوں کی مانند ہماری اردو زبان نے بھی اپنے سے قبل زبانوں کے جوہر سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے اور ان کے صنعتی اور فنی عناصر کو اپنے دامن میں منتقل کیا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے شعرا اور ادبا نے ان زبانوں کے فکری اور تخلیقی جواہر کو بھی ایک نئے انداز کے ساتھ اردو شائقین کے حضور پیش کیا ہے۔

جس طرح اردو کا دامن عربی اور فارسی کے الفاظ سے مالا مال ہے بالکل اسی طرح اس نے علوم فصاحت و بلاغت کے جواہر سے اپنے لباس کو مزین کیا ہے جو عربی اور فارسی کی راہ سے اردو میں داخل

ہوئے ہیں۔ اردو نے قوانین بیان و بدیع وعروض وغیرہ کو اور بہتر انداز سے نئی صورتیں عنایت کی ہیں۔ انہیں میں سے تشبیہ اور استعارہ بھی ہیں جو علم بیان کے اہم ستون سمجھے جاتے ہیں۔

تشبیہ: تشبیہ کے لغوی معنیٰ ہیں مشابہت دینا، ایک چیز کو دوسری چیز کے مانند ٹھہرانا۔ اصطلاح میں دو چیزوں کا کسی صفت میں ایک دوسرے کے شریک ہونے کو تشبیہ کہتے ہیں۔ مثال:

ہستی اپنی حباب کی سی ہے   یہ نمائش سراب کی سی ہے

فتح ایران کے بعد عربی ادب ایران کے ادب وثقافت اور تہذیب میں رچ بس گیا تھا۔ جس کے نتیجہ میں خود عربی ادب کا ایک بہت بڑا سرمایہ ایران میں ظہور پذیر ہوا۔ سیاسی اور دینی عوامل کے علاوہ عربی زبان نے فارسی شاعروں کی تخلیق کو بھی متاثر کیا۔ اسی وجہ سے فارسی شاعروں نے عربی شعرا کے ایجاد کردہ عناصر کو اپنے انداز میں منتقل کیا۔ اس بارے میں ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا لکھتے ہیں کہ" فارسی قصیدہ سرائی عربی شاعری کے زیر اثر آ گئی۔"

یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ جب ایک زبان کسی دوسری زبان میں نفوذ کرتی ہے تو ثانوی زبان کے فضلا واد با ممزوجی ادب کو پروان چڑھاتے ہیں۔ یہی بات عربی فارسی کے حوالے سے نظر آتی ہے مگر اردو اس سلسلہ میں ماسبق زبانوں سے آگے نکل جاتی ہے کیونکہ لسانیاتی میزان پر دیکھا جائے تو وہ عربی، فارسی اور ہندوستانی زبانوں کا استقبال کرتی نظر آتی ہے۔ اسی طرح جغرافیائی کسوٹی پر پرکھا جائے تو وہ برصغیر کے ساتھ ساتھ خراسان بزرگ اور عرب ممالک کے جغرافیائی کمالات و جمالات سے فیضیاب نظر آتی ہے۔

مقالہ حاضر میں ایسی سہ زبانی (عربی، فارسی اور اردو) مشترکہ تشبیہ اور استعارہ کی چند مثالوں کو پیش کیا گیا ہے جو سرزمین عرب سے چل کر خراسان بزرگ کے منازل طے کرتی ہوئی برصغیر میں سکونت پذیر ہوئیں۔ ڈاکٹر صفا کے بیان کے مطابق فارسی شاعروں نے عربی شعرا جیسے امرء القیس، حارث بن حلزا، عمرو بن کلثوم وغیرہ صاحبان معلقات سبعہ سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور تراجم کے ساتھ ساتھ ان کی زمین میں طبع آزمائی بھی کی۔ عربی، فارسی اور اردو کی مشترکہ تشبیہ کی مثالیں۔

لم تتلفع بفضل مئزرها   دعد ولم تسق دعد فی العلب

ترجمہ: دعد نے اپنے تن پوش سے خود کو پوشیدہ نہیں کیا اور نہ ہی چوپایوں کے کوزہ سے پانی پیا۔

دعد و رباب عرب کے روستائی عاشق و معشوق ہیں۔ ان کی عشقی داستان کا اہم پہلو یہ ہے کہ دعد و رباب دونوں صنف نازک سے تعلق رکھتے تھے۔ ابن ندیم نے اس داستان کو اپنی کتاب 'کتاب الرباب و

زوجہا اللذین تعاہدا' میں ذکر کیا ہے۔ دعد جو کہ ایک معروف قبیلہ سے تعلق رکھتی تھی، اس کے بارے میں مشہور ہے کہ تمام کبائر عرب نے اس سے ہزارہا گزارشیں کیں مگر اس نے ایک نہ سنی۔ اس کے اسی مزاج کو منعکس کرنے کے لیے یہ شعر زباں زد شعرا ہو گیا۔

فارسی:

ہر لحظہ خیرہ خیرہ برآرم ز عشق او   از سینہ نالہ نالہ چو دعد از غم رباب

ترجمہ: ہر لمحہ اس کے عشق سے خیرہ خیرہ ہوا جاتا ہے۔ میرے سینہ سے غم معشوق کی تڑپ ایسے نکل رہی ہے جیسے غم رباب میں دعد تڑپ رہی تھی۔

اردو:

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دم سماع   گروہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

معشوق کی زلفیں صرف اردو ہی میں نہیں بلکہ عربی و فارسی میں بھی ایک گرم موضوع رہی ہیں۔ اس کو شعرا نے طرح طرح سے موضوع سخن قرار دیا ہے۔ دراصل عشق معنوی دنیا سے رابطہ نہیں رکھتا، لہٰذا وہ کبھی بھی وضعی اور لفظی دنیا کا محتاج نہیں رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی چیز مختلف زبان کے شعرا کے یہاں طرح طرح سے ادا کی جاتی رہی ہے۔ البتہ اس بات سے ہرگز چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کہ اس میں تقلید شامل رہی ہے۔

عربی شعرا نے زلف کی عقرب سے تشبیہ دی ہے اور یہ تشبیہ فارسی کے راستے اردو میں داخل ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو زبان محبت اور عشق کا پیکر سمجھی جاتی ہے اور کیوں نہ ہو؟ جہاں ایک طرف یہ عربوں، اعشی، جریر، ابونواس اور فرزدق جیسے شعرا کی خیال آفرینیوں سے مالا مال ہے تو دوسری طرف حافظؔ، سعدیؔ اور مولانا روم وغیر کے عارفانہ مضامین سے مملو ہے۔ اگر عربی شعرا نے معشوق کے خدوخال سے لے کر قد و قامت کو موضوع سخن قرار دیا ہے تو فارسی شعرا نے بھی افکار کو اور وضاحت کے ساتھ پروان چڑھایا ہے۔ مگر بات منزل تکمیل تک پہنچے بغیر ادھوری رہ جاتی اگر اردو شعرا نے اس خلا کو پُر نہ کیا ہوتا۔ چند امثال پیش ہیں:

اردو:

ان زلفوں کے عقرب نے دل میرا ڈسا عزلتؔ
پیچھے پڑی ہے چوٹی اب مار کی باری ہے

اس تشبیہ کو سب سے پہلے ابن معتز نے استعمال کیا ہے۔

عربی:

ریم یتیه بحسنِ صورته　　　عبثَ الفتورُ بلحظِ مُقلته
و کأنّ عقرب صدغه وقفت　　　لمادنت من نار وجنته

ترجمہ: غزالی اپنی خوبصورت شکل پر مغرور ہے، بیمار عشق خوبصورت آنکھوں کو نوازتا تھا۔ کہتے ہیں جیسے ہی وہ نزدیک آتش ہوا تو اس نے اپنی عقرب نما زلفوں کو خوف سے پیچھے کھینچ لیا۔

فارسی:

عقرب سرِ زلف یار و ہمہ پیکر اوست　　　با این ہمہ کبر و ناز کاندر سر اوست
شیرین دہنی و شہد در شکر اوست　　　فرماندۂ روزگار فرمان بر اوست

ترجمہ: یہ عقرب کی طرح پیچیدہ زلفیں، اس پر چاند سا چاندنی پیکر (چاندنی چہرہ) اس کی مٹھاس میں نازنین کا حامل یہ چہرہ جس کے اندر شیرین دہن اور شہد ممزوج ہیں۔ اس حسن کے سامنے تو آج کا حاکم بھی محکوم نظر آتا ہے۔

منظوم ترجمہ:

عقرب سر زلف، چاند اسی کا حلقہ　　　شیریں سخنی میں شہد و شکر کے سوا
با این ہمہ کبر و ناز جو ہے اس کو　　　فرماندۂ روزگار اس کا بندہ

عربی شعرا نے زلف کی چوگان سے بھی تشبیہ دی ہے اور یہ فارسی اور اردو شاعری میں بھی بہت مقبول رہی۔ فارسی اور اردو کی مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

فارسی:

بہ زلف چوگان نازش ہمی کنی تو بدو　　　ندیدی آن گہ او را کہ زلف چوگان بود

ترجمہ: تو اپنی چوگان نما زلفوں پر نازاں ہے جب کہ تو نے اس کا وہ زمانہ نہیں دیکھا جب اس کی زلفیں چوگان نما تھیں۔

اردو:- میرؔ کہتے ہیں:

اپنا سر شوریدہ تو وقف خم چوگان ہے　　　آبوالہوس گر ذوق ہے، یہ گو ہے یہ میدان ہے

عربی و فارسی شعرا نے زلف کی جیم اور نون سے بھی تشبیہ دی ہے۔

عربی:- ابن معتز کہتے ہیں:

غلالة خدہٖ صبغت بورد　　　و نون الصدغ معجمة بخال

ترجمہ: اس کے چہرہ کی سرخی گویا ایسی ہے جیسے گلاب اتر آیا ہو۔ تل نے اسے برگ یا نون بنا دیا ہے۔

فارسی:- امیر معزی کہتے ہیں:

ہست زلف و دہن و قد تو ای سیم اندام　　　جیم و میم والف و قامت من ہست چو لام

ترجمہ: ای چاندنی پیکر (معشوق) تیری زلف، چہرہ اور قد مثل جیم، میم اور الف ہے جب کہ میرا بدن مانند لام ہے۔

اردو:- مغل حکومت کے آخری چراغ بہادر شاہ ظفر کہتے ہیں:

کہتا ہے کوئی جیم کوئی لام زلف کو　　　کہتا ہوں میں ظفر کہ مسطح ہے کاف زلف

اسی تشبیہ کو سراجؔ اورنگ آبادی نے اس انداز میں ادا کیا ہے:

صنم کی زلف کے حلقہ میں ہے جیوں جیم کا نقطہ
عجب ہے خوش نما اس عارض گلگوں پہ خال اس کا

جہاں تک چہرۂ معشوق کی بات کی جائے تو تینوں زبانوں میں اس کے متعلق لاتعداد تشبیہات موجود ہیں۔ کمال یہ ہے کہ ایسی تشبیہات کی تعداد بھی کم نہیں ہے جس کو ایک زبان سے دوسری نے قبول کیا ہے، مثلاً قمر، زہرہ اور عنبر سے تشبیہ وغیرہ۔ ہم یہاں پر اختصار کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے عربی، فارسی اور اردو کے شاعروں کی مشترکہ عنبر سے تشبیہ کو قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ عنبر ایک سفید قسم کا خوشبودار مادہ ہوتا ہے جو دریا میں پایا جاتا ہے۔ چوں کہ اکثر و بیشتر مچھلیاں اس کو نگل لیتی ہیں اس لیے ان کے شکم سے بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کو انگریزی میں Ambengis کہتے ہیں۔ عربی و فارسی شعرا نے چہرہ معشوق کے خط کو بارہا عنبر سے تشبیہ دیا ہے اور اردو شعرا نے اس کو بعینہ استعمال کیا ہے۔ چنانچہ فارسی اور اردو کی مثال پیش کی جاتی ہے۔

فارسی:- امیر معزی کہتے ہیں:

تا ہر دو عارضش خط عنبر فشان نوشت　　　پس کس کہ سر بر آن خط عنبر فشان نہاد

اردو:

کر کے شمیم زلف گزارا　　　پھیلاوے ہے عنبر سارا

اس میں کوئی شک نہیں کہ عربی ایک وسیع زبان ہے جو کسی بھی معنی و مفہوم کو لفظی تقاضے کے ساتھ معنوی تشنگی کو بھی سیراب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فتح عرب کے بعد فارسی شعرا نے عربی شعرا سے نہ فقط ایک بڑا لفظی خزانہ پایا بلکہ معانی و مفاہیم کے ایک بہت بڑے خزانے سے بھی

فیضیاب ہوئے۔ یہ تاثیر پذیری صرف ایران تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ سند و ہند کی سرزمین پر بھی اپنا جھنڈا لہراتی ہوئی نظر آتی ہے۔

☆☆☆

منابع و مآخذ

(۱) تاثیر شعر عربی بر تقابل شعر فارسی، مترجم سیروش شمیسا، صدای ساحر، تہران ۱۳۸۱ ش

(۲) تاریخ ادبیات ایران، جلد ۱، ذبیح اللہ صفا، تابش، تہران ۱۳۶۹ ش

(۳) تجلیات بہادر شاہ، جلد ۱، اردو شاعری ڈاٹ کام ۲۰۰۳ء

(۴) جواہر البلاغۃ فی المعانی والبیان والبدیع، جلد ۱، السید احمد الہاشمی، مکتبہ عصریہ، بیروت ۱۹۹۹ء

(۵) دیوان امیر معزیؔ، کتاب فروشی اسلامیہ، تہران ۱۳۱۸ ش

(۶) دیوان غالب، مطبع منشی نول کشور، لکھنو ۱۳۰۴ھ

(۷) دیوان محمد فلکی شیروانی، فیروزان، تہران

(۸) کلیات سراج، مرتب عبد القادر سروری، جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد ۱۹۴۰ء

(۹) کلیات میر، مطبع منشی نول کشور، لکھنو ۱۹۴۱ء

☆☆☆

Syed Hasan Sardar
Research Scholar, Dept. of Persian
JNU, New Delhi-110067
Mob. 9868326477
E-Mail: hasansardar110@gmail.com

جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد میں کشمیر میں فارسی ادب

مشتاق حسین

سرزمین کشمیر خطّۂ دل پذیر، مینو نظیر اور ایران صغیر کے نام سے مشہور ہے۔ یہ وادی جہاں ایک طرف اپنی دلکشی، رعنائی اور حسن و جمال کے سبب ہزاروں سیاحوں کو کشاں کشاں اپنی طرف کھینچتی ہے وہیں دوسری طرف اپنی تہذیب و ثقافت، تمدن اور علم و فن کی وجہ سے بھی ہمیشہ منفرد اور ممتاز رہی ہے۔ یہاں بہت سے حکمرانوں نے حکومت کے ساتھ علم و ادب کی سرپرستی بھی کی، ان میں شاہانِ مغل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اکبر نے خطۂ کشمیر کو ۱۵۸۶ء میں تسخیر کیا۔ چنانچہ مغل حکمرانوں اور امرا کو فارسی زبان و ادب سے جو قلبی لگاؤ اور شعر و سخن کا جو ذوق تھا اس کا نمایاں اثر کشمیر پر بھی پڑا۔ کشمیر کے فارسی علما و فضلا اور ادبا و شعرا کی سرپرستی ہونے لگی اور انہیں انعام و اکرام اور داد و دہش سے نوازا جانے لگا جس کے سبب باہر سے کئی سخن سرا وارِدِ کشمیر ہوئے اور اپنی زمزمہ آرائیوں سے کشمیر کی فضا کو مسحور کرنے لگے۔ اس طرح فارسی زبان و ادب کے لیے نئی راہیں ہموار ہوئیں اور اسے پھولنے پھلنے کا خوب موقع ملا۔ اکبر کے دور میں کشمیر میں فن خطاطی کو بھی بہت ترقی حاصل ہوئی۔ اس عہد کے خوش نویسوں میں ملا میر حسن اور محمد حسین 'زرین قلم' کی شہرت عروج پر تھی۔ اس عہد میں کشمیر میں کئی اعلیٰ پایہ کے علما و فضلا اور ادبا و شعرا موجود تھے، جن میں ملا محمد علی کشمیری، فطرتی کشمیری، شیخ احمد زاہد، ملا محمد امین گانی، امیر فتح اللہ شیرازی، ملا عبد الرشید بینوا، نور الدین عشائی، نجمی کشمیری، جمال الدین انجو، شاہ ابوالفتح کلو، ملا مرہمی اور ملا مظہری قابلِ ذکر ہیں۔

اکبر کے بعد عہدِ جہانگیر میں بھی علم و فن اور شعر و سخن نے ترقی کے مختلف مراحل طے کیے۔ جہانگیر چوں کہ خود بھی سخن سنج اور سخن فہم بادشاہ تھا اور تصنیف و تالیف سے بھی رغبت تھی، اس لیے اس نے علما و فضلا اور ادبا و شعرا کی ہمت افزائی اور قدردانی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اس کے ہمراہ دربار سے منسلک شعرا فیضیؔ، طالبؔ آملی اور عرفیؔ شیرازی جب وارِدِ کشمیر ہوئے تو ان کی زمزمہ آرائی سے یہاں کی

فضا گونج اٹھی۔ چنانچہ طالبؔ آملی نے کشمیر کے حسن و جمال اور رومان پرور آب و ہوا سے متاثر ہو کر ایک نظم کہی۔ جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

فیض پیالہ بخشد آب و ہوای کشمیر   از خشت خم نہادند گویا بنای کشمیر
کشمیر می ستانم از حق بہ جای جنت   اما نمی ستانم جنت بہ جای کشمیر
ہر کس پی تماشا کردند خوش فضایی   رضوان فضای جنت، طالبؔ فضای کشمیر

طالبؔ آملی کے ہمعصر شاعر عرفیؔ شیرازی نے کشمیر کی پُر کیف آب و ہوا سے متاثر ہو کر جو شعر کہا تھا، وہ زبان زدِ خلائق ہو گیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

ہر سوختہ جانی کہ بہ کشمیر درآید   گر مرغ کبابست کہ با بال و پر آید

ملا محمد امین مستغنیؔ کا شمار اکبر اور جہانگیر کے عہد کے شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی شاعرانہ استعداد کا تمام تذکرہ نگاروں نے اعتراف کیا ہے۔ لیکن افسوس کہ ان کے آثار میں صرف غزلوں کے کچھ اشعار اور چند رباعیات ہی دستیاب ہیں جو ان کی شاعرانہ عظمت کی مظہر ہیں۔ ایک رُباعی ملاحظہ ہو:

دردی کہ یافت دل بہ جنون است آشنا   آبی کہ ریخت دیدہ بہ خون است آشنا
برما مخند گریہ بنیاد چشم تو   فریاد ما بہ درد درون است آشنا

اس عہد کے ایک باکمال صوفی شاعر خواجہ حبیب اللہ حبّی ہیں۔ حبیؔ نے مولانا محمد حسین آفاقی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور عربی و فارسی کی متداولہ کتب کا درس لیا۔ بعدازاں میر محمد خلیفہ کے حلقۂ ارشاد میں داخل ہو کر علوم باطنی اور راہِ سلوک کی تعلیم پائی۔ کچھ عرصہ کے بعد شیخ یعقوب صرفی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کی راہنمائی میں ریاضت اور عبادت میں ہمہ تن مشغول ہو گئے۔ چنانچہ انہوں نے شیخ صرفی کو اپنا پیر طریقت اور روحانی پیشوا تسلیم کر لیا اور ان کے کشف و کرامات اور احوال و مقامات پر ایک منظوم تصنیف 'مقامات حضرت ایشان' کے نام سے تصنیف کی۔ علاوہ ازیں انہوں نے دو اور کتابیں 'راحت القلوب' اور 'تنبیہ القلوب' تصنیف کیں۔ حبیؔ صاحب دیوان شاعر ہیں، ان کا سارا کلام سوز و گداز اور جوش و جذبے سے لبریز ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ای کہ بہشت برین بی تو عذابم عذاب   آتش دوزخ ہمہ با تو گلابم گلاب
گرمی شوقت چہ کرد، نرمی ذوقت چہ کرد   دیدہ پر آبم پر آب، سینہ کبابم کباب

بابا نصیب الدین غازی عہدِ جہانگیر کے عالم بے بدل تھے۔ وہ 'ابوالفقرا' کی کنیت سے یاد کیے جاتے ہیں۔ مدرسہ ملا کمال و ملا جمال سے علوم ظاہری کے اکتساب کے بعد بابا داؤد خاکی کے ارادتمندوں

میں داخل ہو گئے اور ان سے خرقہ خلافت پایا۔ ان کا اہم کارنامہ 'نور نامہ' ہے، جو حضرت شیخ نور الدین ریشی کے حالات پر مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں وہ شعر و سخن کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ ان کے اشعار میں اخلاق و حکمت اور تصوف و عرفان کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

چہ بندی دل درین دنیا کہ روزی چند مہمانی   کہ ناگہ مرگ پیش آید، خوری آن دم پشیمانی
تیاری کن ز روزی آن کہ وقت مرگ در پیش است   چہ مغروری درین دنیا مگر مردن نمی دانی

ملا ذہنی اس عہد کے بے نظیر شاعر تھے۔ وہ ایک خود دار طبیعت کے مالک تھے۔ ملا ندیمی اور ملا فطرتی شعر و شاعری میں ان سے اصلاح لیتے تھے۔ مولف 'عرفات العاشقین' کے مطابق ذہنی نے دو سو اشعار پر مشتمل ایک ساقی نامہ بھی لکھا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے خلفائے اربعہ کی شان میں چار طویل قصیدے بھی کہے تھے۔ 'مخزن الغرایب' کے مصنف نے انہیں صاحبِ دیوان شاعر بتایا ہے مگر آج کل ان کا دیوان دستیاب نہیں ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں ان کی خودداری کا عکس جھلکتا نظر آتا ہے:

خرم دل از نسیم گلستان کس نیم   روشن نظر ز شمع شبستان کس نیم
دانشورم ز فیض ولی نکتہ دانِ خویش   طفل طبانچہ خوردِ دبستان کس نیم

اظہری کشمیری کا شمار اس عہد کے مقبول شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ آنکھوں کی بصارت سے محروم تھے۔ چنانچہ ملا شیدا جو شوخ طبیعت کے مالک تھے اکثر انہیں اپنے طنز و ظرافت کا نشانہ بناتے تھے۔ اظہری بھی مظہری کی طرح مکتب وقوع کے شاعر تھے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ای دل! چو بود عارضی، این عمر عزیز   زنہار کہ صرفش مکن الا بہ دو چیز
یا بہر نگاری کہ پسندیدہ بود   یا صحبت یاری کہ بود اہل تمیز

محمد ابراہیم طلوعی عہد جہانگیر کے اچھے فارسی گو شاعر تھے۔ مگر جس قدر و منزلت کے وہ مستحق تھے وہ انہیں نصیب نہ ہوئی۔ اس وجہ سے تمام زندگی آشفتہ حالی میں بسر ہوئی۔ کہتے ہیں کہ وہ صاحب دیوان شاعر تھے مگر سوائے چند اشعار کے ان کا تمام کلام مفقود ہو چکا ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں:

فلک بہ پاکی دامان ما قسم می خورد   کنون ز ننگ سگ از کوی ما گریزان است
خوشم کہ ہیچو طلوعی مرا بہ کعبۂ دل   زبان ز خواہش و دست از دعا گریزان است

اس عہد میں کشمیر میں ایک خاتون شاعرہ بزرگی بیگم بھی موجود تھی۔ صاحب 'مرأۃ الخیال' کے مطابق وہ ایک ڈومنی تھی۔ لیکن بعد میں اپنا پیشہ ترک کر کے گوشۂ عزلت اختیار کیا۔ وہ شعر و شاعری کا اچھا ذوق رکھتی تھی اور برجستہ اشعار کہنے پر بھی دسترس رکھتی تھی۔ حسبِ ذیل اشعار اس کے اعلیٰ ذوق اور استعداد کا ثبوت ہیں:

روزی کہ نہادیم درین دیر قدم را　　گفتیم صلاح است عرب را و عجم را

☆

موبہ مو در نالہ ام، گویی کہ استاد ازل　　رشتۂ جانم، بہ جای تار در طنبور بست

ملا قربی دماوندی جہانگیر کے ہمراہ کشمیر آئے اور اسی سرزمین کو اپنا وطن بنالیا۔ شعر و سخن کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ مصنف 'صحف ابراہیم' کے مطابق قربی حد درجہ کے جمال پرست تھے۔ چنانچہ جمال پرستی کا یہ عنصر ان کی شاعری میں بھی جھلکتا نظر آتا ہے۔ ذیل کی ایک رُباعی ملاحظہ ہو:

گریک شب دیگر ز تو دورم بینند　　ای وای کہ سخت نا صبورم بینند

دیدن نتوان مرا بہ نادیدن تو　　جز آن کہ بیایند، بہ گورم بینند

آخوند ملا حسین خباز عہدِ جہانگیر کے ایک جید عالمِ باعمل تھے۔ علم و دانش کا اکتساب خواجہ اسحاق قاری، خواجہ عبدالشہید نقش بندی اور خواجہ عبدالباقی نقش بندی سے کیا۔ شریعت کے بہت پابند تھے۔ علم تفسیر، حدیث اور فقہ میں کامل دسترس رکھتے تھے۔ تصنیف و تالیف سے بھی رغبت تھی۔ چنانچہ ایک کتاب 'ہدایت الاعمیٰ' اور ایک رسالہ 'کفایۃ الاعتقاد' اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ 'ہدایت الاعمیٰ' اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے ایسے صوفیوں کی پرزور مذمت کی ہے جو وجد و سماع اور رقص و غنا کے قائل ہیں۔ نثر کو رنگین بنانے کے لیے موقع و محل کی مناسبت سے اشعار بھی نظم کیے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب نظم و نثر کا ایک حسین مرقع ہے۔

اس عہد کے ایک نامور مورخ حیدر ملک چاڈورہ ہیں۔ جہانگیر نے انہیں 'رئیس الملک' اور 'چغتائی' کے خطاب سے نواز کر حاکم کشمیر مقرر کیا تھا۔ حیدر ملک کی مشہور تصنیف 'تاریخ کشمیر' ہے جو دو سال کی مدت کے بعد ۱۶۱۹ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس تاریخ میں ہندو راجاؤں کے ذکر میں اختصار برتا ہے۔ جب کہ شہمیری اور چک دور کے حالات و واقعات کا ذکر تفصیل سے کیا ہے اور بڑی غیر جانبداری اور باریک بینی سے کام لیا ہے۔ مذکورہ بالا علما و شعرا کے علاوہ اس عہد میں ملا جوہر ناتھ، مہدی مشہدی، مشتری اور خواجہ محمد پارسا وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

عہدِ جہانگیر کے بعد شاہجہاں کے عہد میں بھی کشمیر میں علم و فن اور شعر و سخن کی ترقی جاری رہی۔ عہدِ شاہجہاں تہذیبی، ثقافتی اور بالخصوص علمی و ادبی نقطۂ نظر سے درخشاں اور تابناک رہا ہے۔ عہد شاہجہاں میں ۱۶۳۲ء میں جب خواجہ ابوالحسن ناظم کشمیر مقرر ہوا تو احسن اس کا نائب بن کر وارد کشمیر ہوا۔ قبل ازیں کشمیر کے خوبصورت مناظر دیکھنے کی دیرینہ آرزو اس کے دل میں موجزن تھی جیسا کہ ایک شعر میں کہتا ہے:

نخل مراد باغ دکن خار محنت است　　دل آرزوی دیدن کشمیر می کند

اس عہد کا ایک معروف شاعر میر الٰہی تھا۔ وہ ایران کے ایک نجیب سادات خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ عربی و فارسی کا زبردست عالم تھا۔ عہدِ جہانگیر میں ہندوستان آیا اور دربار میں رسائی حاصل کی۔ جہانگیر کی وفات کے بعد جب شاہجہاں سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے ظفر خاں احسن کو گورنر کشمیر مقرر کیا۔ چنانچہ جب احسن کشمیر کے لیے روانہ ہوا تو میر الٰہی کو بھی اپنے ہمراہ کشمیر لے آیا۔ میر الٰہی نے بقیہ عمر کشمیر میں گزاری اور یہیں ۱۶۵۳ء میں اس کا انتقال ہوا۔ میر الٰہی صاحب دیوان تھا۔ اس کا دیوان غزلیات، قصائد، ترکیب بند، ترجیع بند، مثنوی، مراثی اور قطعات پر مشتمل ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

چشمت از ہر گردشی با یار عہدی تازہ بست　　خط مشکینت کتاب حسن را شیرازہ است

....

اسیر دام ترا تاب آرمیدن نیست　　کہ رسم مرغ گرفتار جز تپیدن نیست

اسی عہد میں حاجی محمد جان قدسی نے عمر کے آخری حصّہ میں ایران سے ہندوستان کی طرف مراجعت کی اور دربار شاہجہاں سے وابستہ ہوئے۔ شاہجہاں نے قدسی اور کلیم کو 'بادشاہ نامہ' منظوم کرنے کے لیے مقرر کیا۔ لیکن 'بادشاہ نامہ' کے پایۂ تکمیل تک پہنچنے سے پہلے ہی قدسی اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ قبل ازیں قدسی نے کشمیر کی تعریف میں ایک مثنوی لکھی جس میں کشمیر کی بہار اور وہاں کے اُبلتے چشموں، رِم جھم کرتی ندیوں، باغوں، کوہساروں، سبزہ زاروں، مرغزاروں اور دلکش وادیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

خوشا کشمیر و خاک پاک کشمیر　　کہ سر برزد بہشت از خاک کشمیر

چہ کشمیر آبروی ہفت کشور　　نگاہ از دیدن او تازہ و تر

چہ کشمیر آبروی باغ و بستان　　اسیر ہر نہالش صد گلستان

مرزا ابوطالب کلیمؔ عین جوانی میں وارد ہندوستان ہوا۔ کچھ عرصہ دکن میں مقیم رہا لیکن خاطر خواہ پذیرائی نہ ہوئی، گویا بادلِ نخواستہ واپس لوٹ گیا۔ باردوم ۱۶۲۱ء میں شاہان مغلیہ کی علم دوستی اور انعام و اکرام کی شہرت سن کر پھر ہندوستان چلا آیا۔ جہانگیر کی وفات کے بعد رفتہ رفتہ دربار شاہجہاں میں باریابی ہوئی۔ بعدازاں ملک الشعرا کے خطاب سے نوازا گیا۔ جب ظفر خان احسن ناظم کشمیر تھا تو شاہجہاں نے قدسی کے ساتھ کلیم کو بھی 'بادشاہ نامہ' نظم کرنے کے لیے مقرر کیا۔ کلیم نے ۱۰۶۱ھ میں کشمیر میں وفات پائی اور 'مزار الشعرا' میں پیوند خاک ہوا۔ کلیمؔ نے تمام اصناف سخن پر قلم اُٹھایا ہے۔ قصائد کثرت سے کہے ہیں۔ کئی مثنویاں لکھی ہیں۔ غزلوں کا دیوان الگ ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

میان غم گساران سوزم از غم　　چون آن ماہی کہ در دریا بسوزد

☆

وضع زمانہ قابل دیدن دوبارہ نیست　　رو پس نکرد ہر کہ ازین خاکداں گذشت

مولانا حیدر خصالی کا شمار اپنے عہد کے ممتاز علما و شعرا میں ہوتا تھا۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو ہندوستان کا رُخ کیا۔ پہلے عنایت خان کے ساتھ منسلک رہے پھر ظفر خان احسن سے وابستہ ہو کر کشمیر آئے۔ غزل اور مثنوی گوئی میں ان کو کمال حاصل تھا۔ مولانا حیدر خصالی بھی دیگر شعرا کی طرح کشمیر کی خوبصورتی، آب و ہوا کی دل آویزی اور حسین فضاؤں کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے کشمیر کے خوبصورت مناظر سے متاثر ہو کر ایک مثنوی کہی ہے جس کے دو اشعار ملاحظہ ہوں:

سحرگہ بلبلی می کرد تفسیر — ز سنبل آیتی در شان کشمیر
کہ ای جنّت بہ پیش قیمتت سہل — بیا کشمیر را دریاب نااہل

مرزا محمد قلی سلیم نے عہدِ شاہجہاں میں ایران سے ہندوستان کا رُخ کیا۔ دربار میں خاطر خواہ پذیرائی نہ ملی، اس لیے کافی عرصہ نواب اسلام خان کی ملازمت میں رہے۔ بعد ازاں ظفر خان احسن کے زمانہ گورنری میں وارد کشمیر ہوئے اور اس وادی کو اپنی آخری قیام گاہ بنالیا۔ سلیم نے یہیں ۱۶۴۶ء میں وفات پائی اور 'مزارالشعرا' میں آسودہ خاک ہوئے۔ سلیم کا شمار اس عہد کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ صاحب دیوان شاعر تھے۔ قصیدہ نگاری اور مثنوی گوئی کے علاوہ غزلیں بھی اچھی کہتے تھے۔ ان کی غزلوں میں ایک عاشق کی بے قراری، زبوں حالی، محبوب کے ناز و ادا اور ہجر و فراق جیسے مضامین کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

ملا طغرا مشہدی کا شمار فارسی کے بے مثل انشا پردازوں میں ہوتا ہے۔ ابتدا میں شہزادہ مراد بخش ناظم کشمیر کی صحبت میں رہے بعد ازاں جب ظفر خان احسن گورنر کشمیر مقرر ہوئے تو ان سے منسلک ہو گئے۔ ملا طغرا نے رینہ واری میں ۱۶۶۷ء میں وفات پائی اور 'مزارالشعرا' میں سپرد خاک ہوئے۔ ان کی شہرت کا سبب ان کے رقعات ہیں جو 'رسائل ملا طغرا' کے نام سے موسوم ہیں۔ کلاسیکی فارسی کا اہم کارنامہ مانے جاتے ہیں۔ رسائل کے علاوہ انہوں نے قصائد اور غزلیں بھی کہی ہیں۔ اپنی غزلوں میں ہندی الفاظ کا برمحل استعمال کر کے غزل میں رنگینی اور جدت پیدا کی ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دوش دیدم آتشین رخسارکی — شوخکی در دلبری طرارکی
سبزکی لعلش بہ سرخی رنگ بست — ہمچو طوطی شکرین گفتارکی
جاملی در دست و مینا در بغل — مستکی در کار خود ہشیارکی

ظفر خان احسن کے بیٹے عنایت اللہ خان آشنا کو ذوقِ سخن ورثے میں ملا تھا۔ شاعری کے علاوہ ایک اچھے انشا پرداز بھی تھے۔ چنانچہ انھیں شاہجہاں کے تیس سالہ واقعات کو ضبط تحریر میں لانے کے لیے مقرر کیا گیا۔ یہ کام انھوں نے بڑی خوش اسلوبی اور کامیابی سے مکمل کیا۔ محمد افضل سرخوش نے انشا پردازی

کے لحاظ سے آشنا کے 'شاہجہاں نامہ' کو عبدالحمید لاہوری کے 'شاہجہاں نامہ' سے بہتر بتایا ہے۔

آشنا صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان کا دیوان غزلیات، رُباعیات، قصائد، مراثی، ساقی نامہ اور ایک مثنوی پر مشتمل ہے۔ ان کے کلام میں بلند افکار و خیالات کی عکاسی ملتی ہے۔ معنی آفرینی، سخن سنجی اور مضمون بندی ان کی شاعری کا خاصہ ہیں۔

ملا محسن فانی کا شمار اس عہد کے ممتاز علما اور شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ بیک وقت عالم، شاعر اور فلسفی تھے۔ شہزادہ دارا شکوہ سے بھی قلبی لگاؤ تھا۔ محسن فانی جب کشمیر میں مقیم تھے تو ظفر خان احسن سے دوستانہ مراسم تھے۔ بعد میں رنجش پیدا ہو گئی اور فانی کشمیر کو خیر باد کہہ کر دہلی چلے آئے۔ قیام دہلی کے دوران جب کشمیر کی یاد آتی تو تڑپ اُٹھتے:

فانی از بخت سیاہت شدہ در ہند وطن — ورنہ جای تو بہ جز گوشہ کشمیر نبود

فانی نے ایک دیوان اور چار مثنویاں ('ناز و نیاز'، 'میخانہ'، 'مصدر الآثار' اور 'ہفت اختر') اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ دیوان ۳۸۷/ غزلیات اور ۱۶۵/ رُباعیات پر مشتمل ہے۔ صنف غزل میں فانیؔ ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ فانی کے شاگردوں میں ملا محمد طاہر غنی کو جو مقام و مرتبہ حاصل ہوا وہ کشمیر کے کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہ ہوا۔ غنی کے مخصوص انداز فکر نے کشمیر میں فارسی شاعری کے معیار کو اتنا بلند کر دیا کہ کشمیر کا شمار بھی فارسی ادب اور شاعری کے اہم مراکز میں ہونے لگا۔ غنی صاحبِ دیوان شاعر ہیں۔ ان کا مختصر دیوان قصائد، رباعیات اور غزلیات پر مشتمل ہے۔

اس عہد کا ایک شاعر ملا حسن فروغی ہے۔ غزل و مثنوی خوب کہتا تھا۔ وہ صاحب دیوان شاعر تھا۔ ۱۰۶۰ھ میں شاہجہاں کے دربار سے منسلک ہوا۔ ۱۰۶۱ھ میں شاہجہاں جب کشمیر آیا تو فروغی نے دو مثنویاں ایک 'در وصف شاہجہان آباد' اور دوسری 'در تعریف باغ حیات بخش' پیش کیں۔ بادشاہ سے انعام و اکرام پایا۔

ملا محمد صالح ندیم بھی اسی عہد کے شاعر ہیں۔ فی البدیہ اشعار کہنے میں قدرت رکھتے تھے۔ اپنے قصائد میں انھوں نے شاہجہاں اور دارا شکوہ کی مدح سرائی کی ہے۔ ندیم نے نعتیہ قصائد بھی کہے ہیں جن میں پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس کی توصیف، اسلام کی شان و شوکت اور اصحاب کبار کی عظمت بیان کر کے اپنے قصائد میں لذت و پاکیزگی پیدا کی ہے۔ انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں۔ ان کی غزلوں میں بیان کی لطافت، خیالات کی پاکیزگی اور احساسات کی باریکی موجود ہے۔ وہ عاشقانہ مضامین کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کرتے ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

افسردہ گشت برمژہ لختِ جگر مرا   غم در فتیلہ بود چراغم فرو نشست

اس عہد کے ایک نامور مورّخ محمد صادق کشمیری ہیں، جنہوں نے 'طبقات شاہجہانی' ۱۶۳۶ء کے قریب مرتب کی۔ 'طبقات شاہجہانی' دس طبقات میں منقسم ہے، جن میں تیمور، میران شاہ اور شاہ رخ، مرزا سلطان محمد اور الغ بیگ، ابوسعید، عمر شیخ، بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد کے مشاہیر کے حالات قلم بند کیے ہیں۔ ہر طبقہ کئی ابواب پر مشتمل ہے اور ہر عہد کے بزرگان دین، علما و فضلا اور اطبا و شعرا کے احوال و واقعات مندرج ہیں۔ مذکورہ بالا علما و شعرا کے علاوہ بہشتی، قاضی محمد عارف، مرزا جلالہ طباطبائی، نسبتی تھانیسری، میر معصوم، محمد زمان نافع، حضرت خواجہ خاوند محمود نقشبندی، خواجہ معین الدین اور ملا عبدالرزاق بانڈی وغیرہ کا شمار بھی اس عہد کے نامور علما و شعرا میں ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ عہد شاہجہاں میں کشمیر میں فارسی زبان و ادب نے ترقی کے مختلف مراحل طے کیے۔ اس عہد میں بیرون ممالک کے بلند مرتبہ شعرا جیسے طالب آملی، عرفی شیرازی، صائب تبریزی، میر الٰہی ہمدانی، محمد قلی سلیم، قدسی مشہدی، طغرا مشہدی اور ابوطالب کلیم وارد کشمیر ہوئے۔ یہاں کی پُرکیف اور دل آویز آب و ہوا اور دلکش مناظر نے ان کو اپنی آغوش میں ایسے لپیٹا کہ انھوں نے اسی سرزمین کو اپنا آخری مسکن بنایا اور یہیں وفات پا کر 'مزار الشعرا' میں سپرد خاک ہوئے۔ جہانگیر اور شاہجہاں نے تمام علما و فضلا اور ادبا و شعرا کو انعام و اکرام اور داد و دہش سے نوازا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان شعرا نے کشمیر کی پُرکیف فضا میں سکون سے فارسی زبان و ادب کی آبیاری کی۔ اس عہد میں ہر صنفِ سخن پر شعرا نے قلم اُٹھایا۔ بالخصوص مثنوی اور غزل گوئی کو اس عہد میں کافی ترقی نصیب ہوئی۔

☆☆☆

Mushtaque Husain
Research Scholar Dept. of Persian,
AMU, Aligarh, Mob. 9897116872
E-Mail: mushtaqnaik06@gmail.com

بدایوں کا ایک غیر مطبوعہ تذکرۂ صوفیہ

انوار صمدانی

دنیائے تصوف میں بدایوں کو قبۃ الاسلام کہا گیا ہے۔ اس شہر تصوف یا شہر پیراں کو یہ اعزاز، یہاں پر آرام فرمانے والے صوفیہ کرام اور صلحا و صالحات کی نسبت سے ہے۔ بدایوں کے بارے میں ہمارے راہنما شیخ کامل حضرت خواجہ امیر خسرو قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں:

ز بس کز مرقد اہل بصیرت چشمۂ نورست   بہ جائے سرمہ در دیدہ کشم خاک بداؤن را

مصحفی امروہوی نے کیا خوب کہا ہے:

قاتل تری گلی بھی بدایوں سے کم نہیں   ہر گھر میں جس کے ایک مزارِ شہید ہے

بدایوں کے ان صوفیہ و صالحات کے احوال مختلف تذکروں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ انہیں میں ایک تذکرہ 'طبقات الاولیاء فی مدینۃ الاولیاء المعروف بہ جامع بصیرین مع شرح باقیات الصالحات' ہے۔ 'مردانِ خدا' کے مرتب جناب ضیا علی خاں اشرفی صفحہ ۳۸، طبع دوم پر اس تذکرہ کے حوالے سے فرماتے ہیں: ''طبقات الاولیا شیخ سعد اللہ بصیر ملتانی کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔ ان کے بھائی شیخ کرامت اللہ بصیر نے اس کا تکملہ کیا تھا۔ اس لیے جامع بصیرین کے نام سے مشہور ہے۔''

ہم قدیم کتب و مخطوطات کی تلاش میں بھوپال گئے تھے۔ وہاں ایک وکیل (ایڈوکیٹ) صاحب کے پاس چند قلمی کتب تھیں۔ موصوف نے ہمارا اشتہار پڑھ کر ہمیں فون کیا اور یہ قلمی کتب ہمارے ہاتھ فروخت کر دیں، انھیں میں یہ تذکرہ بھی موجود تھا۔ جب ان کتب کو دیکھا تو یہ تذکرہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اور اندازہ ہوا کہ یہ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ اس وقت میرے والد گرامی ماہر نوادرات الحاج جناب توفیق احمد قادری چشتی مرحوم حیات سے تھے۔

'طبقات الاولیا' کے مصنف شیخ سعد الدین المتخلص بہ سعدؔ و بصیرؔ المتوفی ۱۲۲۱ھ ہیں۔ چنانچہ مولانا

سعد بصیر کے بارے میں ’طبقات الاولیا‘ کے ص ۹-۱۰ پر مولانا عبدالوالی ابن مولانا عبدالباقی نے جو تحریر کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ مولوی شیخ سعدالدین بصیر چشتی ملتانی نبیرۂ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی قرشی اسدی سہروردی قدس سرہ نے بہ عمر ۶۱ سال، ۱۱۶۰ھ میں یہ تذکرہ تحریر فرمایا۔ حضرت مولانا شاہ حسن چشتی فخری بدایونی صاحب ولایت سیوانی (المتوفی ۱۹ر صفر المظفر ۱۲۱۹ھ، دکن) کے مرید خاص تھے۔ آپ کے چند اوصاف ’تنبیہ المخلوق‘ کی چونویں فصل میں موجود ہیں۔

جناب مولوی عبدالوالی صاحب نے آپ کی تاریخ وفات پر آپ کے برادر صغیر شیخ کرامت اللہ بصیر ملتانی کا اسی مخطوطہ کے صفحہ ۲۰۷ر میں ایک قطعۂ تاریخ قلم بند کیا ہے۔

مرید حسن سعدِ دینِ بصیر   چو زین دہر بر رخ کشیدہ نقاب
سن وصل گفتا خرد صبح گاہ   ’’شدہ زیب برج حمل آفتاب‘‘

مولانا غلام شاہد المتخلص بہ فدا رئیس بدایوں ساکن محلہ سوتھہ نے آپ کی تاریخ وفات اس طرح لکھی ہے:

سعد دین شیخ جامع طبقات   رفت چون زین جہان بہ قرب ودود
فرق برکردہ ہاتف غیبی   ’ضَاعَفَ اللہُ اَجْرَہٗ‘ فرمود

مولوی عبدالوالی صاحب اس قطعہ کی شرح اس طرح کرتے ہیں:

’’ مولوی شیخ سعدالدین بصیر چشتی ملتانی بداؤنی متخلص بہ سعد از اولاد امجاد حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی سہروردی است کہ در بداؤن بہ محلہ سوتہ سکونت داشت۔ نشوونما و تعلیم و تربیت در بداؤن بود۔ مرید جدی مولوی شاہ حسن علی صدیقی حمیدی گنوری سبزواری بداؤنی چشتی است تغمدہ اللہ بغفرانہ۔ اخلاق درویشان و کمالات ایشان بہ حسب جبلت در ذات او مرکوز بود۔ در اوائل بہ زمرۂ سواران در دکن ملازم بود۔ و بہ لباس خاص مقید نبود، گاہ خرقہ مشائخ پوشیدی و گاہ لباس سپاہیانہ در بر کردی۔ ہم در آن ایام بہ توجہ خاص شیخ خود عارف و کامل و در عشق و محبت و حضور و استقامت یگانۂ عصر گردید۔ سفر ہا کرد و صحبت ہا اندوخت۔ و اشعار آبدار بہ زبان فارسی و ہندی می گفت۔ چنانچہ کتاب ’طبقات الاولیا‘ از تصانیف وی مشہور است کہ در سنہ ۱۱۶۰ھ ہزار و صد و شصت بہ عمر شصت و یک سال بہ ایمای پیر خود بہ منصۂ ظہور آورد۔ از آن بعد برادر عزیز وی مولوی شیخ کرامت اللہ بصیر قادری ملتانی بداؤنی در ۱۲۶۴ھ ہزار و دوصد و شصت و چہار در آن کتاب بعضی قطعات وفات معاصرین خود را منضم ساختہ بہ اسم تاریخی **’طبقات**

الاولیاء فی مدینۃ الاولیاء‘ موسوم ساخت۔ ہمین کتاب بہ ’جامع بصیرین‘ شہرت دارد۔

ہکذا فی ’نسیم الفردوس‘ مؤلفہ مولوی شیخ کرامت اللہ بصیر وفات شیخ سعدالدین بصیر ملتانی بہ قول مولف ’حقیقۃ الفقرا‘ ہفتد ہم رجب المرجب ۱۲۲۱ھ ہزار و دوصد و بست و یک ہجری در بداؤن بہ وقوع آمدہ، عمر صد و بست و دو یافت۔

قبر وی در سواد بداؤن جانب غرب بہ ملک گھورہ قریب زیارت حضرت احمد خیاط علیہ الرحمہ بہ گوشہ جنوب مغرب، بالای چبوترہ بہ شکل کوہان شتر بلند و پختہ است، بہ سمت پائین (در) تعویذ قبر تاریخ وفاتش در زبان عربی بہ خط طغرا کندہ است و در پہلوی شرقی برادر وی شیخ کرامت اللہ بصیر قادری آسودہ است۔ رحمۃ اللہ علیہما۔

فرق برکردہ ہاتف غیبی ای سر ہاتف کہ ہای ہوز است و دور کردہ از ضاعف اللہ اجرہ سال وفاتش اخذ کردہ است۔ ۱۲۲۱ = ۵ - ۱۲۲۶۔ فہو المراد۔‘‘

ترجمہ: مولوی شیخ سعدالدین بصیر چشتی ملتانی بدایونی المتخلص بہ سعدؔ، آپ حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی سہروردی بزرگ کی اولاد میں سے ہیں۔ آپ بدایوں کے محلہ سوتہ میں سکونت پذیر تھے۔ آپ کی نشوونما اور تعلیم و تربیت بدایوں میں ہی ہوئی تھی۔ شیخ سعدالدین مولوی شیخ شاہ حسن علی صدیقی حمیدی گنوری سبزواری بدایونی چشتی کے مرید خاص ہیں۔ اللہ آپ کو اپنی مغفرت سے نوازے۔ آپ میں اخلاق درویشاں اور کمالات صوفیہ حسب جبلت موجود تھے۔ آپ ابتدا میں دکن کی فوج میں ملازم تھے، نیز آپ کسی خاص لباس میں نہیں رہتے تھے۔ کبھی لباسِ صوفیہ میں ہوتے تو کبھی سپاہیانہ لباس میں رہتے تھے۔ انہیں دنوں آپ اپنے شیخ کی توجہ خاص کے طفیل اپنے وقت کے یگانۂ روزگار عارف و کامل اور عشق و محبت، حضور و استقامت میں یکتائے زمانہ بن گئے۔ آپ فارسی اور اردو زبان کے بہترین شاعر بھی تھے۔ لہٰذا آپ کی تصانیف میں سے ’طبقات الاولیا‘ مشہور زمانہ تصنیف ہے جس کو آپ نے ۱۱۶۰ھ میں اپنے پیر و مرشد (شیخ حسن علی چشتی) کے حکم پر تحریر فرمایا تھا۔ آپ کے بعد آپ کے عزیز بھائی مولوی شیخ کرامت اللہ بصیر قادری ملتانی بدایونی (۱۲۶۴ھ) نے اس کتاب میں اپنے معاصرین کے وفیاتی قطعات کا اضافہ کیا پھر اس کا نام ’طبقات الاولیاء فی مدینۃ الاولیاء‘ رکھا۔ یہ کتاب (تذکرہ) ’جامع بصیرین‘ کے نام سے مشہور ہے۔

جیسا کہ مولوی شیخ کرامت اللہ بصیر کی ’نسیم الفردوس‘ میں ہے کہ شیخ سعدالدین بصیر ملتانی کی وفات بقول مولف ’حقیقۃ الفقرا‘ (شیخ ظہیر الدین چشتی بدایونی) ۱۲۲۱ھ، بہ عمر ۱۲۰ سال، شہر بدایوں میں ہوئی۔ آپ کا مزار مبارک بدایوں کے باہری حصہ میں حضرت شیخ احمد خیاط کے قریب جنوب مغرب میں ان کے

قدموں میں چبوترے کے اوپر کوہان کی شکل میں بلند اور پختہ بنا ہوا ہے۔تعویذ قبر میں آپ کی تاریخ وفات عربی زبان میں بشکل طغرا کندہ ہے۔ نیز آپ کے شرقی پہلو میں آپ کے بھائی شیخ کرامت اللہ بصیر قادری بھی آرام فرما ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ سب پر رحمتیں نازل فرمائے۔’ضاعف اللہ اجرہ‘ سے ہاتف کی ’ہ‘ کو گرا کر شیخ سعدالدین بصیر کے وصال کی تاریخ برآمد ہوتی ہے۔(۵-۱۲۲۶=۱۲۲۱ھ)

حضرت شیخ سعدالدین سعدؔ نے اس تذکرہ کے لکھنے کا سبب یوں بیان کیا ہے کہ میں نے یہ تذکرہ اپنے پیر و مرشد شیخ حسن علی چشتی کے حکم سے لکھا اور میں نے اس تذکرہ کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ لہٰذا صفحہ ۸/ پر فرماتے ہیں:

شنیدم به تذکیرها این سخن — ز پیر خودم شیخ کامل حسنؔ
بفرمود کز عون خلاق دہر — بکن جمع احوال پیران شہر
سخن مشتمل گشت بر چار باب — طبق نوزده اند در چار باب
یکی در شہیدان جانباز را — که مورد شده پنج اعزاز را
دوم باب در سیرت سالکین — سوم در مجاذیب اہل یقین
چہارم در اند نسوات عارفات — که بودند نیکو فرشتہ صفات

یعنی میرے پیر و مرشد نے حکم دیا کہ اے سعد بصیر تو ایک کتاب بدایوں کے اولیا پر لکھ اور ان کے احوال و افعال جمع کر تا کہ آخرت میں تیرے لیے توشۂ نجات ثابت ہو۔ سعد بصیر آگے فرماتے ہیں کہ میں نے اس تذکرے کو چار ابواب اور ان کو انیس ذیلی ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب شہدائے کرام جو سید سالار مسعود غازی وغیرہ کے ساتھ بدایوں آئے اور یہیں آسودۂ خاک ہوئے، پر مشتمل ہے۔ دوسرا باب بدایوں کے صوفیۂ کرام کے احوال اور ان کی سیرت پر مشتمل ہے۔ تیسرا باب یہاں کے مجذوبوں پر مشتمل ہے۔ چوتھا باب یہاں پر آسودہ عارفات اور صالحات پر مشتمل ہے۔ اسی صفحہ پر اس تذکرہ کی تکمیل کرنے کی تاریخ مع دن و سنہ فرماتے ہیں:

بروزِ ہمایون، به وقت سه پہر — نہم ماہ ذیقعدہ در حص شہر
ز ہجری ہزار و صد و شصت بود — عروس سخن در جہان رو نمود

آگے فرماتے ہیں کہ میں نے یہ تذکرہ ۹/ ذیقعدہ ۱۱۶۰ھ بروز جمعہ بوقت سہ پہر بدایوں میں بیٹھ کر مکمل کیا۔ مذکورہ اشعار کی روشنی میں آپ ایک عمدہ اور استاد شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے ایک کتاب ’تنبیہ المخلوق‘ بھی لکھی تھی جو کمیاب ہے۔ اس کتاب کا تذکرہ زیر نظر تذکرہ (قلمی) کے صفحہ ۹/ پر موجود ہے۔

’طبقات الاولیاء فی مدینۃ الاولیاء‘ کو ’جامع بصیرین‘ بھی کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیخ سعد بصیر کے بعد آپ کے چھوٹے بھائی شیخ کرامت اللہ بصیر چشتی نے اس میں اضافے کیے اور اپنے وقت کے مشائخین کے حالات اس میں شامل کیے۔ چنانچہ اس کے صفحہ ۲۰۷/ پر شارح مولانا عبدالوالی نے لکھا ہے:

”آپ کے بعد آپ کے عزیز بھائی مولوی شیخ کرامت اللہ بصیر قادری ملتانی بدایونی نے ۱۲۶۴ھ میں معاصرین کے حالات شامل کیے اور اس کا تاریخی نام ’طبقات الاولیاء فی مدینۃ الاولیاء‘ رکھا۔ نیز اس تذکرے نے ’جامع بصیرین‘ نام سے شہرت پائی۔“

آپ دونوں بھائی بصیرؔ کے نام سے مشہور تھے۔ اس لیے انہیں ممکن ہے کہ لوگ بصیرین بھی کہتے ہوں۔ شیخ کرامت اللہ بصیرؔ نے ’نسیم الفردوس‘ نامی کتاب بھی تحریر فرمائی تھی۔ آپ کا مزار بھی آپ کے بڑے بھائی شیخ سعد بصیر کے قریب ہے۔ اس طرح مولوی شیخ کرامت اللہ بصیرؔ قادری نے اس کا تاریخی نام ’طبقات الاولیاء فی مدینۃ الاولیاء‘ رکھا، اس سے ۱۲۲۰ھ برآمد ہوتے ہیں۔ یعنی شیخ موصوف نے اصل کتاب میں یہ اضافے ۱۲۲۰ھ میں کیے۔

مولوی شیخ عبدالوالی کے والد حافظ مولوی شیخ عبدالباقی چشتی تھے اور شیخ حسن علی چشتی کے پوتے تھے۔ دیکھیے صفحہ ۲۰۱ سطر ۲۶ نسخہ ہذا قلمی۔ مولوی شیخ عبدالوالی کے بارے میں ’تذکرۂ علمائے ہندوستان‘ مرتب مولانا سید محمد حسین بدایونی (۱۹۱۸ء) تحقیق و تدوین ڈاکٹر خوشتر نورانی، مطبوعہ ۲۰۱۸ء کے صفحہ ۳۵۸/ پر رقمطراز ہیں:

”مولوی عبدالوالی بدایونی مولانا شاہ عبدالمجید بدایونی کے ارشد تلامذہ اور شاہ جمال اللہ چشتی رام پوری کے خلفائے مزاج سے ہوئے ہیں۔ آستانہ بوسی حضرات اولیائے کرام آپ کا روزانہ معمول تھا۔ کتاب ’باقیات الصالحات‘ میں اولیائے کرام کے حالات آپ نے جمع کیے ہیں۔ بتاریخ ۲۵/ ربیع الثانی ۱۳۰۳ھ [۳۱/ جنوری ۱۸۸۶ء] میں وفات پائی۔ آپ ’مورخِ بدایونی‘ کے نام سے مشہور تھے۔“

لہٰذا مولوی عبدالوالی نے اس کا نام ’طبقات الاولیاء فی مدینۃ الاولیاء مع شرح باقیات الصالحات المعروف بہ جامع بصیرین‘ رکھا۔ شیخ عبدالوالی چشتی بھی اپنے اجداد کی طرح تمام علوم پر کامل دسترس رکھتے تھے۔ آپ کا سب سے اہم کارنامہ مذکورہ نسخہ کی شرح و حاشیہ ہے۔ اس طرح آپ نے اس کی شرح لکھ کر دنیائے

تصوف بالخصوص صوفیہ کرام کے تذکرہ نگاروں پر احسان کیا ہے۔ 'مردانِ خدا' صفحہ ۳۸ر پر لکھا ہے: ''باقیات الصالحات مولوی عبدالوالی چشتی بدایونی کی لکھی ہوئی فارسی زبان کی ضخیم کتاب ہے جواب تک غیر مطبوعہ ہے۔''

شارح شیخ عبدالوالی چشتی نے اس شرح کو مختلف ابواب میں تقسیم کیا ہے، جس کی فہرست اس طرح ہے۔ اس تذکرے میں تقریباً چار سو سے زائد شہدا، صوفیہ، علما، فقہا، مجاذیب، عارفات، صالحات کا ذکر موجود ہے۔ اس مذکورہ تذکرہ میں صوفیہ کرام کے علاوہ بدایوں کے دیگر حالات اور وہاں کی قدیم عمارات وغیرہ کا بھی ذکر موجود ہے۔ بقول حاجی ضیاء القادری بدایونی:

تیری گرد راہ کے ذرے بھی مہر و ماہ ہیں   تجھ میں آسودہ ہزاروں اولیاء اللہ ہیں

(راقم الحروف نے اس تذکرے کی فہرست مکمل کی ہے، کیونکہ نسخۂ ہٰذا کے فہرست والے شروع میں دو صفحات کم ہیں۔)

فہرست مضامین:

احوال وکیفیت مخطوطہ طبقاتِ اولیاء..........

اس تذکرہ کو مختلف کاتبوں نے مختلف سنہ میں کتابت کیا ہے، اس کے شارح مولانا شیخ عبدالوالی ابن عبدالباقی ابن شیخ علی حسن چشتی فقری ہیں۔ چنانچہ اس کے صفحہ ۳۱۶ر پر آپ کے نواسے محمد یاسین لکھتے ہیں:

''نقل این نسخہ طبقات الاولیاء فی مدینۃ الاولیاء مشہور بہ جامع بصیرین مع
باقیات الصالحات اصل نسخہ قلمی محررہ نہم شوال المعظم ۱۳۰۲ھ ہزار و سہ صد و دو ہجری بہ خط
پدر مادرم مولوی عبدالوالی چشتی بدایونی (کردہ بود)۔''

آپ کے بعد یہ نسخہ ۱۳۳۰ھ میں محمد یاسین صاحب کے والد حکیم مفتی محمد شرف علی بن محمد ببر علی نے نقل کیا اور آپ نے نہ صرف نقل ہی کیا بلکہ جگہ جگہ اس نسخہ میں اپنے حواشی بھی لکھے ہیں۔ یاسین صاحب لکھتے ہیں:

''پدرم بہ تاریخ بست وہفتم ماہ رمضان المبارک ۱۳۳۰ھ ہزار و سہ صد و سی
ہجری بر آن فوائد مفیدہ اضافہ ہا نمودہ بود۔''

آخری کتابت مفتی مولوی محمد یاسین نے ۱۳۵۴ھ میں کی۔ چنانچہ مخطوطے کا ترقیمہ اس طرح ہے:

''بہ قلم کم ترین محمد یاسین بن حکیم مفتی محمد شرف علی بن مفتی ببر علی بن مفتی محمد
اسماعیل بن مفتی محمد اکرام علی شہید قاضی شہر صدیقی حمیدی گنوری سبزواری بداؤنی، بروز شنبہ

چہارم ماہ ربیع الثانی ۱۳۵۴ھ ہزار و سہ صد و پنجاہ و چہار ہجری، بر مکان خود، جوار مسجد اسماعیل، وقت صبح، بہ اتمام رسید۔''

محمد یاسین صاحب بدایوں میں مسجد اسماعیل کے قریب رہتے تھے اور اس مخطوطہ کی کتابت آپ نے بوقت صبح بدایوں میں مکمل کی۔ ترقیمہ کے بعد محمد یاسین صاحب نے اپنے دستخط بھی کیے ہیں۔

نام مخطوطہ : طبقات الاولیاء فی مدینۃ الاولیاء المعروف بہ جامع بصیرین مع شرح باقیات الصالحات (طبقات الاولیاء مع شرح)

مولف : مولوی شیخ سعدالدین چشتی بدایونی بصیرؔ (م: ۱۲۲۱ھ)

اضافہ کنندہ : شیخ کرامت اللہ قادری بدایونی بصیرؔ (م: ۱۲۶۴ھ)

شارح : شیخ مولوی عبدالوالی المتخلص بہ والیؔ

اضافہ ثانیہ : مفتی محمد شرف علی بن مفتی محمد ببر علی بدایونی

مکتوبہ : ۴ر ربیع الثانی بروز اتوار ۱۳۵۴ھ

کاتب : نواسۂ مولانا عبدالوالی چشتی بن مولانا عبدالباقی چشتی مفتی محمد یاسین ابن مفتی محمد شرف علی بدایونی

صفحات : ۳۱۶   **سائز کاغذ** : "32.5x20 (فل اسکیپ)

سائز متن : "28x16   **مسطر** : مختلف (۳۵-۳۸)

روشنائی : سیاہ   **زبان** : فارسی

خط : نستعلیق   **جائے دستیاب وخرید** : بھوپال

آغازِ مخطوطہ : یا فتاح، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کجا ما و شان ثنایش کجا   خدا را نداند کسی جز خدا
چہ یارا بہ نقش شدن ہم نفس   خدا قدردان رسول است و بس

اختتام مخطوطہ

سپردم بہ تو مایۂ خویش را   تو دانی حساب کم و بیش را

ونصلی علی حبیبہ واصحابہ واولیاء امتہ وعلماء ملتہ اجمعین۔

ترقیمہ

''نقل آن 'طبقات الاولیاء فی مدینۃ الاولیاء مشہور بہ جامع بصیرین مع شرح باقیات الصالحات' کہ

اصل نسخۂ قلمی محررہ نہم شوال المعظم ۱۳۰۲ھ ہزار و سہ و دو صد ہجری بہ خط پدرِ مادرم مولوی عبدالوالی چشتی بدایونی (کردہ بود و بعدہٗ) کہ پدرم بہ تاریخ بست و ہفتم ماہ رمضان المبارک ۱۳۳۰ھ ہزار و سہ صد و سی ہجری بر آن فواید مفیدہ تحریر نمودہ بود، بہ حیز تحریر آمدہ۔ بہ قلم کم ترین محمد یاسین بن حکیم مفتی محمد شرف علی بن مفتی ببر علی بن مفتی محمد اسماعیل بن مفتی محمد اکرام علی شہید قاضی شہر صدیقی حمیدی گنوری سبزواری بداؤنی، بہ روز شنبہ چہارم ماہ ربیع الثانی ۱۳۵۴ھ ہزار و سہ صد و پنجاہ و چہار ہجری، بر مکان خود، جوار مسجد اسماعیل، وقت صبح بہ اتمام رسید۔"

اس طرح یہ نسخہ نہ صرف صوفیہ، صلحا، علما، ادبا، مجذوبات، عارفات و صالحات کے تذکرے سے معمور ہے بلکہ بدایوں کے حوالے سے بیش بہا خزینہ ہے۔ میرے خیال میں بدایوں کے صوفیہ کرام کا شاید ہی کوئی دوسرا تذکرہ ہو کہ جس میں بدایوں شریف کے اس قدر لولو و مرجان موجود ہیں۔

ان شاء اللہ بہت جلد اس تذکرہ کا اردو ترجمہ منظر عام پر آئے گا۔ اللہ رب العالمین اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور صوفیہ کرام کے صدقہ میں میری مدد فرمائے۔ آمین۔ بعض مولفین کے نام دستیاب نہیں ہو سکے ہیں، اس لیے فہرست مآخذ میں قارئین مولفین کے نام درج فرما لیں اور راقم السطور کو بھی اطلاع دینے کی زحمت فرمائیں۔

☆☆☆

منابع و مآخذ:

۱۔ فہرست نسخہ ہای خطی فارسی کتاب خانہ رضا، رام پور، جلد دوم
۲۔ فہرست منشی نور کشور، مرتبین ڈاکٹر چندر شیکھر اور ڈاکٹر عبدالرشید
۳۔ مردانِ خدا، ضیا علی خاں اشرفی، طبع دوم، شوقین بک ڈپو، بدایوں
۴۔ تذکرہ علمائے ہند از مولانا رحمٰن علی، مترجم محمد ایوب قادری، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۱ء
۵۔ فہرست کتاب ہای فارسی چاپ سنگی و کمیاب، سید عارف نوشاہی، جلد اول، پاکستان ۱۹۸۶ء
۶۔ سہ ماہی فکر و تحقیق دہلی، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶ء، مضمون ڈاکٹر شمس بدایونی (بریلی)
۸۔ فارسی ادب بعہد اورنگ زیب، پروفیسر نورالحسن انصاری، تصحیح و اضافہ ڈاکٹر نرگس جہاں، دہلی ۲۰۰۶ء

☆☆☆

Anwar Samadani
C/O National Book Depot,
Bazar Guzri, Amroha, U. P- 244221
Mob. 9557441990
E-mail: anwar.sa@rediffmail.com

'ندوۃ العلما' ایک دبستان ادب

محمد مشرف خان

اردو زبان کی نشوونما، ترویج و ترقی اور علمی و ادبی حیثیت عطا کرنے میں مختلف تنظیموں، تحریکوں اور اداروں نے اہم کردار ادا کیا، ان میں علی گڑھ تحریک، ترقی پسند تحریک، فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج وغیرہ خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان تحریکوں میں ایک اہم تحریک، تحریک ندوۃ العلما بھی ہے۔ اس تحریک کی زیر نگرانی دارالعلوم ندوۃ العلما نے ایسے علما و فضلا پیدا کیے جنہوں نے علم و ادب، فکر و فن اور اردو زبان و ادب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اگرچہ اس تحریک کا مقصد ایسے علما پیدا کرنا تھا جو قدیم و جدید دونوں طبقوں کے درمیان اعتماد پیدا کر سکیں اور ملت اسلامیۂ ہند کی نشاۃ ثانیہ کے لیے اجتماعی جدوجہد کر سکیں۔

اس تحریک کے بنیاد گزاروں میں ایسے اہل علم اور یگانۂ روزگار شامل تھے جو نہ صرف زبان و ادب کی ترقی کے لیے کوشاں تھے بلکہ ادب کے میدان کے سرخیل بھی تھے۔ مولانا محمد علی مونگیری، علامہ شبلی نعمانی، حبیب الرحمن خاں شیروانی، مولانا لطف اللہ علی گڑھی، مولانا فاروق چریاکوٹی، سید سلیمان پھلواری، حکیم عبدالحئی وغیرہ اس تحریک کے بانیان میں شامل تھے۔ انھیں حضرات کی کوششوں کے نتیجہ میں ندوۃ العلما میں ایسے اہل زبان و قلم افراد تیار ہوئے جنہوں نے اپنی گراں قدر علمی خدمات کے ذریعہ ملتِ اسلامیۂ ہند کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا اور چمنستانِ ادب میں اپنے منفرد اسلوب سے ایسے خوش رنگ گل بوٹے کھلائے جن کی مہک ہمیشہ قائم و دائم رہے گی۔

تحریک ندوۃ العلما ایک علمی، دینی، فکری اور تربیتی تحریک تھی جس نے ہندوستانی مسلمانوں کی علمی زندگی میں خوشگوار اور دوررس اثرات مرتب کیے۔ یہ تحریک دراصل وقت کی آواز تھی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ملت اسلامیہ علمی، فکری، سیاسی، مذہبی، اور اقتصادی، ہر اعتبار سے زوال کی طرف بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

عربی مدارس جو کہ مذہبی اور تعلیمی اعتبار سے مسلمانوں کی قیادت کر رہے تھے، ان پر بھی ایک جمود طاری تھا۔ مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے، جدید چیلنجوں کا سامنا کرنے اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق ملت کی قیادت کی صلاحیت علمائے کرام سے ختم ہوتی جا رہی تھی۔ مسلمان آپس میں شیعہ، سنی، وہابی، بریلوی، دیوبندی، مقلّد اور غیر مقلّد کی بحثوں میں الجھ کر اپنی توانائی صرف کر رہے تھے۔ مناظرہ بازی کا بازار گرم تھا۔ مولانا اسحاق جلیس ندوی نے مدارس کی صورت حال کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

> عام عربی مدارس جو دین کے نمائندہ ادارے اور دین کے داعیوں کو ڈھالنے والے معمل تھے، ان کا تعلق تمدن و تہذیب کی لازوال قوت سے کمزور پڑ چکا تھا۔ جدید افکار و نظریات کی واقفیت کی روشنی یا ہوا تک کا وہاں گزر نہ تھا۔ وہ نصاب تعلیم جو صالح و موزوں ذہنی نشوونما میں معاون ثابت نہ ہو اس سے بننے والا ذہن و دماغ باہمی منافرت، فلسفیانہ مباحث، احتمال آفرینی اور فقہی اختلاف کی نذر ہو جاتا ہے۔ (تاریخ ندوۃ العلما، جلد اول، ص ۶۴)

اگرچہ یہ مدارس اپنے اسلاف کے طریقۂ فکر، طرز تعلیم اور کتاب و سنت پر پوری استقامت کے ساتھ کاربند تھے لیکن مغربی تہذیب کے عوام پر اثرات اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل پر توجہ بہت کم تھی اور نصاب تعلیم جو درس نظامی پر مشتمل تھا اور نئے انقلابات اور جدید چیلنجوں کا ساتھ دینے میں ناکام تھا اسے ناقابل تغیر سمجھا جاتا تھا۔ دوسری طرف سرسید کے مکتبۂ خیال کے لوگ تھے جو مغربی تہذیب اور مغربی کلچر کو ہی سب کچھ سمجھتے تھے۔ معاشرت، سیاست اور قومی زندگی میں ہر جگہ انگریزی کلچر اور انگریزی تہذیب کی نقالی کو ہی سب کچھ سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح ہندوستانی مسلمان قدیم و جدید دو طبقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ دونوں گروہ توازن اور اعتدال کے بجائے انتہاؤں کے سفر کی طرف گامزن تھے۔ اس قدیم و جدید کے سبب دونوں طبقوں میں خلیج دن بدن بڑھتی جا رہی تھی جو نفرت و انتشار تک پہنچ رہی تھی۔ انگریزوں کا تعصب اور ان کی مشنیریوں کی عیسائی بنانے کی مہم دوسرا بڑا داخلی چیلنج تھا۔ ایسے پر آشوب دور میں جب کہ دیوبند اور علی گڑھ کی اہم تحریکوں کو وجود میں آئے بالترتیب ۲۶ اور ۱۸ سال ہو چکے تھے، ۱۸۹۲ء میں مدرسہ فیض عام کانپور کے جلسۂ دستار بندی کے موقع پر تحریک ندوۃ العلما کی تجویز پیش کی گئی اور قیام عمل میں آیا۔

ہندوستان کی تاریخ میں ندوۃ العلما کا قیام پہلا ایسا واقعہ تھا جس میں مسلمانوں کی علمی پستی کو دور کرنے اور آپس کی فرقہ بندی کے بجائے رفع نزاعِ باہمی کے لیے مختلف مکاتب فکر کے علما ایک پلیٹ

فارم پر جمع ہوئے۔ علمائے دین، جدید تعلیم یافتہ حضرات کے ساتھ ساتھ مسلک حنفی اور اہلحدیث علما ایک ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہوئے اور ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں ہر سال اس کے کامیاب اجلاس ہوئے۔ ندوۃ العلما کے پہلے اجلاس عام میں شبلی نعمانی نے اس کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے خوابوں کے دارالعلوم کا خاکہ پیش کیا جو ۱۸۹۸ء میں ندوۃ العلما کی شکل میں لکھنو میں وجود میں آیا۔

شبلی جہاں دیدہ شخصیت کے مالک تھے اس لیے ایک ایسا دارالعلوم چاہتے تھے جہاں کے فارغین زمانے کے مذاق کے اعتبار سے ملت کی رہنمائی کر سکیں۔ وہ اپنے خوابوں کے دارالعلوم کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچتے ہیں:

> ''تمام ہندوستان میں ایسا خالص دینی مذہبی مدرسہ نہیں ہے جو بہ لحاظ وسعت و جامعیت مدرسہ اعظم کہلانے کا مستحق ہو، جس میں تمام علوم دینیہ کی تعلیم ایسے کمال درجہ تک دی جاتی ہو۔ جس میں ایسے لوگ تیار کیے جاتے ہوں جو مخالفین کے اعتراضات کا جواب آج کے مذاق کے موافق دے سکیں، جس میں حکومت کی موجودہ زبان بقدر ضرورت پڑھائی جاتی ہو، جس کی عمارت پر فضا اور عظیم الشان ہو، اس غرض کو پورا کرنے کے لیے لکھنو میں ندوۃ العلما کے دارالعلوم کا قیام کیا گیا۔'' (تاریخ ندوۃ العلما، جلد اول، ص ۱۰-۹)

ندوۃ العلما نے سب سے پہلے نصاب تعلیم کو بدلا اور ایک جامع اور متوازن نصاب تعلیم ترتیب دیا جو زمانے کی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ ابتدائی سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک مختلف ادبی مزاج اور ذوق کے مناسب ہو۔ جدید عربی علوم کی نئی کتابوں کو نصاب میں شامل کیا اور ان فرسودہ کتابوں کو جو منطق اور قدیم فلسفہ سے متعلق تھیں نصاب سے خارج کیا۔ انگریزی زبان، سیاسیات، معاشیات کو نصاب تعلیم میں شامل کیا۔ اس طرح ندوۃ العلما نے کتاب و سنت کا وسیع مطالعہ رکھنے والے روشن خیال، زمانہ کے نبض شناس، نابغۂ روزگار فضلا کی ایسی کھیپ تیار کی جنھوں نے ایک ایسی متوازن فکر پیش کی جس میں جدید و قدیم دونوں کے محاسن جمع تھے۔

جس طرح علی گڑھ تحریک ایک اصلاحی تحریک تھی جو ملت اسلامیہ ہند کو احساس کمتری سے نکال کر ترقی کی شاہ راہ پر لانے کے لیے وجود میں آئی تھی، لیکن اس کے نتیجہ میں زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کا بڑے پیمانے پر کام ہوا۔ اسی طرح ندوۃ العلما بھی ایک اصلاحی، تعلیمی اور تربیتی تحریک تھی جس کا تعلق دعوت سے بھی تھا اور سماجی زندگی سے بھی، لیکن اس تحریک سے اردو زبان و ادب کو بڑا فروغ ملا۔ ندوی فضلا کے

سنجیدہ اور علمی طرز و اسلوب کی وجہ سے ان کی تحریروں میں ایک خاص رنگ نمایاں ہوا جو دبستان ندوہ کا اسلوب کہلایا۔ اس طرح ندوۃ العلما کے ذریعہ ایک دبستان فکر اور دبستان ادب وجود میں آیا۔

ندوۃ العلما کے بنیادگزاروں اور اساطین میں وہ اہل قلم اور بیدار مغز علمائے کرام شامل رہے ہیں جو جامعیت کی مثال تھے اور خود مفکر، ادیب اور باکمال شاعر تھے۔ مولانا محمد علی مونگیری، شبلی نعمانی، حکیم عبدالحئی حسنی، مولانا ابوالکلام آزاد، حبیب الرحمٰن خان شیروانی، عبدالماجد دریابادی وغیرہ جیسے اہل قلم، ادیب وانشاپرداز ندوۃ العلما کے اساطین، بنیادگزاروں اور بہی خواہوں میں شامل ہیں۔ ان افراد کی فکر اور مساعی جمیلہ سے ندوۃ العلما میں ادبی ذوق وشوق نیز ادبی شعور اور تحقیقی مزاج پروان چڑھا۔

علامہ شبلی نعمانی ندوۃ العلما کے پہلے معتمد تعلیمات تھے۔ انھوں نے ندوۃ العلما میں تحقیقی ذوق کو پروان چڑھایا اور ندوی فضلا کی ایک ایسی ٹیم تیار کی جس نے ندوہ میں ایک مخصوص اسلوب اور تحقیقی مزاج عطا کیا۔ ان میں علامہ سید سلیمان ندوی اور عبدالسلام ندوی وغیرہ خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ آگے چل کر اسی ندوۃ العلما نے بڑے بڑے ادیب، انشاپرداز، محقق اور نقاد پیدا کیے جنھوں نے شبلی نعمانی کے تصورات اور خاکوں میں رنگ بھرا۔ ندوۃ العلما کے ادیبوں، انشاپردازوں اور اہل قلم حضرات کی ایک طویل فہرست ہے۔ ان میں سے جن افراد کو شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی ان میں سید سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی، عبدالسلام قدوائی ندوی، عبدالرزاق ملیح آبادی، رئیس جعفری ندوی، ریاست علی ندوی، عبدالقدوس ہاشمی ندوی، شاہ معین الدین ندوی، سید نجیب اشرف ندوی، عبدالباری ندوی، رشید اختر ندوی، مولانا کوثر ندوی، عبداللہ عباس ندوی، سید ابوالحسن علی ندوی، محسن عثمانی ندوی وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں جنھوں نے اپنی نگارشات سے اردو ادب کے دامن کو مالا مال کیا بلکہ اسے ایک نئی سمت و رفتار بھی عطا کی۔

فضلائے ندوہ نے نہ صرف انفرادی طور پر بڑی تعداد میں علمی اور ادبی کتابوں کا ذخیرہ تیار کیا بلکہ ندوۃ العلما کی زیر نگرانی ایسے ادارے وجود میں آئے جن کے ذریعہ ادب، صحافت، تاریخ، اسلامیات اور دوسرے موضوعات میں بڑی تعداد میں علمی اور تحقیقی کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں دارالمصنفین اعظم گڑھ، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنو، دار عرفات تکیہ کلاں رائے بریلی، پیام انسانیت فورم، رابطہ ادب اسلامی لکھنو وغیرہ خصوصی امتیاز رکھتے ہیں اور ادب کی ترویج واشاعت میں خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہاں کے علما و فضلا نے اپنے علمی کارناموں اور صالح فکر کے ذریعہ ملت اسلامیہ کی ترقی اور رہنمائی میں بڑا کردار ادا کیا۔

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کے الفاظ میں:

''اس (ندوہ) کے فرزندوں کی عملی مثال نے دوسرے رہ نوردوں کے لیے راہ عمل نمایاں کردی۔ فکر ونظر کے گوشے ہوں یا تقریر وتحریر کے میدان، تصنیف وتالیف کے ادارے ہوں یا درس وتدریس کی مسندیں، جلوت کے ہنگامے ہوں یا خلوت کے حلقے، اخبارات و رسائل کے مقالے ہوں یا ذکر وشغل کے مشغلے، سیاست کی پرخار وادیاں ہوں یا معیشت کی پر پیچ راہیں، ادب کے گیسوؤں کی آرائش ہو یا علم وحکمت کی غوّاصی، کون سا کام منتسبین ندوہ کے نام سے خالی ہے، کس میدان میں اس کے فیض یافتوں کے قدم نہیں پہنچے، کون سی وادی ان رہ نوردانِ شوق سے ناآشنا ہے اور ان کے نقش پا کی شوخی کس منزل پر پکار پکار کر یہ نہیں کہہ رہی ہے کہ ابھی گزر رہا ہے کوئی اس جگہ سے۔'' (ندوۃ العلما کا تخیل اور پیغام، عبدالسلام قدوائی ندوی، ص ۶)

ندوۃ العلما کے قیام کو ایک صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس عرصے میں ندوۃ العلما نے بڑے بڑے اہل قلم اور نابغۂ روزگار شخصیات کو جنم دیا جنھوں نے اپنے مخصوص اسلوب اور تحقیقی مزاج سے اپنی منفرد شناخت قائم کی جو دبستان ندوۃ العلما کا اسلوب کہلایا۔

Mohd. Musharraf Khan
Research Scholar Dept. of Urdu,
Banaras Hindu University, Varanasi,
Mob.No. 7599219973
Email, musharrafk355@gmail.com

ڈاکٹر شکیل اعظمی کی شاعری کا اجمالی تعارف

ظفرالاسلام

سرزمین مئو اپنے علمی، ادبی اور مذہبی ماحول کی وجہ سے ایک زمانے سے ممتاز حیثیت کی حامل ہے۔اس سرزمین پر ہر عہد میں علما، ادبا اور شعرا پیدا ہوئے ہیں۔بیسویں صدی کے نصف آخر کے ممتاز شعرا میں شکیل اعظمی اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۲/ستمبر ۱۹۴۲ء کو محلہ کریم الدین پور بکھی، پوسٹ گھوسی، ضلع اعظم گڑھ (موجودہ ضلع مئو) یوپی میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم مدرسہ شمس العلوم گھوسی اور اعلیٰ تعلیم جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ سے حاصل کی۔فراغت کے بعد علم طب کی طرف راغب ہوئے اور یونانی میڈیکل کالج الہ آباد سے ۱۹۶۴ء میں ایف ایم بی ایس کی تعلیم مکمل کی۔

بچپن سے ہی شعر وشاعری کا ذوق وشوق تھا۔۱۹۶۱ء میں پہلی نظم لکھ کر اس شوق کو مزید توانائی بخشی جو ہنوز جاری ہے۔پہلی غزل ماہنامہ 'بیسویں صدی' میں ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی۔زندگی کی تمام تر مصروفیات کے باوجود آپ کا شعری سفر تقریباً ۵۷ برس مکمل کر چکا ہے۔اب تک چار کتابیں 'گل قدس'، 'حرف ثنا'، 'آشوب آگہی' اور 'شعور نظر' شائع ہو چکی ہیں۔

نعتیہ مجموعہ 'گل قدس' کے نام سے ۲۰۱۰ء میں منظر عام پر آیا۔اس میں وہ حضور (ص) کی شان میں اپنی عقیدت ومحبت کا اظہار بڑے ہی والہانہ انداز میں کرتے ہیں۔اپنے نعتیہ کلام کو قرآن وحدیث کی روشنی میں کہنے کی کوشش کی ہے۔'حرف ثنا' (۲۰۱۰ء) بزرگانِ دین کی شان میں کہی گئی منقبتوں کا مجموعہ ہے۔ان میں امام حسینؑ، علامہ عبدالعزیز مرادآبادی، مولانا احمد رضا خاں اور شیخ عبدالقادر جیلانی کی شان میں منقبت شامل ہیں۔'آشوب آگہی' غزلوں اور دس نظموں کا مجموعہ ہے۔نظموں میں موضوعات کا کوئی خاص تنوع نہیں ملتا۔تمام موضوعات عصر حاضر کے مسائل سے متعلق ہیں۔زبان سہل، سادہ، سلیس اور عام فہم ہے۔راقم الحروف کا خیال ہے کہ یہ نظمیں ان کے ابتدائی دور میں لکھی گئی ہیں۔

شاعر عام طور پر حساس طبیعت کا مالک ہوتا ہے۔یہی کیفیت شکیل اعظمی کی بھی ہے۔وہ اپنے ماحول اور معاشرے سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔اس کا اندازہ ان کی نظموں کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ان نظموں میں خاص طور پر معاشرے کی خرابی، اخلاقی اقدار کی پامالی، سماج میں پھیلی ہوئی برائی، فسادات اور علم کی اہمیت جیسے مضامین ملتے ہیں۔ایک نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

فساد ہوگا نہ اب کوئی تفرقہ ہوگا   وطن کو مرکز امن و اماں بنائیں گے
کہیں زباں کو کہیں ذات اور مذہب کو   فساد و جنگ و جدل کا سبب بنائیں گے
وہی عوام جنھوں نے انھیں نوازا تھا   وہی عوام انھیں ٹھوکریں لگائیں گے

نظم 'حرف نصیحت' میں ردیف وقافیہ کا بھی التزام کیا گیا ہے۔اگر اس نظم سے عنوان حذف کر دیا جائے تو شناخت مشکل ہو جائے گی کہ نظم ہے یا غزل۔اس کے چند اشعار دیکھیے:

ہو نہ تم اہل تو پھر عزت و شہرت کیا ہے   ان چمکتے سے سرابوں کی حقیقت کیا ہے
خود ہی تم اچھا برا اپنا سمجھ سکتے ہو   پھر تمہارے لیے یہ حرف نصیحت کیا ہے
جب بڑے لوگوں کے ہیں ہاتھ تمہارے سر پر   پھر کسی چھوٹے کی کمزور حمایت کیا ہے
ہاں مگر پیش جب آئے گی عمل کی منزل   ہوگا اس وقت یہ احساس لیاقت کیا ہے
پھر کوئی کام نہ آئے گا بہ جز علم و ہنر   تب یہ سمجھو گے سہاروں کی حقیقت کیا ہے
اس لیے جھوٹے سہاروں کے عوض میرے عزیز   پڑھ کے محنت سے دکھا دو کہ فضیلت کیا ہے

نظم 'جشن غالب' میں شکیل اعظمی نے غالبؔ کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔لیکن غالبؔ کی زبان 'اردو' پر ہو رہے سوتیلے رویے سے وہ حیران ہیں۔شاعر نے اردو پر ہو رہے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی ہے کہ اگر غالبؔ سے محبت ہے تو اس کی زبان کے ساتھ سوتیلا برتاؤ کیوں ہے؟

فکر و فن کو دیا انداز نیا غالبؔ نے   رنگ و اسلوب کو بخشی ہے جلا غالبؔ نے
جس زباں سے ہوئی غالبؔ کو یہ عظمت حاصل   اس زباں کا ہے یہاں کون بتاؤ قاتل
کاش تم جشن کے ہنگامۂ بسیار کے ساتھ   نطق غالبؔ سے بھی پیش آتے ذرا پیار کے ساتھ

مئو کے جن شعرا نے غزل میں طبع آزمائی کی ہے ان میں ایک اہم نام شکیل اعظمی کا بھی ہے۔شاعری میں وہ اپنے معاشرے کی برائیوں کو موضوع بناتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ بیٹوں کے مقابلے بیٹیاں والدین کی زیادہ خدمت کرتی ہیں، اکثر بیٹے نافرمان ہو جاتے ہیں۔معاشرے میں پھیلی ہوئی برائی، آپسی رنجشیں، فسادات، سماجی ناآسودگی، رشتوں کا بکھراؤ اور والدین کی نافرمانی جیسے مضامین ان کی غزلوں میں

جا بجا پائے جاتے ہیں۔

شکیلؔ اعظمی جدیدیت سے متاثر تو نہیں ہیں لیکن ان کا تعلق جدیدیت کے عہد کے شعرا سے ضرور ہے۔ حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ جدیدیت کے قائل ہیں یا نہیں، لیکن ان کے ذریعہ پیش کیے جانے والے مضامین کو اپنی غزلوں میں ضرور پیش کیا ہے، مثلاً امیر و غریب کے درمیان کا فرق۔ وہ امیروں کی بے شرمی اور غریبوں کی بے بسی پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

خوش لباسوں کو تو آتی نہیں اس وقت بھی شرم — ان کے در پر جو کوئی ننگے بدن آتا ہے

......

جو آسماں کی بلندی پہ رہنے والے ہیں — انھیں غریبوں کی دھرتی سے پیار کیا ہوگا

......

نہ مل سکی ترے محلوں کو پھر بھی وہ عظمت — جو شان آج بھی اجڑی حویلیوں میں ہے

وہ خواب اور حقیقت کے فرق کو واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ لوگوں کو ایسے ہی خواب دیکھنا چاہیے جن کا حقیقت ہونا ممکن ہو۔ حسین خوابوں کا انجام ہمیشہ دردناک اور غیر مناسب ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ خوابوں کی وادی سے نکل کر حقیقت کے صحرا میں زندگی گزارنے کی عادت ڈالیں:

جن کی تعبیر بہ جز رنج و الم کچھ بھی نہیں — ایسے خوابوں کو تو پلکوں پہ سجاتا کیوں ہے؟

......

خوابوں کی طرب خیز فضاؤں سے نکل کر — حالات کے تپتے ہوئے صحرا میں کھڑا ہوں

خدمت خلق اللہ رب العزت کے نزدیک پسندیدہ عمل ہے۔ زمانۂ قدیم میں لوگوں میں اس کا جذبہ زیادہ تھا۔ مثلاً کنواں کھدوانا، مسجد بنوانا، درخت لگانا، مسافروں کو کھانا کھلانا اور راہ میں چراغ روشن کرنا تاکہ مسافروں کو راستہ چلنے میں سہولت ہو۔ موجودہ زمانے میں یہ جذبے تقریباً ختم ہو چکے ہیں۔ آج ہر شخص کو صرف اپنی ذات سے سروکار ہے۔ شکیلؔ اعظمی چوں کہ پرانی قدروں کے شاعر ہیں، لہٰذا اب بھی پرانی اقدار کو برقرار رکھنے کی نصیحت کرتے ہیں:

بھٹک نہ جائے مسافر کہیں اندھیرے میں — چراغ کوئی سرِ رہ گزر جلاتے رہو

......

شکیلؔ اس کو مرادوں کی رات مل جائے — چراغ جس نے سرِ رہ گزر جلایا ہے

اردو کے قدیم شاعروں کی مانند شکیل اعظمی نے بھی اپنی غزلوں میں شاعرانہ تعلّی سے کام لیا ہے۔ انھیں اپنی غزلوں پہ ناز ہے۔ اپنے ایک شعر میں یوں کہتے ہیں کہ مجھے تعارف کی ضرورت نہیں کیوں کہ میرا طرز بیان ہی میری شناخت ہے:

شکیلؔ خون جگر دے کے اپنی غزلوں کو — میں حرف حرف میں سوز حیات بھرتا ہوں

......

مجھے کسی کے تعارف کی کیا ضرورت ہے — مری شناخت کو کافی ہے میرا طرزِ بیاں

ان کی شاعری میں حب الوطنی کے موضوعات بھی ملتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وطن کی اہمیت کا اندازہ لگانا ہے تو ان سے پوچھو جو غیر ممالک میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ انھیں غریب الوطن کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ شہر اور گاؤں کے درمیان کے فرق کو شعری جامہ پہنایا ہے۔ ان کے نزدیک گاؤں کے حالات آج بھی شہروں کے مقابلے کافی بہتر ہیں۔ حالاں کہ اب شہروں کی وبائیں گاؤں میں بھی آنے لگی ہیں جس کا انھیں دکھ ہے۔

تم اپنے شہروں کی سڑکوں پہ ڈھونڈتے کیا ہو
حیا کا رنگ تو گاؤں کی لڑکیوں میں ہے
نہ پاسکو گے کبھی جگمگاتے شہروں میں
دلوں کا نور تو تاریک بستیوں میں ہے

شکیل اعظمی کی شاعری کے مجموعی مطالعے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے یہاں مضامین کا تنوع ہے۔ عمدہ، کامیاب اور نئے نئے مضامین کو اپنی شاعری میں جگہ دیتے ہیں۔ زبان سادہ اور سلیس استعمال کرتے ہیں۔

☆☆☆

Zafrul Islam
Mob. 9336239933
E-Mail: zafar.ghosi@gmail.com

گیان چند جین بحیثیت محقق

معین عارف

پروفیسر گیان چند جین اردو کے بڑے محقق، بلند پایہ استاد اور ماہر لسانیات ہیں۔ انھوں نے اردو میں متعدد کتابیں لکھی ہیں جو حوالے کی کتابوں کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ گیان چند جین اپنے وسیع علم اور گہری نظر کی وجہ سے ساری اردو دنیا میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ انھوں نے اردو زبان و ادب کے ایسے ایسے پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے جن پر ان سے پہلے کسی کی نظر نہیں پڑی تھی۔ تحقیق غالب اور تحقیق اقبال ان کے خاص موضوعات ہیں۔ انھوں نے ایک طرف غالبؔ کے منسوخ کلام کی شرح 'تفسیر غالب' کے نام سے لکھی تو دوسری طرف علامہ اقبال کے ابتدائی کلام کو ریزہ ریزہ جمع کر کے 'ابتدائی کلام اقبال بہ ترتیب سال ۱۹۰۸ء تک' کے نام سے شائع کیا۔ 'اردو کی نثری داستانیں' اور 'اردو مثنوی شمالی ہند میں' وہ کتابیں ہیں جو جدید تحقیق میں کلاسیکس کا درجہ اختیار کر گئی ہیں۔ 'تحقیق کا فن' گیان چند کی وہ قابل قدر تصنیف ہے جس میں فن تحقیق کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔

گیان چند جین کو تحقیق میں اپنی راہ آپ تراشنی پڑی تھی۔ تحقیق میں گیان چند کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ بڑے ناموں سے محقق کو مرعوب نہیں ہونا چاہیے۔ اگر تحقیق کے دوران کسی کم معروف محقق کو ایسی معلومات دریافت ہوئی ہیں جن سے کسی بلند پایہ محقق کے معروضات اور تحقیقی نتائج رد ہوتے ہیں تو محقق کو چاہیے کہ وہ مشرقی روایات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس کی غلطیوں کی نشاندہی کرے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''کسی کے بڑے نام سے مرعوب ہو کر غلطیوں کی نشاندہی سے نہ چوکیے۔
> حقیقت کے اعلان میں بے باکی اور بے خوفی (لیکن دریدہ دہنی نہیں) ہونی چاہیے۔''

گیان چند جین اس خیال کے حامل ہیں کہ اگر محقق کسی کی غلطی یا کسی تسامح سے صرف نظر کر کے سکوت اختیار کرے تو یہ ادب کے حق میں نقصان دہ ہوگا اور آنے والی نسلیں باطل کو حق تصور کرنے

لگیں گی۔ اس لیے غلطیوں کی نشاندہی ضروری ہے اور انہیں آشکار کرنا ادب کی خدمت ہے۔ چنانچہ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''کسی غلطی پر سکوت اختیار کرنا اس غلطی کی اشاعت میں اعانت کے مترادف ہے۔''

گیان چند جین کا خیال ہے کہ تحقیق کے لیے طبعی مناسبت ضروری ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کلیم الدین احمد کی مثال پیش کی ہے جنہوں نے شورش اور عشقی کے تذکروں کو خلط ملط کر کے شائع کر دیا ہے۔ کلیم الدین احمد نے بقول گیان چند جین:

> ''تذکروں کی ترتیب کا کوئی مطالعہ پورا نہیں کیا ہے۔''

گیان چند جین کا خیال ہے کہ تحقیق ایک مشکل فن اور ایک دقت طلب کام ہے، اس لیے اس کی طرف وہی لوگ متوجہ ہوں جو اس سے سچی دلچسپی رکھتے ہوں اور جن میں تحقیق کا حقیقی ذوق موجود ہو۔ اگر محض ڈگری حاصل کرنے کے لیے کوئی تحقیقی کام کیا جائے تو اس سے ادب کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ اپنی تصانیف کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لیے سرسری طور پر تحقیق کرنا مناسب نہیں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ادیب کو اپنی صلاحیتوں کا اندازہ کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں خود احتسابی ضروری ہے اور خود ادیب کو اپنے بارے میں یہ اندازہ لگانا چاہیے کہ اسے کس صنف یا ادبی میدان میں کامیابی مل سکتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''اپنی صلاحیتوں کا اندازہ کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر زور پہلے تین راہوں میں بھٹکے، افسانہ نگاری، تنقید اور لسانیات۔ بعد میں اپنی اصلی لائن دکنیات کی تحقیق و تدوین پر آئے۔''

گیان چند جین نے تحقیق میں حزم و احتیاط کی اہمیت پر اپنے اکثر تحقیقی مضامین میں روشنی ڈالی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ تحقیق میں محقق کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہونا چاہیے تاکہ وہ حزم و احتیاط سے کسی وقت غافل نہ رہے۔ ترتیب متن سے بحث کرتے ہوئے انھوں نے اس تحقیقی عمل کی دشواریوں کا تذکرہ کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ مرتب کی چھوٹی سی غلطی بھی اس سلسلے میں روا نہیں رکھی جا سکتی۔ 'ذکر و فکر' میں متنی تحقیق کے مسائل کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

> ''تحقیق متن کی دنیا سیمیا کی سی نمود ہے جہاں قدم قدم پر ادبی فریب بہروپ بھر کر سامنے آتے ہیں۔ متن کے محقق کو دھوکے کی ٹٹیاں توڑ کر حقیقت کو برآمد کرنا پڑتا ہے۔''

۱۹۹۰ء میں گیان چند جین کا تحقیق کے موضوع پر مستقل کارنامہ 'تحقیق کا فن' منظر عام پر آیا۔ اس کے علاوہ بھی وہ تسلسل کے ساتھ تحقیقی مضامین لکھتے رہے جن میں ایسے اشارے موجود ہیں جو گیان چند جین کے ادبی تصورات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

گیان چند نے اپنے مضمون 'ہندوستان میں اردو تحقیق کی رفتار' مشمولہ 'تجزیے' میں لکھتے ہیں کہ تدوین متن آسان نہیں۔ مرتب متن کو مختلف معلومات فراہم کرنی پڑتی ہے اور مختلف مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ قرأت، نسخوں کا مقابلہ، اختلافاتِ نسخ کی نشاندہی، تحشیہ تیار کرنا، شاعر یا مصنف کے حالات زندگی اور تصانیف کا جائزہ لینا بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ کلاسیکی متن کی ترتیب میں لکھتے ہیں کہ مقدمے میں لسانی خصوصیات تفصیل سے درج کی جائیں، ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ اپنے مقدمے میں تفصیلی معلومات فراہم کرنے والے محقق موردِ الزام نہیں ٹھہرائے جاسکتے۔ وہ لکھتے ہیں کہ تحقیقی تصنیف کا مقدمہ مختصر نہیں ہونا چاہیے۔ اپنے مضمون 'اردو کی ادبی تحقیق آزادی سے پہلے' مشمولہ 'ذکر و فکر' میں رقمطراز ہیں:

> ''مثالی ترتیب میں مرتب کو ایک سیر حاصل مقدمہ لکھنا چاہیے اور اس کے بعد صحیح متن کی بازتعمیر کرنی ہوگی۔''

گیان چند جین ایک کھرے اور صداقت پسند انسان تھے اور یہی اوصاف ان کی تحقیق کی بنیاد ہیں۔ وہ اپنے تحقیقی تسامحات کو خوبصورت ناولوں سے چھپا کر قاری کے ذہن کو ترسیل کے پیچ وخم میں الجھانا نہیں چاہتے۔ انھوں نے نہایت کھلے ذہن کے ساتھ واضح الفاظ میں اپنی بعض تحقیقی کوتاہیوں کا ذکر کیا ہے۔ 'تحقیق کا فن' کے 'پیش گفتار' میں رقمطراز ہیں:

> ''جب میں نے پہلی بار الہ آباد یونیورسٹی سے ڈی۔ فل کے لیے ریسرچ کی تو مجھے میری نگراں نے فٹ نوٹ لکھنے کے بارے میں ہدایت نہیں کی۔ میں نے اپنا مقالہ 'اردو کی نثری داستانیں' جیسے کا تیسا انجمن ترقی اردو پاکستان کو اشاعت کے لیے بھیج دیا۔ ۱۹۴۸ء میں یہ شائع ہوا تو فٹ نوٹوں سے معرا تھا۔''

ان کا مضمون 'اخلاقیات تحقیق' ان کے تحقیقی نقطۂ نظر کا ترجمان اور آئینہ دار ہے۔ تحقیق کی اخلاقیات کے ضمن میں انھوں نے جو بنیادی نکات پیش کیے ہیں وہ محقق کو دعوت فکر دیتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ حوالہ دیتے وقت اس کے اصل مآخذ کو ترجیح دینی چاہیے اور ثانوی مآخذ کی مدد سے پیش کی ہوئی معلومات تحقیق کے وزن و وقار کو کم کر دیتی ہیں۔ جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے ان کے مصنفین کا حوالہ دینا محقق کا اخلاقی فرض ہے۔ دوسروں کی فراہم کردہ معلومات، محققانہ کاوشوں اور انکشافات کا ذکر کرتے ہوئے ایسا

پیرایۂ بیان اختیار کرنا جس سے وہ محقق کی ذاتی تحقیق معلوم ہو ادبی بددیانتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ محقق کی نظر سے جو کتابیں نہیں گزرتیں اور اس کے زیر مطالعہ نہیں رہتیں ان کے بارے میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ محقق نے ان کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ کتابیات کو مرعوب کن بنانے یا اپنی تحقیق کی ادبی قدر و قیمت میں اضافہ کرنے کے لیے ان کتابوں کے ناموں کی نشاندہی نہیں کرنی چاہیے جن کا مطالعہ نہیں کیا گیا ہے۔

گیان چند جین تحقیق کے لیے غیر جانبداری کو شرط اولین تصور کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں جذباتیت تحقیق کو کمزور بنا دیتی ہے، اس لیے اس سے احتراز ضروری ہے۔ مذہب اور عقائد کے علاوہ علاقائی اور گروہی وفاداریوں سے بلند ہونا بھی محقق کے لیے ضروری ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''مذہب کی طرح علاقہ بھی گروہی وفاداری کا مطالبہ کرتا ہے۔ اردو نثر کی ابتدا و فروغ کا سہرا دکن کے سر ہے۔ حامد حسن قادری صاحب نے دکن کو مات دینے کے لیے سید اشرف سمنانی کے معدوم رسالے کا ذکر کیا ہے۔ اگر ان کا کوئی رسالہ ہوتا تو اردو کی قدیم ترین نثری تصنیف ہوتا لیکن اس کا وجود ہی کہاں ہے۔''

گیان چند جین ایسے محققین سے زیادہ خوش نہیں ہیں جو 'معترضانہ تحقیق' کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں اور اسے اپنی تحقیق کا نصب العین قرار دیتے ہیں۔ 'معترضانہ تحقیق' کی اصطلاح گیان چند نے وضع کی ہے۔ وہ اس تصور کے حامل ہیں کہ محقق کا کام محض خردہ گیری، الزام تراشی اور بت شکنی ہی نہیں بلکہ اس کا تعمیری پہلو بھی بہت اہم ہے۔

غرض کہ گیان چند جین ایک معیار پرست محقق ہیں۔ ان کی محققانہ عظمت کا اعتراف ضروری ہے۔ ان کے بعض تصورات سے اختلاف کی گنجائش ہے لیکن اردو تحقیق میں ان کی گراں قدر خدمات سے انکار ممکن نہیں۔ وہ ان چند محققین میں سے ہیں جو ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کیے بغیر بڑی انکساری اور خاموشی کے ساتھ ادب کی خدمت میں مصروف تھے۔

☆☆☆

Moin Arif
Dept. of Urdu, DDU University,
Gorakhpur-273009
Mob. 7237077579
E-mail: moinarif40@gmail.com

نقش ہائے رنگ رنگ

معروف افسانہ نگار سلمیٰ صنم سے ایک گفتگو

محمود احمد کاوش

محترمہ سلمیٰ صنم کا شمار اردو کے منفرد افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ سائنس کی اُستاد ہیں۔ اُن کے افسانوں میں بھی سائنس کے حوالے ملتے ہیں مگر اِس سے اُن کے افسانے خشک، دقیق یا بوجھل نہیں بنتے۔ وہ اپنے موضوع کو دِلچسپ اور موثر بنانے کے گر سے بہ خوبی واقف ہیں۔ اُن کے افسانوی مجموعے 'پت جھڑ کے لوگ' اور 'پانچویں سمت' ناقدین سے تحسین سمیٹ چکے ہیں۔ حال ہی میں اُن کا افسانوی مجموعہ 'قطار میں کھڑے چہرے اور دیگر کہانیاں' شائع ہوا ہے۔ یہ مجموعہ بھارت کے علاوہ پاکستان سے بھی شائع ہوا ہے۔ ڈاکٹر محمود احمد کاوش نے اردو افسانے میں الگ شناخت رکھنے والی اس افسانہ نگار سے بات چیت کی ہے۔ آیئے محترمہ سلمیٰ صنم کی باتیں سنتے ہیں:

کاوش: محترمہ سلمیٰ صنم صاحبہ! سب سے پہلے آپ اپنے خاندان اور اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں بتایئے۔

سلمیٰ: میرے اجداد کا تعلق بغداد سے تھا۔ وہ سادات تھے اور ان کا شمار عالموں میں ہوتا تھا۔ پندرھویں صدی میں وہ کرناٹک کے عادل شاہی دورِ حکومت میں بغداد سے ہجرت کر کے بیجا پور میں آباد ہوئے اور شاہی دربار سے وابستگی اختیار کی۔ ۱۶۸۶ء میں اِس سلطنت کے زوال کے بعد بھی وہ بیجا پور میں مقیم رہے۔ ۱۷۸۳ء میں جب سلطنت خداداد کا قیام عمل میں آیا تو وہ ٹیپو سلطان کی دعوت پر گنج عام (سری رنگا پٹن) چلے آئے اور سلطان کے دربار سے منسلک ہو گئے۔ اس کے بعد گنج عام میں ان کا مستقل قیام رہا۔ میرا جنم کرناٹک کے ضلع بنگلور کے ساحلی علاقے پنمبور میں ۴/ اگست ۱۹۶۶ء میں ہوا۔ میں بچپن ہی سے بہت خاموش، کم گو، متین اور سنجیدہ سی تھی۔ میری عمر کے بچے کھیلتے تھے اور میں اپنے آپ میں گم سوچتی

تھی، بہت سوچتی تھی۔ میں کیا سوچتی تھی؟ یہ مجھے نہیں معلوم۔

کاوش: آپ نے کن اِداروں سے تعلیم حاصل کی؟

سلمیٰ: ہماری پرورش ننھیال (بنگلور) میں ہوئی۔ یہیں سے میں نے اسلامیہ مدرسۂ نسواں گرلز ہائی اِسکول سے میٹرک پاس کیا۔ ننھیال میں لڑکیوں کو کالج جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اِس دقیانوسی ماحول میں اُن نیم خواندہ لوگوں کے بیچ میرے روشن خیال ابّا کی ضد تھی کہ میں بیٹی کو گریجویٹ بناؤں گا۔ ابا کا یہ خواب بھائی کلیم نے پورا کیا۔ میں نے مہارانی سائنس کالج سے بی۔ ایس سی کیا جب کہ بنگلور یونیورسٹی گیان بھارتی کیمپس سے ایم۔ ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ میں پڑھائی میں ہمیشہ تیز رہی اور اپنی علمی صلاحیتوں سے یہ ثابت کر دِکھایا کہ لڑکیاں بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتی ہیں۔

کاوش: کیا آپ سے پہلے خاندان میں تخلیق کی کوئی رِوایت موجود تھی؟

سلمیٰ: میرے اجداد شاہی دربار سے وابستہ رہے تھے۔ بلا شبہہ اُن کے اندر علمی صلاحیتیں تو موجود تھیں، شاید تخلیقی صلاحیتیں بھی رہی ہوں۔ ممکن ہے اُنھوں نے کچھ تخلیق بھی کیا ہو، مگر اِس کا کوئی مستند ثبوت نہیں۔

کاوش: آپ کو اِس بات کا احساس کب ہوا کہ آپ کہانی لکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں؟

سلمیٰ: میری امی اور خالہ مطالعے کا شوق رکھتی تھیں۔ اُن دِنوں گھر میں نیم ادبی رسائل اور کمرشل ناولوں کا مطالعہ ہوتا رہتا تھا۔ وہ دونوں مغز ماری کرتی تھیں اور خامہ فرسائی بھی۔ اس معرکہ آرا فضا میں 'بیسویں صدی'، 'خاتونِ مشرق' اور 'شمع' جیسے رسالے پڑھ کر میرا دِماغ خراب ہونا ہی تھا اور وہ ہوا بھی۔ چودہ سال کی عمر میں ننھیال کے ایک تنگ کمرے میں کالی کالی چھت کے نیچے بیٹھ کر ایک افسانہ لکھا 'وہ دِن یاد کرو'۔

کاوش: ابھی آپ نے کمرشل ناولوں کا ذکر کیا۔ ان ناولوں سے آپ کی کیا مراد ہے؟

سلمیٰ: کمرشل ناولوں سے میری مراد ایسی پاپولر ناولیں ہیں جن کی مانگ تھی۔ وہ دھڑا دھڑ بکتی تھیں اور اُن سے خوب منافع حاصل ہوتا تھا۔ ایسی پاپولر ناولوں میں رضیہ بٹ، عفت موہانی، بشریٰ رحمٰن اور واجدہ تبسم کی ناولوں کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

کاوش: آپ کا پہلا افسانہ کون سا ہے؟

سلمیٰ: افسانہ نویسی راتوں رات نہیں آئی۔ بہت جی جلایا، تب کہیں جا کر ڈھنگ کا ایک افسانہ لکھ پائی۔ اس کا نام 'چاندنی' رکھا۔ یہ میرا پہلا افسانہ ہے۔

کاوش: یہ افسانہ آپ نے کب لکھا؟

سلمٰی: یہ افسانہ میں نے ۱۹۹۰ء میں لکھا اور اُسی سال یہ افسانہ 'روشنی' کے نام سے بنگلور سے نکلنے والے روزنامہ 'سالار' کے ادبی ایڈیشن میں شائع ہوا۔

کاوش: اگر 'روشنی' آپ کا پہلا افسانہ ہے تو 'وہ دِن یاد کرو' کو آپ کس کھاتے میں ڈالیں گی؟

سلمٰی: وہ ایک کچا پکا افسانہ تھا جس کو افسانہ نہیں کہا جا سکتا۔ میں 'روشنی' کو بھی افسانہ نہیں مانتی۔ اس کے بعد میں نے 'اپاہج' اور 'مستقبل یا عذاب' نام کے افسانے بھی لکھے، مگر اِن تینوں افسانوں کو میں نے اپنے پہلے افسانوی مجموعے میں شامل نہیں کیا۔ جس افسانے سے میں مطمئن ہوئی، وہ میرے اوّلین افسانوی مجموعے کا پہلا افسانہ ہے۔ اس کا نام 'سائے' ہے۔ اس کا موضوع بال مزدوری ہے۔ اِس افسانے نے کل ریاستی مقابلے میں تیسرا مقام حاصل کیا تھا۔

کاوش: آپ اپنے افسانوں کے لیے مواد کہاں کہاں سے تلاش کرتی ہیں؟

سلمٰی: میں ادب برائے زندگی کی قائل ہوں۔ میں اپنے افسانے زندگی سے اخذ کرتی ہوں۔ میرے افسانوں کے کردار میرے آس پاس کے لوگ ہیں۔ میری کہانیوں کے واقعات میرے اِرد گرد وقوع پذیر ہونے والے حادثات و واقعات ہیں۔ میرے افسانے عام انسانوں کی کہانیاں ہیں، جن میں مرکزیت عورت کو حاصل ہے۔ میرے یہاں کوئی بڑا فلسفہ نہیں ہے۔ میں کسی تحریک سے وابستہ نہیں ہوں۔ میں نام و نمود کی خاطر بھی افسانے نہیں لکھتی۔ مجھے یہ گمان بھی نہیں ہے کہ میرے افسانے انقلاب لانے کا باعث بنیں گے یا اِن افسانوں سے کسی نظریے اور اِزم کا اشتہار ہوگا۔ افسانہ لکھنا تو میرا مشغلہ ہے۔ یہ میرے اندرون کے اطمینان کا باعث ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ میرے افسانے میرے محسوسات کا اظہار ہیں، یہ میرے دِل کی آواز ہیں، سماج کے رویّوں پر میری پسند، ناپسند ہیں۔ میرے افسانے سائنسی ایجادات، ٹکنالوجی کا استعمال، فیمینیزم، تازہ ترین حادثات و واقعات، کھوکھلے ہوتے خون کے رشتے، میاں بیوی کے ٹوٹتے یقین و اعتماد، سروگیسی، ایڈز، ایبولا اور الزائمر جیسی بیماریوں، اعضا کی خرید و فروخت، مذہبی رہنماؤں کے ڈھونگ، جنین کشی، ورکنگ ویمن کے حالات، بال مزدوری، گئو ہتھیا جیسے گونا گوں سماجی موضوعات کا اِحاطہ کرتے ہیں۔ میں نے اپنے ہر ایک افسانے کا مواد سماج ہی سے لیا ہے۔

کاوش: آپ کن افسانہ نگاروں سے متاثر ہیں؟

سلمٰی: سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر، زاہدہ حنا کے افسانے مجھے متاثر کرتے ہیں۔

کاوش: آپ نے اپنے پسندیدہ افسانہ نگاروں میں منٹو کا نام بھی لیا ہے۔ جس بے باکانہ انداز میں منٹو نے اپنے افسانوں میں حقیقت نگاری کی ہے، کیا اسے آپ مناسب سمجھتی ہیں؟ آپ کے افسانوں میں تو

اِس طرح کی بے باکی نہیں ملتی۔

سلمٰی: منٹو ایک جینوئن افسانہ نگار ہے مگر جنسی موضوعات کو لے کر حقیقت نگاری کے نام پر جو بے باکی اُس کے افسانوں میں موجود ہے، وہ میرے نزدیک قابلِ قبول نہیں اور میرے افسانوں میں اس طرح کی حقیقت نگاری عموماً اِس لیے نہیں ملتی کہ میں اپنے افسانوں پر کسی کی چھاپ کی قائل نہیں ہوں۔ منٹو میرا پسندیدہ افسانہ نگار ہے مگر ضروری نہیں کہ جس شخصیت کو آپ پسند کریں اُس کی تقلید بھی شروع کر دیں۔ اِس طرح آپ کی اپنی انفرادیت کہاں رہے گی۔ ناقدین کی نظر میں میرے افسانے اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔

کاوش: آپ کی نظر میں آپ کا شاہکار افسانہ کون سا ہے؟

سلمٰی: میں اپنے کسی بھی افسانے کو اپنا شاہکار افسانہ نہیں مانتی۔ اس کو لکھنا ابھی باقی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میرے چند افسانے جلد بازی کی نذر ہو گئے ہیں، اس لیے بہت اچھی کہانیاں بڑی کہانیاں بننے سے رہ گئی ہیں۔ اگر موقع ملا تو میں اِن کہانیوں کو دوبارہ لکھنا چاہوں گی۔ اِس کی ایک مثال میرا افسانہ 'میری' ہے۔ ایک اور افسانہ 'ایک مہلک سچ' ہے۔ اِس افسانے کو کرناٹک اردو اکادمی کے افسانوی مقابلے میں دس ہزار روپے کا انعام ملا تھا۔ اِن شاء اللہ میں اِس کو دوبارہ لکھ رہی ہوں۔

کاوش: آپ نے حیاتیات کی تعلیم حاصل کی اور آپ یہی مضمون کالج میں پڑھا بھی رہی ہیں۔ آپ کے افسانوں میں اِس مضمون سے اِستفادے کی کئی مثالیں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ اپنے افسانوں میں سائنس کی کارفرمائی پر روشنی ڈالنا پسند کریں گی؟

سلمٰی: میں نے سائنس کے طالب علم اور اُستاد ہونے کے ناتے انسانی جسم اور انسان کے عادات و خصائل کا سائنسی مطالعہ کیا ہے۔ 'میری'، 'یخ لمحوں کا فیصلہ'، 'مٹھی میں بند چڑیا'، 'شناخت'، 'ایک ایسے گگن کے تلے'، 'مزدور زندہ باد'، 'آرگن بازار'، 'قطار میں کھڑے چہرے'، 'بھیگے کاغذ میں لپٹے ہوئے لمحات' وغیرہ افسانوں میں آپ کو سائنسی حقائق نظر آئیں گے، سائنسی اصطلاحیں دِکھائی دیں گی۔ سائنسی ایجادات، ٹکنالوجی کا استعمال، اعضا کی خرید و فروخت، جنین کشی، ایبولا، سروگیسی، ایڈز، الزائمر جیسے جدید اور موجودہ دُنیا کے روز بروز سامنے آنے والے موضوعات کو میں نے خوبصورت انداز میں افسانوں میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ میرے افسانوں میں نہ صرف موضوعات کی حد تک سائنس کا استعمال نظر آتا ہے، بلکہ اِن افسانوں کی زبان میں بھی سائنس کا پرتو دِکھائی دیتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) ''نور کی وہ ایک ننھی سی کرن جو بالکل مصنوعی طریقے سے اُس کے وجود میں داخل کی گئی تھی۔ وہ

کسی سورج کی طرح اُس کے اندر روشن تھی۔'' (میری)

(۲) ''جب سے یہ تشخیص ہوا تھا کہ ایک فورتھ گریڈ Glioblastoma Multiforme اُس کے دماغ میں رینگ رہا تھا۔'' (ایک ایسے گگن کے تلے)

(۳) ''پہلے رائل جیلی اُن لاروؤں کو ملتی تھی جنھیں رانی بننا ہوتا تھا۔ اب یہ غذا ہر لاروے کو دی جانے لگی۔'' (مزدور زندہ باد)

(۴) ''پھر قبل پیدائش لڑکیوں کا قتل کس لیے؟ کیا وہ Endagangered Species بن کر رہ جائے گی؟'' (یخ لمحوں کا فیصلہ)

(۵) ''جانے ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کبھی کبھی یہ زندگی ریاضی کے سوالوں کی طرح بہت اُلجھی نظر آتی ہے اور مائنس (-) پلس (+) کے چکر میں کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔'' (مٹھی میں بند چڑیا)

کاوش: حال ہی میں آپ کے افسانے کو عالمی مقابلے میں پانچویں پوزیشن ملی ہے۔ اِس مقابلے کے بارے میں بتائیں نیز اِس افسانے کا مرکزی خیال کیا تھا؟

سلمٰی: فیس بک پر اردو افسانے کی ترویج و ترقی کے لیے کئی گروپس قائم ہیں۔ ایسا ہی ایک گروپ پاکستانی بنیاد عالمی اُردُو فکشن ہے۔ اس کے منتظمین سید تحسین گیلانی اور سیدہ آیت گیلانی نے ایک مقابلہ ایونٹ 'جشنِ افسانہ' (۲۰۱۸-۲۰۱۹ء) کا انعقاد کیا۔ اِس میں دُنیا بھر سے کل اسّی (۸۰) افسانے پیش کیے گئے۔ اِس میں میرے افسانے 'بانس کے آدمی' کو پانچواں انعام حاصل ہوا۔ یہ انعام سند اور شیلڈ پر مشتمل تھا۔ 'بانس کے آدمی' بدلتی ہوئی تہذیبی صورتِ حال نیز نئی اور پرانی نسل کے سوچنے کے تضاد کا بیانیہ ہے۔ اس میں جنگل کی زندگی، قبائلی نظام اور ایک آدی واسی سماج کے شب و روز اَور اُن کے معمولاتِ زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ عاکف محمود کے نزدیک یہ افسانہ اردو افسانے کی سرزمین کو وسعت عطا کرنے والا افسانہ ہے۔

کاوش: افسانہ نگاروں نے علامتی افسانے لکھے، جس سے قاری کے لیے مفہوم کے اِبلاغ کا مسئلہ پیدا ہوا۔ آپ کی ایسے افسانوں کے بارے میں کیا رائے ہے؟

سلمٰی: علامتوں کو پیچیدہ، پُراسرار، چیستاں یا پہیلی نہیں ہونا چاہیے۔ افسانے کو اپنے مفہوم کی ترسیل کرنی چاہیے۔

کاوش: آپ کے افسانوں کے بعض جملے مقفّٰی صورت میں ملتے ہیں۔ کیا اِس کے پسِ پردہ آپ کی شعوری کوشش کا کوئی عمل دخل ہے؟ آپ نے کبھی شعر کہنے کی کوشش کی؟ افسانے کو اظہارِ خیال کا وسیلہ بنانے کی کوئی خاص وجہ ہے؟

سلمٰی: نہیں، شعوری کوشش نہیں۔ میرے خیال سے یہ فطری ہے۔ شاید میرا مزاج ہی ایسا ہو۔ بقول یوسف عارفی میرے افسانوں کا خاص وصف ان میں پائی جانے والی برجستگی اور بے ساختگی ہے۔ عارفی صاحب نے میرے افسانوں میں ایک طرح کے فطری بہاؤ اور آمد کا بھی ذکر کیا ہے۔

میں نے ابتدا میں غزل میں طبع آزمائی کی۔ کئی غزلیں شائع بھی ہوئیں، مگر کسی اُستاد کے بغیر آگے بڑھنا مشکل تھا۔ اِس سے پہلے کہ کوئی اُستاد ہوتا، میرے افسانے 'سائے' کو ریاستی سطح پر انعام مل گیا۔ افسانہ پڑھ کر بنگلور یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر م۔ ن سعید صاحب نے لکھا کہ ''آپ کے قلم کی چنگاری میں شعلہ بننے کے تمام آثار موجود ہیں۔ شرط یہ ہے کہ آپ افسانہ نگاری کو مشغلہ نہ سمجھیں، مشن تصور کریں۔'' یوں میں فکشن کی ڈگر پر چل نکلی۔ ویسے پچھلے چند سالوں میں کچھ غزلیں بھی کہی ہیں، مگر میں افسانہ نگاری ہی کو اپنا میدان مانتی ہوں۔

کاوش: تو پھر اپنی شاعری کا کوئی نمونہ عنایت کیجیے۔

سلمٰی:

گلا تم سے کوئی ہمارا نہ ہوتا — مٹانا جو ٹھہرا سنوارا نہ ہوتا

☆

میں چہرے سے اپنے نہ کیسے ڈروں — کسی کا نہیں آج چہرہ کوئی

☆

دیا ہے اِختیار اُن کو خدا جانے یہ کس نے — ہماری لے کے سانسیں زندگی اپنی بنالی

☆

نمو میری یہاں ممکن نہیں ہے اب — الگ مٹی میں اُگنے کی اِجازت دو

☆

کسک رات دِن کی جہنم الٰہی — یہ اِحساس مجھ سے مرا چھین لینا

☆

کاوش: آپ نے وقت نکالا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ

سلمٰی: آپ کا بھی شکریہ

☆☆☆

Dr. Mahmood Ahmad Kaawish
Principle Quaid-e-Azam Academy
for Educational Development (QAED),
Narowal, Pakistan, Mob. +923007764252
E-mail: drkaawish@gmail.com

مولانا ارشاد حسین
پورہ معروف، مئو،
موبائل نمبر 8896740346

قصیدہ در منقبت فاطمہ زہرا (ص)

دیکھ کر جنت کے اوپر اختیار فاطمہ
کل خواتین بہشتی ہیں نثار فاطمہ
گھر پہ رضوان جناں خیّاط بن کر آ گیا
صدق کی تصدیق ہے یا اقتدار فاطمہ
نذر مانی تین روزوں کی خدا کے واسطے
دہر کا سورہ ہوا نازل بکار فاطمہ
مرسل اعظم کھڑے ہوجاتے ہیں تعظیم کو
یہ شرف، یہ مرتبہ، یہ ہے وقار فاطمہ
راہبوں کی ہار تھی پُرنور چہروں کے سبب
صورتِ ابنائنا ہیں شاہکار فاطمہ
در حقیقت طعنۂ ابتر کا ہے بن کر جواب
آئی گلزار خدیجہ میں بہار فاطمہ
پنجتن جب آتے ہیں ارشادؔ چادر کے تلے
آیت تطہیر بنتی ہے حصار فاطمہ

☆☆☆

غزل

اس کے رخ پر خال دکھائی دیتا ہے
وہ جی کا جنجال دکھائی دیتا ہے
رنگوں کی تبدیلی ایک معمہ ہے

زخم ہرا ہے لال دکھائی دیتا ہے
جکڑا ہو جو غیرت کی زنجیروں میں
بچہ، کہنہ سال دکھائی دیتا ہے
محنت ہو تو ماضی کے آئینے میں
کتنا اچھا حال دکھائی دیتا ہے
جس نے ہم کو کی تھی پھنسانے کی کوشش
اس کے آگے جال دکھائی دیتا ہے
جو ہو شکاری مچھلی کا پیہم ارشادؔ
اس کو نرجا تال دکھائی دیتا ہے

☆☆☆

غزل

کیوں تکلف ہو بھلا اپنے کو اپنانے میں
جب ترحم کی نظر دیکھ لی بیگانے میں
جانے کیوں آج ہیں بدلے ہوئے تیور ان کے
کیا خطا ہوگئی مجھ سے کوئی انجانے میں
سوزشِ عشق سے جب شمع کو روتے دیکھا
آرزو جلنے کی پیدا ہوئی پروانے میں
پی کے دو گھونٹ قسم توڑ دی ساقی میں نے
دیکھ لی آپ کی تصویر جو پیمانے میں
ان کی آنکھوں کا کرشمہ ہے کہ لب کی حرکت
کیوں خودی کی جگہ ہے بےخودی دیوانے میں
جس کو پینے کا سلیقہ نہیں آتا ارشادؔ
وہ پلانے کے لیے بیٹھے ہیں میخانے میں

☆☆☆

قند مکرر

مثنوی چراغ دیر

میرزا اسد اللہ خان غالب

مقدمہ و پیش کش

فیضان حیدر

مقدمہ

بنارس کو قدیم الایام سے مذہبی، تہذیبی اور ثقافتی حیثیت حاصل ہے۔ یہ اسی زمانے سے ہندوستانی تہذیب و تمدن، رسم و رواج اور مذہبی علوم کا گہوارہ رہا ہے۔ اگر چہ یہ ہندوؤں کا مذہبی شہر تسلیم کیا جاتا ہے لیکن اس کی موجودہ گنگا جمنی تہذیب دونوں قوموں (ہندوؤں اور مسلمانوں) کی مشترکہ مساعی کا نتیجہ ہے۔ اس کی اسی خوبی کی وجہ سے ملک اور بیرون ملک سے لوگ کھنچ کر یہاں آئے اور یہیں کی خاک کا پیوند ہوئے۔

'چراغ دیر' میں غالب نے بنارس کو 'بہشت خرم' اور 'فردوس معمور' سے تعبیر کیا ہے۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ وہ ستائش کرتے ہوئے اس حد تک پہنچ جاتے ہیں کہ اسے 'کعبہ ہندوستان' کہہ دیتے ہیں۔ اس سے یہ بات تو صاف ہے کہ ان کی نظر میں بنارس کی وہی عظمت ہے جو مسلمانوں کی نظر میں کعبے کی۔ ان کی اس بات سے بڑی حد تک اتفاق کیا جا سکتا ہے لیکن کلی طور پر نہیں۔ کیوں کہ ہر انسان کی اپنی ذہنی ساخت اور ذاتی پسند و ناپسند ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ غالب نے ایسے ماحول میں قیام کیا ہو جہاں لوگ تعلیم یافتہ اور قدرداں ہونے کے ساتھ ساتھ مہذب بھی رہے ہوں۔

مرزا غالب نے یہ مثنوی اپنی خاندانی پنشن کی تقسیم میں ناانصافی کے مقدمے کے سلسلے میں کلکتہ جاتے ہوئے قیام بنارس میں کہی تھی۔ غالب کے چچا کے انتقال کے بعد ہی انگریزوں نے ان کی پنشن مقرر کر دی تھی۔ اس وقت ان کی عمر ۹؍سال تھی۔ لیکن بعد میں مصارف بڑھے تو انھوں نے اس میں اضافے کے لیے کلکتہ جانے کی ٹھان لی۔ انھوں نے جنوری ۱۸۲۶ء میں اس سفر کا آغاز کیا اور کان پور، لکھنو، الہ آباد، بنارس اور عظیم آباد کے راستے کلکتہ گئے۔ وہ ۱۹؍فروری ۱۸۲۸ء میں کلکتہ پہنچے اور تقریباً ڈیڑھ سال تک وہیں مقیم رہے۔ لاکھ کوششوں کے باوجود ان کو اپنے مقصد میں کامیابی نصیب نہیں ہوئی اور انھیں ناکام و نامراد دہلی واپس آنا پڑا۔ انھوں نے اس مقدمے کے لیے دوسروں سے اس بھروسے پر قرض بھی لیا کہ پنشن میں اضافے کے بعد بڑی آسانی سے ادا کر دیں گے، لیکن ان کی امیدوں پر پانی پھر گیا اور وہ مقروض ہوتے گئے۔ وہ خود کہتے ہیں:

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

اس سفر میں انھوں نے لکھنو میں بھی تقریباً ایک سال تک قیام کیا۔ جب وہ لکھنو پہنچے تو ان کے استقبال اور اعزاز میں ایک جشن کا اہتمام بھی کیا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے بنارس میں قیام کیا اور وہاں کی آب ہوا سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ایک پوری مثنوی ہی کہہ ڈالی۔

انھوں نے تقریباً گیارہ مثنویاں کہی ہیں لیکن ان میں جو شہرت و مقبولیت 'چراغ دیر' کو حاصل ہوئی وہ کسی اور مثنوی کے حصے میں نہ آ سکی۔ اس مثنوی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں انھوں نے اپنے جذبات و احساسات کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ وہ خود دوسروں کے احساس اور جذبے سے قریب معلوم ہوتے ہیں۔ اپنے دل پذیر انداز بیان اور فنی برتاؤ کی وجہ سے اس کی معنی خیزی اور جاذبیت میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ اس کے مطالعے سے ان کی فکری ابعاد اور تخیل کی کارفرمائیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس میں انھوں نے تخیلی پیکروں کی مدد سے ایک ایسا نگارخانہ آباد کیا ہے جو نگارستان چین کو بھی مات دیتا ہے۔ ساتھ ہی یہ خیالی تصویریں رنگینی، رعنائی اور دلکشی کی وجہ سے اصل سے بھی زیادہ پرکشش ہو گئی ہیں۔ یہ مثنوی بنارس کا ایک جیتا جاگتا مرقع ہے جو قارئین کے جذبات و احساسات کو برانگیخت کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی تو یہی ہے کہ وہ بنارس کی تعریف اس انداز سے کرتے ہیں کہ قاری یا سامع خود بخود اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

اس مثنوی میں غالب نے اپنی شاعرانہ خوبیوں کو بروئے کار لاتے ہوئے بنارس، اس کی آب و ہوا اور اس کے محل وقوع کا ایک خوبصورت مرقع کھینچا ہے اور جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ اسے 'بہشت خرم' اور 'فردوس معمور' قرار دیا ہے۔ مذکورہ دونوں الفاظ سے بنارس کے بہشت آسا شہر ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کا آغاز ہی بڑے پر جوش انداز میں ہوا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ دست بستہ غالب کے سامنے کھڑے ہیں اور وہ انھیں جیسے چاہتے ہیں استعمال کرتے ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

نَفَس با صُور دمساز است امروز — خموشی محشر راز است امروز
رگ سنگم شراری می‌نویسم — کف خاکم غباری می‌نویسم
دل از شور شکایت ہا بہ جوش است — حباب بی‌نوا طوفان خروش است

اب اس کے مدحیہ اشعار دیکھیے اور ان کی لطافت اور شیرینی سے لطف اٹھائیے:

بہ خوش پرکاری طرز وجودش — ز دلی می‌رسد ہر دم درودش
بنارس را مگر دیدست در خواب — کہ می‌گردد ز نہرش در دہن آب
زہی آسودگی بخش روان‌ہا — کہ داغ چشم می‌شوید ز جان‌ہا
شگفتی نیست از آب و ہوایش — کہ تنہا جان شود اندر فضایش
درین دیرینہ دیرستان نیرنگ — بہارش ایمن است از گردش رنگ
چہ فروردین، چہ ماہ دی، چہ مرداد — بہ ہر موسم فضایش جنت آباد

مذکورہ بالا اشعار میں غالب نے بنارس کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی ہے۔ ان اشعار میں انھوں نے بنارس کی آب و ہوا کی تعریف و توصیف کی ہے اور اسے روح پرور اور روح افزا قرار دیا ہے۔ ساتھ ہی غم و اندوہ سے یکلخت نجات دینے والی بھی قرار دیا ہے، جس کی بہار گردش لیل و نہار سے ایمن و محفوظ ہے اور اس پر کبھی خزاں کے آثار نمودار نہیں ہوتے۔ یہاں ان اشعار کی تشریح و تعبیر پیش کرنے کا موقع نہیں ہے۔ آگے پھر دیکھیے کیا کہتے ہیں:

تعالیٰ اللہ بنارس چشم بد دور — بہشت خرم و فردوس معمور
عبادت خانۂ ناقوسیان است — ہمانا کعبۂ ہندوستان است

مذکورہ اشعار میں انھوں نے بنارس کو تجلی نور الٰہی قرار دیتے ہوئے دعا کی ہے کہ خداوند عالم اسے نظر بد سے بچائے۔ اس طرح انھوں نے اس میں بنارس کی آب و ہوا، دلکش مناظر، بتوں اور برہمنوں کی تعریف و توصیف کی ہے جس سے مثنوی کے مطالعے کے وقت محظوظ ہوں گے۔

جذبات و احساسات کی بہترین عکاسی اور ترجمانی اس کی امتیازی خصوصیت ہے۔ پرزور انداز بیان اور شگفتہ الفاظ و محاورات نے اسے وہ انفرادی شان بخشی ہے جو ان کی کسی اور مثنوی کے حصے میں نہ آ سکی۔ بلکہ اس کا تقابل اس دور میں ہندوستان میں لکھی گئی کسی بھی مثنوی سے ممکن نہیں ہے۔

اس بات سے انکار ممکن نہیں کی انسانی جذبات و احساسات کو پر اثر اور موثر انداز میں پیش کرنا ہی اصل شاعری ہے۔ 'چراغ دیر' میں غالب نے اپنے تخیل کی بلند پروازی سے بنارس کی تہذیب و معاشرت کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس سے ہمیں بنارس کو اس دور کے تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس کے ایک ایک شعر دلوں کو موہ لینے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ بہت نپتے تلے الفاظ و تراکیب استعمال کی گئی ہیں جو حشو و زوائد سے کوسوں دور ہیں۔ نیز الفاظ کے دروبست نے اس میں ایک

عجیب شان پیدا کردی ہے جسے بار بار پڑھنے پر بھی حسن میں کمی کا احساس نہیں ہوتا بلکہ ہر قرأت ایک نئے معنی اور نئے مفہوم کی متقاضی ہے۔

غالبؔ نے بنارس کو جیسا مشاہدہ کیا اسے خوبصورت پیکر میں ڈھال دیا۔ ان کے باریک مشاہدے، منفرد تخلیقی ذہانت اور تخیل کی کارفرمائیوں کی وجہ سے اس کے مطالعے کے وقت ایک ذہنی فرحت و انبساط کا احساس ہوتا ہے جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

غالب کی اس شہرۂ آفاق مثنوی کی جتنی ہندوستانیوں نے قدر کی ہے اتنی ہی ایرانیوں نے بھی کی۔ اس کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اس کے مختلف زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ اردو میں اس کے منظوم و منثور ترجمے تقریباً درجن بھر میری نظر میں ہیں۔ خود پروفیسر صادق کا ترتیب دیا ہوا پانچ اردو ترجمہ جن میں دو منظوم (مترجمین: اختر حسن اور پروفیسر حنیف نقوی) اور تین منثور (مترجمین: ظ۔ انصاری، سردار جعفری اور کالی داس گپتا رضا) ہے، اردو اکادمی دہلی نے ۲۰۱۵ء میں شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر جگن ناتھ پاٹھک نے اس کا سنسکرت میں بھی ترجمہ کیا ہے جسے ہندوستانی اکادمی الٰہ آباد نے شائع کیا ہے۔

ان ترجموں کے علاوہ بھی کئی افراد نے اس کے ترجمے کیے ہیں۔ مجھے ان ترجموں کے حوالے سے کچھ کہنا نہیں ہے۔ ہاں مذکورہ پانچوں تراجم کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن یہ بھی کہیں کہیں یا گنجلک ہو گئے ہیں یا شاعر کے مافی الضمیر کو ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ منظوم ترجمے کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن نظم کا نظم میں آسان ترجمہ جو عام قاری تک شاعر کے مافی الضمیر کو بخوبی منتقل کر سکے لوہے کا چنا چبانے سے کم نہیں ہے۔ خود سردار جعفری ایک قادر الکلام شاعر تھے لیکن انھوں نے اس کا منظوم ترجمہ نہیں کیا شاید ان کے پیش نظر یہ بات رہی ہو۔ بہر صورت یہ تراجم متن کو سمجھنے میں بڑی حد تک معاونت ضرور کرتے ہیں، لیکن جو خوش اسلوبی اور دلکشی مثنوی میں ہے وہ ان ترجموں میں کہاں؟

(فیضان حیدر)

مثنوی چراغ دیر

نفَس با صُور دمسازست امروز — خموشی محشرِ رازست امروز
رگِ سنگم شراری می‌نویسم — کفِ خاکم غباری می‌نویسم
دل از شورِ شکایت‌ہا بہ جوش‌ست — حبابِ بی‌نوا طوفان خروش‌ست
بہ لب دارم ضمیر آلا بیانی — نفس خون کن جگر پالا فغانی
پریشان‌تر ز زُلفم داستانیست — بہ دعوا، ہر سرِ مویم زبانیست
شکایت گونہ‌ای دارم ز احباب — کتانِ خویش می‌شویم بہ مہتاب
در آتش از نوای سازِ خویشم — کبابِ شعلۂ آواز خویشم
نفس ابریشم ساز فغان‌ست — بسان نی تبم در استخوان‌ست
محیط افگندہ بیرون گوہرم را — چو گرد افشاندہ آہن جوہرم را
ز دہلی تا بُرون آوردہ بختم — بہ طوفانِ تغافل دادہ رختم
کس از اہلِ وطن غم‌خوارِ من نیست — مرا در دہر پنداری وطن نیست
ز ارباب وطن جویم، سہ تن را — کہ رنگ و رونق‌اند این نہ چمن را
چو خود را جلوہ سنج ناز خواہم — ہم از حق، فضل حق را بازخواہم
چو حرز بازویِ ایمان نویسم — حسام‌الدین حیدر خان نویسم
چو پیوندِ قبایِ جان طرازم — امین‌الدین احمد خان طرازم
گرفتم کز جہان‌آباد رفتم — مر، اینان را چرا از یاد رفتم
مگو داغِ فراقِ بوستان سوخت — غمِ بی‌مہریِ این دوستان سوخت
جہان‌آباد گر نبود الم نیست — جہان آباد بادا، جای کم نیست

نباشد قحط بہر آشیانی   سرِ شاخِ گلی در گلستانی
سپس در لالہ‌زاری جا توان کرد   وطن را داغِ استغنا توان کرد
بہ خاطر دارم اینک گل زمینی   بہار آیین سوادِ دل‌نشینی
کہ می‌آید بہ دعوا گاہ لافش   جہان‌آباد ازبہر طوافش
نگہ را دعوای گلشن ادایی   ازان خرّم بہار آشنایی
سخن را نازشِ مینو قماشی   ز گلبانگِ ستایش‌ہای کاشی
تعالی‌اللہ بنارس چشم بد دور   بہشتِ خرّم و فردوسِ معمور
بنارس را کسی گفتا کہ چین است   ہنوز از گنگ چینش بر جبین است
بہ خوش پرکاری طرز وجودش   ز دہلی می‌رسد ہر دم درودش
بنارس را مگر دیدست در خواب   کہ می‌گردد ز نہرش در دہن آب
حسودش گفتن آیین ادب نیست   و لیکن غبطہ گر باشد عجب نیست
تناسخ مشربان چون لب گشایند   بہ کیش خویش کاشی را ستایند
کہ ہر کس کاندران گلشن بمیرد   دگر پیوند جسمانی نگیرد
چمن سرمایۂ امید گردد   بہ مردن زندۂ جاوید گردد
زہی آسودگی بخشِ روان‌ہا   کہ داغ چشم می‌شوید ز جان‌ہا
شگفتی نیست از آب‌وہوایش   کہ تنہا جان شود اندر فضایش
بیا ای غافل از کیفیتِ ناز   نگاہی بر پری‌زادانش انداز
ہمہ جان‌ہای بی‌تن کن تماشا   ندارد آب‌وخاک این جلوہ حاشا
نہادشان چو بوی گل گران نیست   ہمہ جان‌اند جسمی در میان نیست
خس و خارش گلستان است گویی   غبارش جوہر جان است گویی
در ین دیرینہ دیرستانِ نیرنگ   بہارش ایمن‌ست از گردش رنگ
چہ فروردین، چہ ماہِ دی، چہ مرداد   بہ ہر موسم فضایش جنت‌آباد
بہاران در شتا و صیف ز آفاق   بہ کاشی می‌کند قلاش و ییلاق

بود در عرض بال‌افشانی ناز   خزانش صندل پیشانی ناز
بہ تسلیم ہوای آن چمن‌زار   ز موجِ گل بہاران بستہ زُنّار
فلک را قشقہ‌اش گر بر جبین نیست   پس این رنگینی موجِ شفق چیست
کفِ ہر خاکش از مستی کنشتی   سر ہر خارش از سبزی بہشتی
سوادش پای‌تختِ بت‌پرستان   سراپایش زیارت‌گاہ مستان
عبادت‌خانۂ ناقوسیان است   ہمانا کعبۂ ہندوستان است
بُتانش را ہیولیٰ شعلۂ طور   سراپا نورِ ایزد چشمِ بد دور
میان‌ہا نازک و دل‌ہا توانا   ز نادانی بہ کارِ خویش دانا
تبسم بسکہ در لب‌ہا طبیعی‌ست   دہن‌ہا رشکِ گل‌ہای ربیعی‌ست
ادایی یک گلستان جلوہ سرشار   خرامی صد قیامت فتنہ دربار
بہ لطف از موج گوہر نرم‌رو تر   بہ ناز از خون عاشق گرم‌رو تر
ز انگیزِ قد اندازِ خرامی   بہ پای گلبنی گستردہ دامی
ز رنگین جلوہ‌ہا غارت‌گر ہوش   بہارِ بستر و نوروزِ آغوش
ز تاب جلوۂ خویش آتش افروز   بتان بت‌پرست و برہمن سوز
بہ سامان دوعالم گلستان رنگ   ز تابِ رخ چراغانِ لبِ گنگ
رساندہ از ادای شست‌وشویی   بہ ہر موجی نوید آبرویی
قیامت قامتان مژگان درازان   ز مژگان بر صف دل نیزہ‌بازان
بہ تن سرمایۂ افزایش دل   سراپا مژدۂ آسایش دل
بہ مستی موج را فرمودہ آرام   ز نغزی آب را بخشیدہ اندام
فتادہ شورشی در قالبِ آب   ز ماہی صد دلش در سینہ بی‌تاب
ز بس عرض تمنا می‌کند گنگ   ز موج آغوش‌ہا وامی‌کند گنگ
ز تاب جلوہ‌ہا بی‌تاب گشتہ   گہرہا در صدف‌ہا آب گشتہ
مگر گویی بنارس شاہدی ہست   ز گنگش صبح و شام آیینہ در دست

نیاز عکس روی آن پری چہر — فلک در زر گرفت آیینہ از مہر
بہ نام ایزد زہی حسن و جمالش — کہ در آیینہ می‌رقصد مثالش
بہارستانِ حسنِ لااُبالی‌ست — بہ کشورہا سمر در بی‌مثالی‌ست
بہ گنگش عکس تا پرتو فگن شد — بنارس خود نظیر خویشتن شد
چو در آیینہ‌ای آبش نمودند — گزند چشم زخم از وی ربودند
بہ چین نبود نگارستان چو اویی — بہ گیتی نیست شارستان چو اویی
بیابان در بیابان لالہ زارش — گلستان در گلستان نو بہارش
شبی پرسیدم از روشن بیانی — ز گردش‌ہای گردون رازدانی
کہ بینی نیکویی‌ہا از جہان رفت — وفا و مہر و آزرم از میان رفت
ز ایمان‌ہا بہ‌جز نامی نماندہ — بہ‌غیراز دانہ و دامی نماندہ
پدرہا تشنۂ خون پسرہا — پسرہا دشمن جان پدرہا
برادر با برادر در ستیز است — وفاق از شش جہت رو در گریز است
بدین بی‌پردگی‌ہایِ علامت — چرا پیدا نمی‌گردد قیامت
بہ نفخ صور تعویق از پی چیست — قیامت را عنان گیر جنون کیست
سویِ کاشی بہ اندازِ اشارت — تبسم کرد و گفتا، این عمارت
کہ حقا نیست صانع را گوارا — کہ از ہم ریزد این رنگین بنا را
بلند افتادہ تمکین بنارس — بود بر اوج او اندیشہ فارس
الا ای غالبِ کار اوفتادہ — ز چشم یار و اغیار اوفتادہ
ز خویش و آشنا بیگانہ گشتہ — جنون گل کردہ و دیوانہ گشتہ
چہ محشر سرزد از آب و گِل تو — دریغا از تو و آہ از دلِ تو
چہ جویی جلوہ زین رنگین چمن‌ہا — بہشتِ خویش شو از خون شدن‌ہا
جُنونت گر بہ نفسِ خود تمام است — ز کاشی تا بہ کاشان نیم گام است
چو بوی گل ز پیراہن برون آی — بہ آزادی ز بندِ تن برون آی

مدہ از کف طریق معرفت را — سرت گردم بہ گرد این شش جہت را
فروماندن بہ کاشی نارسایی‌ست — خدا را این چہ کافر ماجرایی‌ست
ازین دعوا بہ آتش شوی لب را — بخوان غمنامۂ ذوقِ طلب را
بہ کاشی لختی از کاشانہ یاد آر — درین جنت ازان ویرانہ یاد آر
دریغا در وطن واماندہ‌ای چند — بہ خونِ دیدہ زورق راندہ‌ای چند
ہوس را پای در دامن شکستہ — بہ امیدِ تو چشم از خویش بستہ
بہ شہر از بی‌کسی صحرانشینان — بہ روی آتشِ دل جاگزینان
مگر کان قوم را دہر آفریدہ — ز سیمابی بر آتش آرمیدہ
ہمہ در خاک و خون افگندۂ تو — بہ حکمِ بی‌کسی‌ہا بندۂ تو
چو شمع از داغِ دل آذر فشانان — بہ بزمِ عرضِ دعوا بی‌زبانان
سر و سرمایہ غارت کردۂ تو — ز تو نالان ولی در پردۂ تو
از آنانت تغافل خوشنما نیست — بہ داغِ شان ہوای گل روا نیست
ترا ای بی‌خبر کاری‌ست در پیش — بیابانی و کہساری‌ست در پیش
چو سیلابت شتابان می‌توان رفت — بیابان در بیابان می‌توان رفت
ترا ز اندوہ مجنون بود باید — خرابِ کوہ و ہامون بود باید
تن آسانی بہ تاراجِ بلا دہ — چو بینی رنجِ خود را رونما دہ
ہوس را سر بہ بالین فنا نہ — نفس را از دل آتش زیرِ پا نہ
دل از تاب بلا بگذار و خون کن — ز دانش کار نگشاید جنون کن
نفس تا خود فرو ننشیند از پای — دمی از جادہ پیمایی میاسای
شرار آسا فنا آمادہ برخیز — بیفشان دامن و آزادہ برخیز
ز اِلّا دم زن و تسلیمِ لاَ شو — بگو اَللہ و برقِ ماسوا شو

☆☆☆

طاق نسیاں سے

مثنوی توشۂ راہ

مولوی محمد انور شاہ کشمیری

مقدمہ، تصحیح و ترجمہ

فیضان حیدر

مقدمہ

فارسی ادب کی تقریباً تمام منظوم و منثور اصناف پر مختلف پہلوؤں سے وقیع تحقیقی اور تنقیدی کام ہوئے ہیں لیکن سفرناموں کے حوالے سے ابھی میدان خالی نظر آتا ہے۔ خصوصاً منظوم سفرناموں پر سنجیدگی اور باقاعدگی سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

ہندوستان میں فارسی سفرناموں خصوصاً منظوم سفرناموں پر تو تحقیقی کام خال خال ہی نظر آتا ہے۔ ہندوستان میں فارسی سفرناموں کے حوالے سے حقیر نے اپنا ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا ہے جس پر بنارس ہندو یونیورسٹی نے مئی ۲۰۱۹ء میں ڈاکٹریٹ کی سند سے نوازا۔ اس مقالے میں ہندوستان میں لکھے گئے ۲۳۲ فارسی منظوم و منثور سفرناموں کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ 'توشۂ راہ' انھیں منظوم سفرناموں میں سے ہے جو ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۴ء میں طبع ہو کر منظر عام پر آیا۔ لیکن اس کے اب چند نسخے ہی لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ اس کی قدامت اور اہمیت کے پیش نظر اس کا ترجمہ مع مختصر تعارف مصنف پیش کیا گیا ہے۔

مثنوی کے شاعر کا نام مولوی محمد انور شاہ اور والد کا نام محمد اسماعیل شاہ قادری تھا۔ کشمیر کے رہنے والے تھے اس لیے کشمیری کے لقب سے جانے جاتے ہیں۔ بارہ سال کے تھے کہ والد دار فانی سے کوچ کر گئے اور تلاش معاش کی تمام تر ذمہ داریاں ان کے سر آ گئیں۔ کچھ دن کشمیر میں ہی تلاش معاش میں سرگرداں رہے لیکن اپنے مرشد خواجہ طیب صاحب رفیقی کے اشارے پر انھوں نے امرتسر میں سکونت اختیار کر لی۔ تلاش معاش کی فکر اس کے بعد بھی لاحق رہی چنانچہ اس سلسلے میں انھوں نے دہلی، اکبرآباد اور جے پور وغیرہ کا سفر کیا، لیکن انھیں اطمینان خاطر نصیب نہیں ہوا۔ اس لیے وہ اجمیر کی طرف روانہ ہو گئے اور وہاں خواجہ معین الدین کے مزار پر حاضری دی اور ان کی بارگاہ میں منقبت خوانی کی۔

آدھی رات کے قریب ان کو نیند آ گئی۔ خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ خواجہ معین الدین چشتی تشریف فرما ہیں اور ان سے کہہ رہے ہیں کہ تم رام پور کا سفر کرو۔ وہاں کے نواب کلب علی خان ہیں جو بہت ہی شفیق اور سخی ہیں۔ وہاں جانے کے بعد تمھاری حالت میں یکسر تبدیلی آ جائے گی۔

خواب سے بیدار ہوتے ہی انھوں نے سامان سفر تیار کیا اور عازم رام پور ہوئے۔ رام پور پہنچنے کے بعد دربار میں رسائی کے لیے ہفتوں اِدھر اُدھر بھٹکتے اور دردر کی خاک چھانتے رہے۔ اسی دوران ان کی ملاقات مولوی محمد عثمان سے ہوئی جو کلب علی خان کے مشیر اور وزیر تھے۔ چنانچہ کچھ اشعار ان کی شان میں کہہ کر ان کے یہاں حاضری دی اور ان کو یہ اشعار سنایا۔ مولوی صاحب بہت ہی نرم دل اور تواضع سے پیش آئے اور ان سے اشعار سننے کے بعد کہا کہ میری شان میں جو اشعار کہے ہیں میں ان کا متحمل نہیں ہوں۔ تم نواب کلب علی خان کی شان میں اشعار کہو، وہ تمھیں اپنی بخشش اور کرم سے نوازیں گے۔

بہرصورت نواب کی شان میں اشعار کہے اور مولوی محمد عثمان صاحب کے توسط سے نواب کے دربار میں پہنچے۔ نواب نے انھیں اپنے انعام و اکرام سے نوازا اور ان کے دل کی مراد پوری ہوئی۔ بعد میں مصنف نے ان مدحیہ اشعار کو اپنے سفر کے دوران کہے گئے اشعار کے ساتھ مثنوی کی صورت میں ۱۲۹۰ھ میں شائع کیا۔

ہم بخوبی واقف ہیں کہ مسافر کا سفر جبری اور سیاح کا سفر اختیاری ہوتا ہے۔ اس کے باوجود انورؔ راستے کے تمام مناظر کو بوجھ اور دشوار نہیں سمجھتے بلکہ ایک سیاح کی طرح ذوق وشوق سے دیکھتے اور راستے کی تمام مشکلات کو خندہ پیشانی سے قبول کرتے ہیں۔ وہ اپنے سفر میں جن جن مقامات سے گزرے انھیں بہ نظر غائر دیکھا۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ زندگی اور فن کو الگ الگ نہیں سمجھتے۔

'توشۂ راہ' محض واقعات کا ہی بیان نہیں ہے بلکہ زبان و بیان، الفاظ کے انتخاب و ترتیب اور روانی کی وجہ سے اس مثنوی میں ایک اچھوتا پن پیدا ہو گیا ہے۔ انھوں نے جس چیز کو جیسے دیکھا بلا تامل نظم کر دیا جو اس مثنوی کا طرۂ امتیاز ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ سچ کڑوا ہوتا ہے لیکن مشاہدے میں آتا ہے کہ اکثر سچی بات کڑوی نہیں ہوتی بلکہ اس کے کہنے کا انداز کڑوا ہوتا ہے۔ مصنف نے منظر کشی میں زبان معتدل استعمال کی ہے۔ جہاں خوبیوں کا تذکرہ کیا ہے وہیں خامیاں بھی بیان کی ہیں۔ تاہم مدحیہ اور ہجویہ اشعار کو موثر بنانے کے لیے مبالغے سے بھی کام لیا ہے، جو مثنوی کا امتیازی وصف ہے۔

مصنف نے اس مثنوی کو نو عنوانات پر تقسیم کیا ہے۔ اس کا آغاز حمد و نعت سے ہوا ہے۔ اس کے بعد اپنے والد کے احوال قلمبند کیے ہیں۔ پھر خواجہ طیب صاحب کی مدح سرائی کی ہے۔ اس کے بعد ساقی شراب حقیقی سے خطاب کرتے ہوئے شراب حقیقی کی درخواست کی ہے۔ گویا اسی کے بعد اس مثنوی کی فضا آمادہ ہو جاتی ہے اور شاعر کا ذہن سفر کے حالات قلمبند کرنے اور ممدوح کی مدح سرائی کی طرف مائل ہو جاتا

ہے۔ اپنے اس سفر میں ہندوستان کے مختلف شہروں از جملہ دہلی، اکبرآباد، جے پور، اجمیر اور رام پور کے سفر میں جن جن مشکلات اور آسانیوں سے گزرے ہیں ان کا بیان بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔

کوئی بھی سیاح جب کسی قریہ، شہر اور ملک سے گزرتا ہے تو وہ چشم دید واقعات کا گواہ بن جاتا ہے۔ وہ دیدہ علاقوں کی معلومات فراہم کرنے کے ساتھ اپنا مشاہدہ بھی پیش کرتا ہے۔ انورؔ جب دلی سے گزرے تو وہاں انھیں گھٹن کا احساس ہو رہا تھا چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ دہلی خوش حالی اور آسودگی کی جگہ ہے لیکن مجھے لمحہ بھر بھی وہاں چین وسکون نہیں ملا۔ کیوں کہ غدر کے بعد سے اس شہر پر مردنی چھائی ہوئی ہے۔ وہاں لوگ کبر ونخوت سے پیش آتے ہیں، ان کے اندر انسانیت دور دور تک نہیں دکھائی دیتی۔ وہاں جاہلوں کو جاہ و منزلت دی جاتی ہے اور اہل علم و ہنر بے قدر ہیں۔ اس کے باوجود وہاں کے لوگ کبر ونخوت اور غرور وتکبر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

اسی طرح اکبرآباد کے سلسلے میں بھی وہ اسی قسم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ بلکہ وہاں ایک اور خرابی کا تذکرہ کیا ہے کہ وہاں کے لوگ چاہے مرد ہوں یا عورت سبھی فاسق و فاجر ہیں اور وہ شیطان کے رہنے کے لیے بہت ہی مناسب جگہ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

طعنہ بر خود زدم بہ دیدن او   تلخ عیشم شد از رسیدن او
پیر و برنا ہمہ صغیر و کبیر   سنگدل، تنگدست و فتنہ پذیر
مرد و زن فاسق و فساد انگیز   ہر یکی بر حرام کاری تیز
کار ابلیس گرچہ ست شود   چون در آن جا رود درست شود

اسی طرح شہر جے پور کی انھوں نے تعریف وتوصیف کی ہے لیکن اس بات پر تاسف کا اظہار کیا ہے کہ وہاں مسلمانوں کا نام ونشان بھی نہیں ہے۔ اس کے بعد شہر اجمیر کی تعریف وتوصیف کی ہے اور اپنے اس خواب کا ذکر کیا ہے جس میں ان کے مرشد حقیقی خواجہ معین الدین چشتی کے خواب میں آنے اور بشارت دینے کا تذکرہ ہے۔

شاعر جب رام پور میں وارد ہوتا ہے تو اس کے تمام رنج والم اور محنت ومشقت دفع ہو جاتی ہے۔ رام پور کی تعریف وتوصیف میں بڑے عمدہ اشعار کہے ہیں جو زبان و بیان اور طرز اظہار کی وجہ سے بھی ہندوستان کے دور آخر کے فارسی شاعروں کے ہم پلہ نظر آتے ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

رفت فرسودگی بہ دیدن او   شد غمم دور از رسیدن او

وہ چہ شہریست قابل توصیف مردمان احسن و سعید و شریف
صورت گلشن ست ہر خانہ کہ شود عقل و ہوش دیوانہ
بر سر قصر و کاخ ایوان ہا شیفتہ دل، فریفتہ جان ہا

اس کے بعد مولوی محمد عثمان صاحب کی مدح میں چند اشعار ہیں۔ پھر نواب موصوف کی تعریف وتمجید میں اشعار کہے ہیں۔ اس کے بعد مثنوی تکمیل کو پہنچتی ہے۔ اس منظوم سفر نامے میں شہروں کی الگ الگ تعریف وتوصیف اوران کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

طرزِ اظہار کے لحاظ سے یہ مثنوی سادگی، روانی کی بہترین مثال ہے۔ الفاظ کی ترتیب سے صوتی آہنگ پیدا ہوگیا ہے۔ بیان میں تازگی، شگفتگی، خیال میں بلندی اور ندرت موجود ہے۔ انھوں نے اس زمانے کی عام ہندوستانی فارسی زبان کو اپنی مثنوی میں استعمال کیا اور تخلیقی سطح پر اس میں ادبیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مناظر کی عکاسی کے وقت اپنی شاعرانہ بصیرت سے بھی کام لیا ہے۔ ان کے یہاں جو تجربات و مشاہدات سے معمور تخلیقی فضا پائی جاتی ہے اس سے ان کی شاعرانہ بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ البتہ کہیں کہیں زبان و بیان کی ناہمواری کھٹکتی ہے اور قواعد عروض سے روگردانی بھی۔ لیکن اس سے ان کا فن مجروح نہیں ہوتا۔

(فیضان حیدر)

مقدمۂ مصنف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، حامداً لِمَن جَعَلَ جنتان کلّ عارف مخزن اسرار کمالہ، ولسان کل واصف مطلع انوار جمالہ، ومصلیا علیٰ من نظم جواہر برہٖ ونوالہٖ، ونشر صحائف منّہ وافضالہ محمد وعترتہ وآلہ واصحابہ امابعد، خوشہ چین خرمن ارباب سخن وسِیَر، محمد انور عفی اللہ عنہ می گوید کہ چنان بہ حکم لم یزلی ارادۂ آمدن پنجاب از خطۂ کشمیر بہ اشارۂ مرشد تحقیقی خواجہ محمد طیب صاحب رفیقی نوّر اللہ مضجعہ مصمم شدہ متوطن شہر امرتسر شدم۔ چنانچہ نبذی از حسب حال خود و برخی از مقامات والد بزرگوار خود محمد اسماعیل شاہ قادری طاب اللہ ثراہ واز اختیار نمودن سفر ہندوستان ومشاہدہ نمودن بعض بلدان ومشرف شدن در عالم رؤیا بہ دیدار نور بار جناب حضرت خواجہ معین الدین چشتی روّح اللہ روحہ الکریم واوصل الینا فتوحہ العظیم وبہ ایمای آن جناب فیض مآب وارد شدن در مصطفی آباد کہ فی الحال مشہور بہ رام پور است، در این مثنوی کہ مسمی بہ 'توشۂ راہ' است حوالہ قلم کردہ آمد ودر آن جا رسیدہ باریاب شدن محفل اقدس جناب حضور گنجور نواب صاحب بہادر، دام شوکتہ، بہ توسل مولوی محمد عثمان خان کہ وزیر ومشیر نواب صاحب ممدوح بود، نیز درج مثنوی نمودہ شد۔

از آن باز فضل باری عز اسمہ شامل حال این خاکسار شدہ، انواع انواع بخشش ہا وعطاہا از سرکار فیض مدار عاید می گردد۔ امید از ناظرین این کہ ہرگاہ در کدام جا خطای لفظی یا معنوی واقع شدہ باشد بہ ذیل عفو وکرم بپوشند وبر کریمۂ 'تخلقوا باخلاق اللہ' کار فرما شوند ومن اللہ الکون والکون والعصمۃ والتوفیق والعون۔

مثنوی 'توشۂ راہ' مع اردو ترجمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابتدا می کنم بہ بسم اللہ کہ انیس من است و توشۂ راہ
اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو میرا مونس اور زادراہ ہے۔

بعدِ حمد و ستایش داور نعت خیرالوریٰ بود بہتر
خداوند عالم کی حمد وثنا کے بعد افضل مخلوقات پیغمبر اکرم (ص) کی مدح سرائی بہتر ہے۔

شاہد مقصدِ جناب ودود   فخرِ عالم محمد محمود

لائق ستائش محمد (ص) خداوند عالم کے مقصود کے گواہ اور فخر موجودات ہیں۔

آن کہ او ہست زیب موجودات   اشرف الانبیا، شفیع عصات

اور یہ کہ وہ تمام اشیا کی زیب و زینت، انبیا سے افضل اور گنہگاروں کی شفاعت کرنے والے ہیں۔

صدر تاجِ لعمرک و لولاک   بدرِ قدرِ سپہرِ ارسلناک

حدیثِ 'لولاک' اور 'لعمرک' کے تاجدار ہیں اور حدیث 'ارسلناک' کے آسمان عزت و مکرمت میں چار چاند لگانے والے ہیں۔

خاتم المرسلین حبیبِ خدا   قاب قوسین مقام او ادنیٰ

آخری رسول اور اللہ کے حبیب ہیں، (جب معراج پر اللہ سے ملنے گئے تو) ان کا مقام اللہ سے دو کمان یا اس سے کم کا فاصلہ تھا۔

آفتاب ست او، ہمہ اصحاب   فی الحقیقت چو انجم و مہتاب

دراصل وہ آفتاب کی مانند ہیں اور تمام اصحاب پیغمبر چاند اور ستارے کی مانند۔

بر وی و پیروان و یارانش   بر ہمہ آل و دوستدارانش

ان پر، ان کے پیروکاروں، دوستوں اور ان کی آلِ پاک اور ان کے چاہنے والوں پر۔

سال و مہ روز و شب بہ صبح و بہ شام   تحفہ از ما صلوٰۃ و ہدیہ سلام

سال، مہینے، شب و روز اور صبح و شام ہماری طرف سے تحفۂ درود اور ہدیۂ سلام ہو۔

در حسب حال خال خود مع مدحیۂ والد ماجد مولوی معنوی محمد اسماعیل شاہ قادری نور اللہ مرقدہٗ گوید:

گوش یعنی بہ گوشِ جان بشنو   می کنم حال دل بیان بشنو

سنو اور جی لگا کے سنو! میں اپنے دل کا حال بیان کرتا ہوں سنو!

دوازدہ سالہ بودہ ام پدرم   از سرم رفت و کرد در بہ درم

میں بارہ سال کا تھا کہ مرے باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور میں در بدر ہو گیا۔

بود ذی جود عارفِ کامل   صاحب خرق و عالم عامل

وہ سخی، عارف کامل، تصوف میں اعلیٰ مقام پر فائز اور عالم باعمل تھے۔

ملک معنی بہ زیر فرمان داشت   سیرتش حُسن صورتِ جان داشت

گنجینۂ معانی ان کے حکم کا تابعدار تھا۔ ان کی سیرت ان کی حسنِ صورت کی جان تھی۔

بود بی زنگِ کینہ اش سینہ   نیک و بد را مثال آیینہ

ان کا سینہ کینہ سے زنگ آلود نہیں تھا اور ان کی خوبیاں اور خامیاں آئینے کی طرح روشن تھیں۔

طاریش گر شدی غم و دردی   یاد مولای خویشتن کردی

جب وہ درد و غم میں مبتلا ہوتے تو اپنے مولا کو یاد کرتے۔

وصفِ پاکش چسان کنم تقریر   کہ فزون ست از حدِ تحریر

میں ان کی توصیف کیسے کروں کہ ان کے اوصاف حد تحریر سے باہر ہیں۔

بارہا کردی از وضوی عشا   سنت و نفل و فرض صبح ادا

انھوں نے بارہا نماز عشا کے وضو سے صبح کی سنت، نافلہ اور واجب نماز ادا کی۔

روی پر نور مطلع انوار   خوی مشکور مخزن الاسرار

ان کا نورانی چہرہ انوار کا افق تھا۔ ان کی پسندیدہ خصلت رازوں کا خزینہ تھی۔

کس نبودہ ورا عدیل و نظیر   در احادیث و فقہ و تفسیر

علم حدیث، فقہ اور تفسیر میں کوئی ان کا مثل اور ہم رتبہ نہیں تھا۔

اسمِ آن برگزیدۂ یزدان   گویمت خوان تحیّت از دل و جان

اللہ کے اس برگزیدہ بندے کا نام تمہارے سامنے لیتا ہوں، دل و جان سے ان پر سلام بھیجو۔

مُقبل بارگاہ ربِّ جلیل   میر واعظ محمد اسماعیل

خداوند عالم کی بارگاہ میں مقبول اور پسندیدہ تھے جن کا نام میر واعظ محمد اسماعیل تھا۔

گر بہ ہر موی من زبان گردد   وصفِ او کی ز ما بیان گردد

اگر میرے روئیں روئیں کو قوت گویائی عطا کر دی جائے تب بھی ان کے اوصاف بیان نہیں کر سکتا۔

رمز حسنِ معانیش بشنو   سمّہ ای غیب دانیش بشنو

ان کے حسن معانی کا راز سنو! ان کی غیب دانی کا ایک چھوٹا سا واقعہ سنو!

کہ بہ کشمیر اوفتاد وبا   خلق گشتند مضطرب ہر جا

کہ ایک بار کشمیر میں وبا پھیل گئی اور ہر جگہ کے عوام حیران و پریشان ہو گئے۔

الامان الامان جہان می گفت   خبر زیست ہیچ کس نشنفت

پوری دنیا الامان الامان کی آواز بلند کر رہی تھی اور کسی نے زندگی کی خبر نہیں سنی۔

کہ تغیر بہ ہر زمانی شد   مبتلای بلا جہانی شد

کہ ہر زمانے میں تغیر ہوتا رہا اور ایک دنیا مبتلائے مصیبت ہوگئی۔

چونکہ از صد یکی نیافت شفا   نی دوا کارگر شدہ نہ دُعا

جب سو میں سے ایک شخص کو بھی شفا نہ ملی، نہ دوا نے کام کیا اور نہ ہی دعا نے۔

مردمان مجتمع شدند ہمہ   پیش آن حضرت آمدند ہمہ

تمام افراد جمع ہو کر ان کی خدمت میں آئے۔

ہر یکی الغیاث گفت و شنید   سوی مردم بہ خندہ رویی دید

ہر شخص المدد کہہ اور سن رہا تھا، انھوں نے خندہ پیشانی سے لوگوں کی طرف دیکھا۔

جانبِ خلق گفت خوش باشید   خون مپاشید و سینہ مخراشید

لوگوں سے کہا کہ خوش و خرم رہو اور جزع فزع مت کرو۔

ہان بہ حل از شما ہمی خواہم   گرچہ نامہ سیاہ و گمراہم

ہاں میں آپ لوگوں کے لیے حل تلاش کرتا ہوں اگرچہ خطا کار اور بدبخت ہوں۔

صبح فردا روم بہ جانب دوست   کُو مرا یار و یاور و دلجوست

کل صبح اپنے دوست (اللہ) کی بارگاہ میں حاضری دوں گا کیوں کہ وہ میرا مددگار اور دلجو ہے۔

خواہم از عجز عفوِ تقصیرات   زین بلا خلق را دہند نجات

میں عاجزی کے ساتھ گناہوں کی معافی مانگوں گا تا کہ وہ اس مصیبت و بلا سے لوگوں کو نجات دے۔

این بشارت بہ سمع خلق رسید   ہر یکی شادکام و خوش گردید

جب یہ بشارت لوگوں نے سنی تو سبھی خوش و خرّم ہو گئے۔

روز و آن شب گذشت سرتاسر   خواند تہلیل و خفت بر بستر

وہ پورا دن اور پوری رات گزر گئی اور وہ ذکرِ خدا میں مصروف رہے اور بستر پر سوئے۔

واصل حق شد آن حبیب خدا   روّح اللہ رَوحہ اَبدا

اللہ کے اس حبیب نے اللہ سے ملاقات کی۔ اللہ ان کی روح کو ہمیشہ شاد رکھے۔

یک قلم ز انتقالِ آن مسعود   شد وبا دور آن چنان کہ نبود

اس بابرکت ذات کی منتقلی سے مصیبت اور بلا ایسے دور ہوئی جیسے تھی ہی نہیں۔

اللہ اللہ کزو شدہ اظہر   این چنین صد کرامت دیگر

اللہ اللہ ان سے ایسی سیکڑوں دوسری کرامات ظاہر ہوئیں۔

کوست جای فراخ و پہن و دراز   کہ بہ احوال خویش گریم باز

کہاں ہے وہ وسیع و عریض اور کشادہ جگہ جہاں اپنے حالات پر گریہ و زاری کروں۔

زانکہ آن گنجِ علم و فضل و ہنر   از سرم رفتہ و شدم بی سر

کیوں کہ وہ علم و فضل اور ہنر کا معدن (کا سایہ) میرے سر سے اٹھ گیا اور میں بے یار و مددگار ہو گیا۔

خورد بودم دمی نیاسودم   بسکہ فکرِ معاش افزودم

میں بچہ تھا اور مجھے ایک لمحے بھی آسودگی نہیں ملی اور اس پر مزید فکرِ معاش بھی لاحق ہو گئی۔

حیف کز بختِ سخت و طالع شوم   ماندم از علم سر بہ سر محروم

افسوس کہ بدبختی اور بدقسمتی سے میں علم سے یکسر محروم رہا۔

گرچہ ظاہر نمودہ ام تگ و پو   بہرِ تحصیل علم در ہر سو

اگرچہ میں نے ظاہراً علم حاصل کرنے کے لیے ہر طرف تگ و دو کی۔

دست و پایی زدیم و کار نشد   رہبرم عقل و بخت یار نشد

ہم نے بہت کوشش کی لیکن بے فائدہ رہی، میری عقل نے رہنمائی نہیں کی اور میرے نصیب نے ساتھ نہیں دیا۔

در مدحِ پیرِ روشن ضمیر جناب خواجہ طیب صاحب رفیقی رحمۃ اللہ علیہ گوید:

خواجہ طیب کہ بود سالکِ دہر   ہادی و مقتدای مردم شہر

خواجہ طیب جو سالکِ دہر اور شہر کے لوگوں کے رہنما اور پیشوا تھے۔

واقف شرع و معرفت آگاہ   فی الحقیقت محیطِ فیضِ الہ

شریعت سے واقف اور معرفتِ خداوندی سے آگاہ تھے۔ دراصل اللہ کا فیض ان کی پوری ذات کو محیط تھا۔

در طریقت یگانہ مرد و رشید   راحم و اکرم و وحید و فرید

سیر و سلوک کی راہ میں یکتا اور ہدایت کرنے والے، رحم کرنے والے، کریم اور یگانہ و منفرد تھے۔

معدنِ فیض و مجمع الحسنات   مخزن علم و قاضی الحاجات

فیض کا معدن اور نیکیوں کا مجموعہ، علم کا مخزن اور ضرورتوں کو برلانے والے۔

جای حاجت برآمدِ فقرا   عین وحدت سرآمدِ صلحا

ضرورتمندوں اور مستمندوں کی حاجت پورا کرنے والے، عین وحدت اور صالحین کے سردار۔

بی حد و حصر خرق عاداتش بهره‌ور عالم از کراماتش

ان کی کرامات بےحد و بےشمار ہیں (یہاں تک کہ) عالم ان کی کرامات سے بہرہ مند ہیں۔

با یزید زمان مسیحا دم فخرِ دوران شہِ سریر کرم

وہ زمانے کے بایزید، مسیحادم، فخر زمانہ اور جود و کرم کے تخت کے شہنشاہ تھے۔

یک شبانہ بہ خدمت پاکش رفتہ بنہادہ جبہہ بر خاکش

ایک رات میں ان کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوا اور وہاں پہنچ کر خاک پر پیشانی رکھی۔

عرض کردم کہ ای مُطاعِ زمان کن ترحّم بہ ما، ز غم برہان

میں نے عرض کیا کہ اے مطاع دوراں ہمارے حال پر رحم کیجیے اور ہمیں غم سے نجات دلا دیجیے۔

گفت بردار سر تو خوش دل باش علم برخوان مدار فکرِ معاش

انھوں نے کہا کہ تو اپنا سر اٹھا اور خوش و خرّم رہ۔ علم حاصل کر اور روزی روٹی کی فکر چھوڑ دے۔

مژدہ‌ای می‌دہم ترا فی الحال کہ بہ پنجاب کن سفر امسال

میں فی الحال تجھے ایک خوش خبری دیتا ہوں کہ تم اس سال پنجاب کا سفر کرو۔

از سفر رتبتت عجیب شود فتح و فیروزیت نصیب شود

سفر سے تیرا رتبہ کیا ہی عجیب ہوگا اور تمہیں فتح و کامرانی نصیب ہوگی۔

چون ز ایمای آن گران مایہ آسمان پایہ و ہما سایہ

جب اس گرانقدر، بلند اور بابرکت ذات کے اشارے پر۔

عزمِ پنجاب شد مرا دلگیر کوچ کردم گذاشتم کشمیر

مجھے پنجاب کے سفر کا عزم لاحق ہوا اور میں کشمیر کو ترک کر کے پنجاب کی طرف روانہ ہوا۔

سختی و ظلم و درد و رنج و عذاب بسپردم ہمہ بہ راجہ گلاب

سختی، ظلم، درد اور رنج و الم سب راجا گلاب کے حوالے کر دئے۔

والیِ خلق و ملک بود و رئیس جابر و ظالم و خبیث و خسیس

وہ اس ملک اور وہاں کے باسیوں کا والی اور رئیس تھا۔ جفا کار، ظالم، پلید اور کمینہ تھا۔

نیتش بسکہ منقلب بودہ ہیچ کس در جہان نیاسودہ

اس کی نیت اس قدر خراب تھی کہ کوئی شخص دنیا میں آرام نہ پا سکا۔

من کہ از چنگ ظلم او رستم مستم و با خوشی پیوستم

میں جو کہ اس کے ظلم کے چنگل سے نجات پا گیا، مگن ہوں اور مجھے خوشی مل گئی۔

مستقل گشتہ ساختم خوشتر مسکن خود بہ شہر امرتسر

میں نے مستقل اپنا بہتر مسکن شہر امرتسر میں بنا لیا۔

بہر تحصیل علم خوردم خون تا کہ گشتہ طبیعتم موزون

میں نے علم حاصل کرنے کے لیے خون جگر پیا یہاں تک کہ میری طبیعت موزوں ہو گئی۔

این زمان شاعریست پیشۂ ما شیرم و سریست بیشۂ ما

اس وقت شاعری ہمارا پیشہ ہے، میں اس میدان کا شیر ہوں اور سیر و سیاحت ہمارا کچھار ہے۔

گرچہ سرگشتہ حال و غمزدہ‌ام خوار و دل خستہ و ستم زدہ‌ام

اگرچہ میں پریشاں حال، غمزدہ، بےوقعت، دل شکستہ اور ستایا ہوا ہوں۔

لیک در شعر چست و چالاکم طعنہ بخش دبیر افلاکم

لیکن شعر گوئی میں چاق و چوبند ہوں یہاں تک کہ آسمان کے منشی یعنی عطارد کو طعنہ زن ہوں۔

گر زبانم شود بہ مدح قرین روحِ عرفی مرا کند تحسین

اگر میری زبان کسی کی مدح کے لیے وا ہو جائے تو عرفی جیسے شاعر کی روح آفریں کہتی ہے۔

ور گشایم بہ ہزل و ہجو زبان لرزہ افتد بہ گورِ نعمت خان

اور اگر ہجو و ہزل میں اپنی زبان کھول دوں تو نعمت خان عالی کی قبر لرز جاتی ہے۔

خطاب بہ ساقی بہ درخواست شراب حقیقی

بی سرم ساقیا سرت گردم یکدمی باش یار و ہمدردم

اے ساقی! مدہوش ہوں لمحہ بھر کے لیے میرا ساتھ دے تا کہ ہوش میں آ جاؤں۔

کز بغل شیشۂ شراب بکش دی و سردیست آفتاب بکش

بغل سے شراب کا پیالہ لے لے، دی (ایرانی سال کا دسواں مہینہ) اور سردی کا مہینہ ہے اس لیے آفتاب کو لے لے۔

کن کرم دہ بہ من میِ گلرنگ دُور گردد ز دورش از دل زنگ

مہربانی کر کے مجھے شراب سرخ دے تا کہ اس کے دور سے دل سے کدورت دور ہو جائے۔

می کہ بہبودی دل و جانست می کہ نورِ ظہورِ ایمانست

ایسی شراب جس سے دل و جان کو تازگی ملے، ایسی شراب جو ظہور ایمان کی روشنی ہے۔

می کہ یک قطرہ مستیم بخشد   نفرت از کبر و ہستیم بخشد

ایسی شراب جس کا ایک ایک قطرہ مجھے بدمست کردے اور مجھے خودی اور غرور سے بچائے۔

می کہ شیرین بود چو بوسۂ یار   می برد تلخی غمم یک بار

ایسی شراب جو معشوق کے بوسہ کی مانند شیریں ہو، جو میرے غم کی تلخی کو یکبارگی دور کردے۔

می کہ قربم دہد بہ مقصدہا   می کہ دورم گذارد از من و ما

ایسی شراب جو مجھے مقصود سے قریب کرے۔ ایسی شراب جو مجھے انانیت سے بچائے۔

می سنگین چو نالۂ بلبل   می رنگین چو روی لالہ و گل

ایسی گراں شراب جو نالۂ بلبل کی مانند ہو، ایسی رنگین شراب جو پھول اور گل جیسی ہو۔

می بیغش چو صورت خوبان   می دلکش چو حسنِ محبوبان

خالص شراب جو معشوق کے چہرے کی طرح ہو، معشوقوں کے حسن کی طرح دلکش شراب۔

می تلخی زُدا کزو فرہاد   جرعہ‌ای خورد و جان شیرین داد

تلخی دور کرنے والی شراب کہ جس کا ایک گھونٹ پی کر فرہاد نے اپنی شیریں جان دے دی۔

می کہ مجنون از آن شدہ شیدا   گشت ظاہر بہانہ‌اش لیلیٰ

ایسی شراب جس سے مجنوں بےخود ہوا اور اس کا بہانہ لیلیٰ ہوئی۔

می کہ یوسف مثال چہرہ فروخت   پردۂ عصمتِ زلیخا سوخت

ایسی شراب جس نے یوسف جیسے چہرے کو بیچ دیا اور زلیخا کی عصمت کا پردہ چاک کردیا۔

می کہ گشتہ دمی بہ وامق یار   شدہ عذرا گرفت صبر و قرار

ایسی شراب جو لمحہ بھر کے لیے وامق کی ہمدم بنی اور عذرا کا چین وسکون جاتا رہا۔

می کہ با رانجہ خواند مدحت ہیر   ہر دو را کرد پای در زنجیر

ایسی شراب جس نے رانجھا کے سامنے ہیر کی مدح کی اور دونوں کے پیر میں زنجیر ڈال دی۔

می لعلی چو جوہرِ یاقوت   کان بہ جان قوتست و دل را قوت

سرخ شراب جو یاقوت کی طرح روح کو قوت بخشنے والی اور دل کی خوراک ہے۔

می کہ از جوہرش بلا تاخیر   مدعای دلی کنم تحریر

ایسی شراب جس کی مستی سے میں فوراً اپنے دل کا مدعا تحریر کروں۔

طرح اطوار خوب و زشت دہم   شرح اسرار سرنوشت دہم

اچھے اور برے طور طریقوں کا بیان کروں اور اپنی قسمت کے رازوں کو آشکار کروں۔

در بیان سفر ہندوستان وتذکرۂ حسن وقبح کہ بہ مشاہدہ آمدہ وحقیقت شہر دہلی گوید:

ہمتم چون انیس و ہمدم شد   عزم ہندوستان مصمم شد

جب میری ہمت میری مونس اور مصاحب ہوئی تو میں نے ہندوستان کے سفر کا پکا ارادہ کرلیا۔

شہرہا دیدم و نیاسودم   ہیچ جا دل نگشت خوشنودم

میں شہر شہر پھرتا رہا لیکن مجھے کچھ بھی آرام نصیب نہیں ہوا اور کہیں میرا دل خوش نہیں ہوا۔

شہرِ دہلی مقام خوشحالیست   بی زر و خورد و خواب باید زیست

شہر دہلی اگرچہ خوشحالی کا مقام ہے لیکن وہاں محتاجی، بھوک اور بےخوابی کے ساتھ زندگی گزارنی پڑتی ہے۔

گشتہ از روز غدر سر تا سر   متغیر چو راجۂ الور

پوری دلی غدر کے دن سے ہی راجا الور کی طرح دگرگوں ہے۔

صورتِ نخوت ست در مردم   مردمی سر بہ سر چو عنقا گُم

لوگوں میں کبر ونخوت ہے اور ان کے اندر انسانیت عنقا کی طرح گم ہے۔

چُست و چالاک، جاہلان اکثر   خوار و بی قدر صاحبان ہنر

جاہل اکثر چالاک و چوبند ہیں اور صاحبان ہنر ذلیل و ناقدر۔

چہ بد و نیک چہ گدا و چہ شاہ   از ہمہ در ہمہ خداست گواہ

کیا برے اور کیا اچھے، کیا فقیر اور کیا بادشاہ، خدا گواہ ہے کہ سب ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے ہیں۔

گرچہ معدوم بخشش و جودست   تاب سُبلت ہنوز موجود است

اگرچہ ان کے اندر جود وسخاوت ختم ہوچکی ہے پھر بھی ابھی ان کی مونچھ پر تاؤ موجود ہے۔

یعنی ای صاحبان فضل و ہنر   کز ہزاران سخن یکی بہتر

یعنی اے صاحبان فضل وہنر! ہزار بات سے ایک بات بہتر ہے۔

جملہ خورد و بزرگ را دیدم   طرزِ پاکیزگی پسندیدم

میں نے سبھی چھوٹے بڑے کو دیکھا اور پاکیزگی کی راہ اختیار کرلی۔

در حقیقت اکبر آباد

آگرہ آن کہ اکبر آبادست   خستہ نو جستہ کہنہ بنیادست

آگرہ جو کہ اکبر آباد ہے، تباہ وبرباد، خراب اور کہنہ بنیاد ہے۔

جمع ہر سو بہ کوچہ و بازار   خاک وخس، خاص و عام، گرد و غبار

کوچہ وبازار میں ہرطرف خس وخاشاک، گردوغبار اڑتے اورخاص وعام پھرتے ہیں۔

طعنہ بر خود زدم بہ دیدنِ او   تلخ عیشم شد از رسیدن او

اس شہر کے دیدار سے میں نے خود کی سرزنش کی اور وہاں پہنچنے سے میری زندگی مضطرب ہوگئی۔

پیر و بُرنا، ہمہ صغیر و کبیر   سنگدل، تنگدست و فتنہ پذیر

تمام بوڑھے جوان، چھوٹے بڑے، سنگدل، تنگ دست اور فتنے کا شکار ہیں۔

مرد و زن فاسق و فساد انگیز   ہر یکی بر حرام کاری تیز

مردوعورت سبھی فلاح و بہبود کے راستے سے منحرف، فتنہ وفساد پھیلانے والے اورحرام کاری میں سبقت لے جانے والے ہیں۔

کارِ ابلیس گرچہ سست شود   چون در آنجا رود دُرست شود

اگر شیطان اپنے کام یعنی انسان کو راہ راست سے بہکانے میں سست ہوجائے اور اگر وہاں چلا جائے تو چاق وچوبند ہوجائے گا۔

درحقیقت شہر جیپور (جے پور)

وصف جیپور گر کنیم بہ جا ست   کانِ زر، معدنِ جواہر ہاست

اگر ہم شہر جے پور کی تعریف وتوصیف کریں تو بجا ہے۔ وہ سونے کی کان اور جواہر کا معدن ہے۔

وہ چہ شہریست طرفہ قابل دید   مرگ نزدیک و آب و دانہ بعید

وہ کیا ہی عجیب لائق دید شہر ہے۔ وہاں موت نزدیک اورآب ودانہ دور ہے۔

از مسلمانی و مسلمانان   یک سرِ موی نیست نام و نشان

مسلمانوں اوراسلام کا وہاں ذرّہ برابر بھی نام ونشان نہیں ہے۔

ہندوان آنچہ خاص و عام کنند   اہل اسلام ہم تمام کنند

جو چیزیں ہندو خاص وعام انجام دیتے ہیں اسے مسلمان پورا کرتے ہیں۔

حیرت افزود و شد ز سر ہوشم   تا آمدہ رام رام در گوشم

اس وقت میری حیرت اور بڑھی اور میرا ہوش غائب ہوگیا جب (ہرطرف سے) رام رام کی صدائیں میرے کانوں میں آنے لگیں۔

زانکہ یکسان دروست معبد و دیر   والی شہر مُشرکِ لاخیر

اور ایسا اس وجہ سے ہے کہ وہاں عبادت خانے اور بت خانے ایک ہیں اور والی شہر مشرک لاخیر ہے۔

انورؔا خامشی بکن پیشہ   یکدلی و ہزار اندیشہ

اے انورؔ خاموشی اختیار کر کیوں کہ تو ایک ہے اور تجھے ہزار اندیشہ لاحق ہے۔

کہ زبانِ شکوک قاصر کن   زود مافی الضمیر ظاہر کن

اب شکوک کی زبان بند کر اور جلد اپنے دل کی بات ظاہر کر۔

در توصیف شہر اجمیر شریف کہ منظور ومقبول جناب خواجہ معین الدین چشتی علیہ الرحمہ است وحقیقت دیدن خود در عالم رؤیا رؤیتِ حضرت خواجہ وبشارت یافتن از آنجناب بہ رفتن شہر رام پور

حبذا بخت و طالع و اقبال   کہ در آن عہد و سال فرخ فال

خوشا نصیب، خوش بختی اورخوش اقبالی کہ اس نیک شگوں وقت اور سال میں۔

بود الطاف ایزدم شامل   دم بہ دم، جا بہ جا، بہ ہر منزل

کہ خداوند عالم کی عنایتیں ہر وقت اور ہرجگہ ہر منزل پر میرے شامل حال تھیں۔

از تماشا و سیرِ بی ہودہ   ہیچ گاہی دلم نیاسودہ

بے کار سیر وتفریح سے میرا دل کبھی بھی آسودہ نہیں ہوا۔

بسکہ چون برف برد و سرد شدم   سوی اجمیر رہ نورد شدم

اکثر جب برف کی طرح ٹھنڈا پڑ گیا تو شہر اجمیر کی طرف کوچ کیا۔

خوش رسیدم، معاینہ کردم   دور گشتہ ہم و غم و دردم

وہاں اچھے وقت پر پہنچا اور دیدار کیا۔ میرے تمام رنج والم اورمصیبت دور ہوگئے۔

طرفہ شہری چو جنت الماواست   کاندران مرقد حبیب خداست

عجب شہر جنت الماویٰ کی مانند ہے کیوں کہ اس شہر میں حبیب خدا کا مزار ہے۔

آنکہ سرخیل اہل صدق و یقین   خواجہ خواجگان معین الدین

جو اہل صدق ویقین کا پیشوا، آقاؤں کا آقا ہے جس کا نام معین الدین ہے۔

گرد راہش اگر رسد بہ فلک   می دہد روشنی بہ چشم ملک

اگر اس کی راہ کی خاک آسمان پر پہنچے تو فرشتوں کی آنکھوں کو روشنی بخشتی ہے۔

سر بہ سر خاک پاک آن سرکار   سرمۂ دیدۂ اولی الابصار

آنحضرت کی پوری قبر پاک صاحبان نظر کی آنکھ کا سرمہ ہے۔

در حریمش بہ عجز بنشستم   از غمِ غیر و خویشتن رستم

ان کی مقدس بارگاہ میں فروتنی سے بیٹھا اور اپنے اور غیروں کے غم سے نجات پا گیا۔

روز رفت و شبانہ بعد عشا   ایستادم چو سرو بر یک پا

دن گزر گیا اور رات کو عشا کے بعد سرو کی طرح اپنے مقصد کے لیے سیدھا کھڑا ہوا۔

منقبت خوان شدم بہ دربارش   بہرِ دیدارِ فیض آثارش

میں نے ان کے فیض کے آثار دیکھنے کے لیے ان کی بارگاہ میں مدح سرائی شروع کی۔

شب چو نیمی گذشت و خواب آمد   نیک آمد کہ برصواب آمد

جب آدھی رات گزر گئی اور مجھے نیند آ گئی۔ کیا ہی اچھا ہوا کہ صحیح وقت نیند آئی۔

زیرِ سر خشتکی نہادم من   بر سرِ خاک اوفتادم من

میں نے اپنے سر کے نیچے ایک چھوٹی سی اینٹ رکھی اور خاک پر لیٹ گیا۔

اللہ اللہ چہ طرفہ بود شبی   شدہ بہرِ ترقیم سببی

اللہ اللہ کیا ہی عجیب رات تھی جو میری کشادگی اور ترقی کا سبب بنی۔

کز عنایاتِ ایزد، آن سرور   جلوہ گر شد مرا بہ وقت سحر

اللہ کی عنایات سے وہ سرور سحر کے وقت میرے خواب میں جلوہ گر ہوئے۔

سر مند چو بر فلک ماہی   مثل شاہی بہ شوکت و جاہی

آسمان پر آفتاب کی مانند اور کسی بادشاہ کی طرح جاہ وحشم کے ساتھ مسند نشین تھے۔

خوش زبانِ گہر بیان بکشود   جانبِ خادمان خود فرمود

اپنی موتی پروتی ہوئی مبارک زبان کھولی اور اپنے خادموں کی طرف ملتفت ہوتے ہوئے فرمایا۔

کامد از راہ دور درویشی   مستمندی، غریب و دلریشی

کہ دور دراز سے ایک فقیر آیا ہے۔ وہ ضرورتمند، مسافر اور ملول ہے۔

ہان درآرید پیش من زودش   سازم از لطفِ خویش خشنودش

اس کو جلد میرے پاس لے آؤ تا کہ اپنے لطف وکرم سے اس کو خوش کروں۔

آمدہ خادمی بہ جانب من   گفت کای مبتلای رنج و محن

ایک نوکر میرے پاس آیا اور کہا کہ اے رنج ومحن میں مبتلا شخص۔

صد مبارک کہ شاہ یادت کرد   شاد زی، مرتبہ زیادت کرد

مبارک ہو کہ شہنشاہ نے آپ کو یاد کیا، خوش وخرم ہو جا کہ تیرا مقام ومرتبہ بلند کر دیا۔

زود برخیز روبروی حضور   منقبت خوانیت شدہ منظور

جلد اٹھ جاؤ کہ حضور کی بارگاہ میں تیری منقبت خوانی منظور ہو گئی۔

پیش رفتم ستادہ از تعظیم   خم نمودم بہ جان سرِ تسلیم

میں اٹھ کر ان کی بارگاہ میں گیا اور باادب کھڑے ہو کر سرِ تسلیم خم کیا۔

ای زہی آفتابِ عالم تاب   کز نگاہش شدم سراپا آب

خوشا نصیب کہ دنیا کو روشن کرنے والا آفتاب، اس کی نظر عنایت سے پانی پانی ہو گیا۔

چون ز آداب و انکسار تمام   عرض کردم بہ آنجناب سلام

جب میں نے انتہائی ادب وانکساری سے آنحضرت کی بارگاہ میں سلام پہنچایا۔

رتبہ و قدرِ من بیفزودند   و علیک السلام فرمودند

تو آنحضرت نے میرا مرتبہ اور قدر ومنزلت جواب سلام (وعلیک السلام) دے کر بڑھائی۔

بعد ازان سوی من اشارت شد   چہ اشارت عجب بشارت شد

اس کے بعد میری طرف اشارہ کیا۔ وہ اشارہ نہیں بلکہ انوکھی بشارت تھی۔

کہ ترا قصدِ رام پور رواست   خوب و مرغوب و عمدہ از ہر جاست

(انھوں نے کہا) تمھیں رام پور کا عزم کرنا چاہیے کیوں کہ وہ ہر جگہ سے اچھی، پسندیدہ اور عمدہ جگہ ہے۔

داور و والیش کہ کلب علی ست   ظل فیضِ جناب لم یزلی ست

وہاں کا والی وحاکم جس کا نام کلب علی ہے، اللہ رب العزت (ذات لم یزلی) کے فیض کا سایہ ہے۔

از چنین مژدۂ کرامت بار   زود یکبارگی شدم بیدار

اس بابرکت اور مبارک خوش خبری سے اچانک میں خواب سے بیدار ہوا۔

من کہ در پیرہن نگنجیدم   بخت و دولت بہ کام خود دیدم

میں نے جو کہ اپنے لباس میں پھولے نہیں سما رہا تھا، قسمت اور حکومت کو اپنے مقصد کے مطابق پایا۔

ساقیا موسمِ بہار آمد   بوی عطرِ جمالِ یار آمد

اے ساقی بہار کا موسم آ گیا۔ میرے محبوب کے جمال کی بھینی بھینی خوشبو آئی۔

کن خدا را ترحمی زنہار   بر جبین چین میاور و می آر

خدا کے واسطے نرمی سے پیش آ، ہرگز پریشان مت ہو اور شراب لے آ۔

می کہ زینجا بہ مصطفیٰ آباد   می رساند مرا بہ خاطر شاد
ایسی شراب جو مجھے یہاں سے خوش وخرم مصطفیٰ آباد (رام پور) پہنچا دے۔

می کہ سازد مرادِ دل حاصل   می کہ آسان کند ہمہ مشکل
ایسی شراب جس سے دل کی مراد حاصل ہوجائے، ایسی شراب جو تمام مشکلوں کو آسان کردے۔

در توصیف دارالآفتاب مصطفیٰ آباد المشہور بہ رام پور

عزمِ من چون کمر درست بست   جانبِ رام پور چُست بست
جب میرا عزم مصمم ہوگیا اور میں نے رام پور کے لیے کمر باندھ لی۔

در رہم گرچہ درد و رنج رسید   خوب شد دستِ من بہ گنج رسید
اگر چہ راستے میں مجھے درد وغم کا سامنا کرنا پڑا لیکن اچھا ہوا خزانے تک میری رسائی ہوگئی۔

رفت فرسودگی بہ دیدنِ او   شد غمم دور از رسیدنِ او
اس شہر کو دیکھتے ہی میری خستگی دور اور وہاں پہنچتے ہی غم کافور ہوگیا۔

وہ چہ شہریست قابلِ توصیف   مردمان احسن و سعید و شریف
کیا ہی لائق تعریف شہر ہے، وہاں کے لوگ خوش اخلاق، خوش بخت اور شریف ہیں۔

اللہ اللہ تمام افغانان   چہ تہمتن تن و پہلوانان
اللہ اللہ سبھی افغان ہیں، کیا ہی قوی الجسد اور پہلوان ہیں۔

ہر یکی نیک بخت و پاک ضمیر   چون دلِ بی‌نظیر و بدرِ منیر
بےنظیر اور بدر منیر کے دل کی طرح سبھی خوش بخت اور پارسا ہیں۔

صورتِ گلشن ست ہر خانہ   کہ شود عقل و ہوش دیوانہ
ہر گھر چمن کی طرح ہے کہ جن کے دیکھنے سے عقل وہوش دیوانہ ہوجائے۔

بر سرِ قصر و کاخ ایوان‌ہا   شیفتہ دل فریفتہ جان‌ہا
محل اور قصر شاہی پر دل وجان فدا ہوجائے۔

ساکنانِ جنان گرش یابند   رُخ ز ماوای خویش برتابند
اگر جنت کے مکین اسے پاجائیں تو اپنے مسکن سے منہ موڑ لیں۔

سر بہ سر ہمچو عدن و باغ نعیم   مُدّعا کانتخاب ہفت اقلیم
ہر طرف عدن اور باغ نعیم ہے، مقصد یہ ہے کہ ہفت اقلیم میں یہ انتخاب ہے۔

دلبرانِ سمن بدن گلرنگ   غیرتِ لُعبتانِ چین و فرنگ
معشوق چنبیلی اور بدن سرخ جن پر چین وفرنگ کے معشوق رشک کریں۔

چون نمایند چہرۂ گلگون   گر فرشتہ بود شود مفتون
اگر وہ اپنا سرخ چہرہ دکھائیں تو فرشتہ بھی ہو تو ان پر عاشق ہوجائے۔

یافتم معتدل چہ آب و ہوا   شد ز دل یاد جنت الماویٰ
وہاں کی آب وہوا اتنی معتدل ہے کہ جنت الماوا کی یاد دل سے جاتی رہی۔

گرچہ فردوس در جہان باشد   این یقین ست کانچنان باشد
اگر جنت دنیا میں ہو تو یقین ہے کہ ایسی ہی ہوگی۔

گر درآنجا کسی خورش گیرد   صورتِ حسن پرورش گیرد
اگر کوئی یہاں روزی روٹی حاصل کرلے تو اس کی پرورش اچھے ڈھنگ سے ہوگی۔

چُست گردد کہ دیو ازو ترسد   رستمِ زال و گیو ازو ترسد
وہ ایسا چست درست ہوجائے گا کہ شیطان اس سے ڈرے گا اور اس سے رستم زال اور گیو بھی خوف کھائیں گے۔

عالمانِ علیم و نیکو کار   ہر طرف جا بہ جا ہزار ہزار
یہاں ہمہ داں علما اور بھلے لوگ ہر طرف، جگہ جگہ ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔

بی‌حد و حصر صاحبانِ ہنر   متمول بہ نقد نقرہ و زر
بےشمار ہنرمند افراد ہیں جن کے پاس نقد سونا چاندی موجود ہے۔

شاعران راست آن قدر توقیر   کہ نیاید بہ گفتن و تحریر
شاعروں کی اتنی قدر کی جاتی ہے جو تحریر وتقریر میں بیان نہیں ہوسکتی۔

چشم انور فدات ای ساقی   نیست کس ماسوات ای ساقی
اے ساقی! انور کی آنکھ تم پر فدا ہے تیرے سوا اس کا کوئی اپنا نہیں بچا۔

یک دو جامم شرابِ ناب بدہ   تشنہ کامم ز ہجر آب بدہ
ایک دو جام مجھے خالص شراب دے، ہجر کی وجہ سے تشنہ کام ہوں مجھے شراب پلا دے۔

وقتِ افشای مدعای منست   سایہ افگن بہ من ہمای منست
میرے مدعا ظاہر کرنے کا وقت آپہنچا کیوں کہ اب میرے اوپر میری ہما سایہ فگن ہے۔

در بیان حصول ملاقات مولوی محمد عثمان خان صاحب و مشرف شدن بہ شرف ملازمت حضور فیض گنجور ادام اللہ ملکہم بہ توسل مولوی صاحب موصوف

لوحش اللہ کہ در رسیدن شہر   شاد و خرم شدم بہ دیدنِ شہر

اللہ اس شہر کو رنج و غم سے بچائے کہ جب میں وہاں پہنچا تو اس کو دیکھتے ہی خوش و خرم ہو گیا۔

ہر نظر باغ باغ بشگفتم   با دلِ خویشتن چنین گفتم

ہر نظر میں پھولے نہیں سمار ہا تھا۔ چنانچہ اپنے دل سے اس طرح کہا۔

والی شہر خوب تر باید   بینمش بخت راہبر باید

اس شہر کا والی شہر سے بھی اچھا ہوگا، بس میری قسمت رہنمائی کرے تو میں اس کا دیدار کروں۔

چند روزی تلاش روز و شبان   می نمودم درین خیال بہ جان

چند روز رات دن کوشش کی اور اسی خیال میں جان کھپایا۔

چون بدیدم کہ کار دشوارست   نی مرا یار و نی مددگارست

جب میں نے دیکھا کہ یہ کام بہت مشکل ہے اور میرا کوئی یار و مددگار بھی نہیں ہے۔

در مناجات لب کشودم من   خالق خویش را ستودم من

(تو) میں نے مناجات میں زبان کھولی اور اپنے خالق کی حمد و ستائش کی۔

تا کہ شخصی بہ من دوچار شدہ   ہمدم و یار و غمگسار شدہ

یہاں تک کہ ایک شخص مجھ سے ملا اور میرا یار و مددگار اور میرے دکھ درد کا شریک ہو گیا۔

گفت مارا کہ ای خجستہ شعار   گر تو خواہی تقرّبِ سرکار

اس نے ہم سے کہا کہ اے اچھی خصلت والے اگر تو بادشاہ کی بارگاہ میں تقرب حاصل کرنا چاہتا ہے۔

اندرین شہر مولوی عثمان   عالم و فاضلست و سحربیان

(تو) اس شہر میں مولوی محمد عثمان، عالم، فاضل اور جادو بیان موجود ہیں۔

ہم وزیر و مشیر سرکارست   صاحبِ خلق و نیک کردارست

وہ سلطنت کے وزیر اور مشیر بھی ہیں اور با اخلاق اور پارسا انسان ہیں۔

چون بہ وی قرب حاصلت گردد   زود تر حل مشکلات گردد

اگر تو ان کا قرب حاصل کرلے تو تیری مشکلیں جلد ہی آسان ہو جائیں گی۔

وصفِ اخلاقِ او چو بشنفتم   چند بیتی بہ مدحتش گفتم

جب میں نے ان کے اخلاق کی تعریف سنی تو ان کی مدح میں چند اشعار کہے۔

شد ملاقات او بہ من حاصل   از بشاشت شگفت گلگل دل

جب ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تو خوشی سے میرے دل کی کلیاں کھل گئیں۔

سر بہ سر گوش کرد اشعارم   آگہی یافتہ ز اسرارم

انھوں نے میرے تمام اشعار سنے اور میرے مافی الضمیر سے آگاہی حاصل کی۔

سوی من دید آن وحیدِ زمان   از کرم پروری کشاد زبان

میری طرف اس یکتائے روزگار نے دیکھا اور کرم پروری سے اپنی زبان کھولی۔

گفت با من کہ از چنین توصیف   خویش را دادہ ای عبث تکلیف

اس نے مجھ سے کہا کہ اس تعریف و توصیف سے تم نے خود کو بے کار پریشانی میں مبتلا کیا ہے۔

زانکہ من ناکس و گنہگارم   بر خود و فعل خویش بیزارم

کیوں کہ میں ہیچ اور خطا کار ہوں اس لیے خود اور اپنے کیے پر شرمندہ ہوں۔

بہ کہ اوصافِ آفتاب کنی   مدحِ نوابِ مستطاب کنی

بہتر یہ ہے کہ تو آفتاب کی تعریف کرے یعنی نواب مستطاب کی مدح کرے۔

کہ ولینعم ما و آفاقست   بہ عنایت و مکرمت طاقست

جو ہمارا اور دنیا کا ولی نعم ہے اور بخشش و عنایات میں بے نظیر ہے۔

ہان مرا جان و بہتر از جانست   بخششِ او محیطِ دورانست

ہاں وہ میرے لیے جان اور جان سے بھی عزیز ہے۔ اس کی بخشش زمانے کو محیط ہے۔

لرزہ از ہیبتش دلیران را   آب زہرہ ہزبر و شیران را

اس کی ہیبت سے بہادر کانپتے ہیں، شیر اور شیر درندہ بھی اس سے ڈرتے ہیں۔

اوست مہر و شعاع انجم و ماہ   ذاتِ پاکِ وی ست ظلّ اللہ

وہی آفتاب اور چاند ستارے کی روشنی ہے۔ اس کی ذات پاک خدا کا سایہ ہے۔

در جہان نیست کس برابرِ او   طی و کسریٰ خجل ز جوہر او

دنیا میں کوئی اس کے برابر نہیں ہے۔ حاتم اور نوشیرواں اس کی بخشش سے شرمندہ ہیں۔

چون شنیدم ازو چنین تقریر   ذوق شد طوق و شوق دامن گیر

جب میں نے ان سے (نواب کے بارے میں) یہ سنا تو ذوق وشوق دامن گیر ہوا۔

گفتمش کای فدا دل و جانم — صورتِ غیر تو نمی دانم

میں نے ان سے کہا کہ میرے جان ودل فدا ہو جائیں آپ کے علاوہ میری کوئی امید نہیں ہے۔

در حریمِ حضوری سرکار — بی وسیلہ چگونہ یابم بار

سرکار نواب کی بارگاہ میں بغیر وسیلے کے کیسے باریابی ہوگی۔

گشت خاموش و من شدم مضطر — من بہ وی، او بہ من نہادہ نظر

وہ خاموش ہوگئے اور میں بے چین۔ میں نے ان کو اور انھوں نے مجھ کو دیکھا۔

بعد یک لحمہ‌ای زبان بکشاد — مشفقانہ مرا تسلی داد

لمحہ بھر کے بعد انھوں نے زبان کھولی اور شفقت سے مجھے تسلی دی۔

کہ نیم دل شکستگی منظور — غم مخور من رسانمت بہ حضور

(انھوں نے کہا) مجھے دل شکنی منظور نہیں ہے، تم غم نہ کھاؤ میں تمھیں ان کی بارگاہ میں لے چلوں گا۔

روزِ دیگر مرا نمود طلب — داد آگاہیم ز حسنِ ادب

دوسرے دن انھوں نے مجھے طلب کیا اور حسن ادب سے آگاہ کیا۔

مرحبا بر چنین مددگاری — کہ شدہ ہمرہم چو غم‌خواری

ایسے مددگار پر آفریں جس نے میرے مونس کی طرح میری ہمراہی کی۔

خوش رسیدم بہ بزمِ خاصِ حضور — دیدۂ مقصدم شدہ پُر نور

حضور نواب کی بارگاہ میں اچھے وقت پر پہنچا۔ میرے مقصود کی آنکھ روشن ہوگئی۔

چونکہ عالی جناب را دیدم — گوییا آفتاب را دیدم

جب میں نے حضور والا کو دیکھا تو ایسا محسوس ہوا کہ میں نے آفتاب کو دیکھا۔

طرفی ایستادہ بودم من — سرِ تسلیم خم نمودم من

ایک طرف میں سر تسلیم خم کر کے کھڑا تھا۔

ان شہِ تخت بخت و فخر زمن — نظرِ مکرمت نمود بہ من

اس فخر زمانہ اور فرماں روا بادشاہ نے میری طرف نظر کرم کی۔

تحفۂ طبع خود عیان کردم — دست بستہ چنین بیان کردم

میں نے جو اشعار موزوں کیے تھے انھیں دست بستہ اس طرح سنایا۔

کای فلک منزلت فرشتہ سرشت — بارگاہِ تو ہست رشکِ بہشت

اے بلند مرتبہ اور فرشتہ صفت! تیری بارگاہ رشک جنت ہے۔

آفتابِ سپہر جاہ تویی — والیِ خلق و بادشاہ تویی

آسمان جاہ وحشم کا آفتاب تو ہی ہے، لوگوں کا والی اور بادشاہ تو ہی ہے۔

خاکِ پاکِ درت عبیر آساست — آستانِ تو آسمانِ دُعاست

تیرے در کی پاک مٹی مشک جیسی ہے، تمہارا آستانہ آسمان دعا ہے۔

ہفت قلزم خجل ز دستِ تواند — چہرہ بر خاک و دلشکست تواند

ساتوں سمندر تیری بخشش سے شرمندہ ہیں، تیری وجہ سے ملول اور رنجیدہ ہیں۔

بادشاہان کہ این زمان ہستند — از می علم و فضل تو مستند

اس زمانے کے تمام بادشاہ تیرے علم وفضل کی شراب سے مخمور ہیں۔

وہ چہ شاہنشہی و سلطانی — کامدہ جسم مقر بہ دربانی

کیا ہی اچھا بادشاہ اور فرمانروا ہے جس کا جسم دربانی کے لیے جائے قرار بن کر آیا ہے۔

تویی امروز بی‌عدیل و نظیر — لشکرِ فیضِ تست عالم‌گیر

آج تو بے مثل و بے نظیر ہے اور تیرے فیض کا لشکر پوری دنیا کو محیط ہے۔

ہیچ پیش تو ای محیط کرم — عدلِ کسریٰ و بخشش حاتم

اے سخی و کریم! تیرے سامنے نوشیرواں کی عدالت اور حاتم کی بخشش ہیچ ہے۔

معنیٔ لطف و فضل یزدانی — صورتِ راحتِ دل و جانی

یعنی لطف اور فضل پروردگار، مجسم راحت دل وجان۔

جانب کان و سوی بحر دمی — افتدت گر گذر بہ سہو ہمی

اگر معدن اور سمندر کی طرف غلطی سے تیرا گزر ہو جائے۔

کان و دریا متاعِ خود یکبار — بر سرِ اقدست کنند ایثار

تو معدن اور سمندر اپنے مال ومتاع یکبارگی تیرے سر اقدس پر نثار کردیں گے۔

رسم تو اعتصام عالم دل — اسم تو افتتاح ہر مشکل

تیرے آئین سے عالم دل کو قوت ملتی ہے اور تیرے نام سے ہر مشکل آسان ہوتی ہے۔

بہ طفیل تو ای منیب زمان — آن چنان عام گشت امن و امان

اے زمانے کے محاسب! تیرے طفیل سے اس طرح سے امن وامان عام ہوگیا۔

علَف و آب می‌خورند بہ ہم   بز و روباہ و شیر و گرگ و غنم

کہ بکری، لومڑی، شیر، بھیڑئے اور بھیڑ بکرے ایک ساتھ چارے کھا رہے اور پانی پی رہے ہیں۔

صدر بدر کرامت و شاہی   یوسفِ مصر شوکت و جاہی

تو بادشاہت اور کرامت کا بدر کامل ہے اور جاہ وحشم کا یوسف مصر ہے۔

وقت مداحیت بہ قصد سوال   میزند بوسہ بر لبم اقبال

سوال کے ارادے سے تیری مدح سرائی کے وقت خوش قسمتی میرے ہونٹ کا بوسہ لے رہی ہے۔

اللہ اللہ کہ نیستت ثانی   در جوانمردی و سخندانی

اللہ اللہ ایثاری اور سخن فہمی میں تیرا کوئی ثانی نہیں ہے۔

فی الحقیقت طریقت آگاہی   شرع را مہر و ورع را ماہی

درحقیقت تو سیر وسلوک سے آگاہ ہے، تو شریعت کا آفتاب اور پارسائی کا ماہتاب ہے۔

داورا، یاورا، شہنشاہا   زیر ظلّ تو ما گرفتم جا

اے منصف، مددگار اور بادشاہ! تیرے سائے میں ہم نے پناہ لے لی۔

راز گویم بہ خلق و خوار شوم   با تو گویم بزرگوار شوم

اگر میں لوگوں سے اپنا راز کہوں تو ذلیل ورسوا ہوں گا اور تجھ سے کہوں گا تو میری عزت میں اضافہ ہوگا۔

ہستم از حضرتت حوایج خواہ   کہ مرا نیست جز تو پشت و پناہ

میں تیری بارگاہ سے اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کا خواہشمند ہوں کیوں کہ میرا تمہارے علاوہ کوئی پشت پناہ نہیں ہے۔

کار مداح خویش در ہر حال   راست گردان ز دستِ فیض نوال

تو اپنے فیض وبخشش سے ہر حال میں اپنے مداح کا کام آسان کردے۔

قدر دانی بہ حالِ اہل سخن   ہمچو خورشید سازدت روشن

سخنور کے حال پر رحم وکرم تم کو آفتاب کی طرح روشن کردے گا۔

عرض کردم اگرچہ گستاخیست   میروم از جہان سخن باقیست

میں نے اپنا مدعا بیان کردیا اگرچہ یہ گستاخی ہے لیکن میں دنیا سے چلا جاؤں گا اور میرا کلام باقی رہے گا۔

انورؔا در ادب بکوش و خموش   ہوش کن ہوش ابلہانہ مجوش

اے انور! تو ادب کا پاس ولحاظ رکھ اور خاموش ہوجا، ہوش میں آ اور بےوقوفوں کی طرح جوش میں نہ آ۔

کن بہ جان این زمان بہ شوق تمام   بر دعای حضور ختم کلام

اس زمانے میں پورے ذوق وشوق کے ساتھ محنت ومشقت کر اور حضور کے حق میں دعا پر اپنا کلام ختم کر۔

کہ ز لطفِ خدای بی‌انباز   باد بختت بہ کام و عمر دراز

بے مثل خدا کے لطف سے تیری قسمت مقصد کے مطابق اور عمر لمبی ہوجائے۔

ظلّ الطافِ تو مرا بر سر   بر سرت ظلّ لطفِ پیغمبر

تیرے کرم کا سایہ میرے سر پر ہو اور تیرے سر پر پیغمبر (ص) کے کرم کا سایہ ہو۔

چون کہ این مثنوی بہ سعی تمام   ختم شد والسلام و الاکرام

جب یہ مثنوی تمام تر کوشش سے پوری ہوگئی سلام واکرام کے ساتھ۔

عقل تاریخ گفت با دل جود   ’توشۂ راہِ منزل مقصود

(تو) عقل نے جاں نثاری کے ساتھ اس کی تاریخ کہی کہ یہ منزل مقصود کے لیے زادراہ ہے۔

نیز ملہم بہ من ازین خوش تر   گفت نیک است تحفۂ انورؔ

نیز میرے اوپر الہام کرنے والے نے اس سے اچھا کہا کہ کہو انورؔ کا تحفہ مبارک ہے۔

خاتمہ

للہ الحمد والمنہ کہ درزمان سعید وآوان حمید، نسخۂ عجیب وغریب، تصنیف حقیقت آگاہ کمالات دستگاہ مولانا ومخدومنا مولوی محمد انور شاہ صاحب شاعر امرتسری، درسال یک ہزار و دو صد و نود ہجریہ مقدسہ، صورت اختتام پذیرفتہ۔ واللہ الموفق بالاعانۃ، والسلام علی من اتبع الہدیٰ المحررہ احمد اللہ عفی عنہ۔

این نظم جان فزا چو بہ صد اہتمام طبع   شد طرفہ از مطالعہ گلگل شگفت دل

یہ جاں بخش نظم جب بصد اہتمام طبع ہوئی تو اس کے مطالعے سے دل کی کلی عجیب طرح کھل گئی۔

تاریخ سال بی‌سر اندیشہ احمدا   گردید طبع نسخۂ انور بگفت دل

اے احمد! برجستہ اس کا تاریخ سال دل نے کہا کہ انورؔ (کی مثنوی) کا نسخہ طبع ہوگیا۔

☆☆☆

تعارف وتبصرہ

نام کتاب : پروازِسخن (کلام عبداللہ نصرؔ) مرتب : ڈاکٹر رفیق اشفاق

صفحات : 192 قیمت : 150روپے

سال اشاعت : 2017ء مطبع : ندارد

ناشر : ڈاکٹر رفیق اشفاق

تبصرہ نگار : فیضان حیدر (معروفی)

'پروازِ سخن' عبداللہ نصرؔ کے کلام کا مجموعہ ہے جس کی ترتیب وتدوین کا کام ڈاکٹر رفیق اشفاق نے انجام دیا ہے۔ڈاکٹر صاحب ڈی سی ایس کے پی جی کالج مئو کے شعبۂ اردو میں درس وتدریس سے وابستہ ہیں۔اپنے منصبی فرائض کی انجام دہی کے ساتھ ان کا زیادہ تر وقت اردو زبان وادب کے مطالعے اور تصنیف وتالیف میں بسر ہوتا ہے۔مئو کے علمی و ادبی حلقے میں ایک بہترین استاد کے ساتھ ایک اچھے مصنف کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ زیر نظر کتاب عبداللہ نصرؔ کے کلام کا مجموعہ ہے۔اسے ڈاکٹر صاحب نے بڑی جانفشانی اور مشقت کے بعد ایک پر مغز مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔اس مقدمے میں انھوں کئی اہم اور قابل ذکر باتوں کا تذکرہ کیا ہے۔اس میں انھوں نے مئو کے شعری منظرنامے پر ایک جامع بحث کے ساتھ عبداللہ نصرؔ کی حیات اور شاعری پر شرح وبسط کے ساتھ تبصرہ کیا ہے۔اس کتاب میں عبداللہ نصرؔ کے کلام کی ترتیب اس طرح ہے: حمد، نعت، غزلیات، منظومات۔اس میں ایک سو بتیس غزلیں شامل ہیں۔ 'منظومات' کے ضمن میں ڈاکٹر رفیق اشفاق نے مختلف موضوعات کے تحت ان کی چودہ نظمیں شامل کی ہیں جن میں ایک گیت بھی ہے۔

اس کتاب میں ڈاکٹر رفیق اشفاق کی تحقیقی وتنقیدی تحریر کے علاوہ ڈاکٹر شکیل اعظمی کا مضمون 'عبداللہ نصرؔ کی شخصیت اور شاعری' اور ڈاکٹر عبدالقدوس کی تحریر 'اصلاح معاشرہ کا شاعر: عبداللہ نصرؔ' بھی اگرچہ مختصر ہیں لیکن شاعر کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے میں کافی حد تک معاون ہیں۔

عبداللہ نصرؔ فضا ابن فیضی کے خاص شاگردوں میں سے ہیں جنھوں نے زمانے کے حالات و واقعات، افکار ومسائل اور سنجیدہ موضوعات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ان کے یہاں عشق وعاشقی، معشوق کی زلف گرہ گیر کی اسیری، ہجر ووصال، جام وصبا وغیرہ جیسے روایتی موضوعات بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں۔سماج اور معاشرے میں پنپ رہی برائیوں کے تئیں وہ بہت فکرمند ہیں۔انھوں نے مکاری، دغابازی، مکروفریب، بدگمانی، تنگ نظری، بدکرداری وغیرہ جیسی بری صفات کو اپنی شاعری میں ایسے کے طور پر پیش کیا ہے اور انھیں انسانی فلاح وبہبود کے خلاف تصور کیا ہے۔وہ کہتے ہیں:

امتیاز حق و باطل سر بہ سر دیکھے گا کون
شیخ میخانے گئے تو خیر و شر دیکھے گا کون

ناخدا کشتی بڑھا، طوفان ہے آتا ہوا
ہم اگر مرجائیں گے، تیرا ہنر دیکھے گا کون

آؤ ہم زنجیر بن جائیں، ہوں دشمن نامراد
سر بہ سر سولی پہ اپنوں کا ہی سر دیکھے گا کون

انھوں نے حق وباطل اور خیر وشر کی اس جنگ میں لوگوں کو شریک ہونے اور اپنا ہنر دکھانے کی سعی کی ہے اور لوگوں کو میل ملاپ، خلوص ومحبت، امن وآشتی، بھائی چارے، حق پرستی، حق گوئی اور ایمانداری کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی ترغیب دلائی ہے۔وہ آگے کہتے ہیں:

حق کو حق باطل کو باطل مانتا کوئی نہیں
فرق ان دونوں میں کیا ہے جانتا کوئی نہیں

اہل ثروت ہوگئے ہیں سب کے سب قاروں مزاج
بے کس و محتاج کو اب پوچھتا کوئی نہیں

سب ہیں بس اپنا محل اونچا بنانے میں مگن
چھت نہیں ہمسایہ کے، یہ سوچتا کوئی نہیں

ان کا ماننا ہے کہ شعروشاعری معاشرے کی اصلاح کا اہم ذریعہ ہے اور صالح معاشرے کی تشکیل میں علماوفضلا اور سماجی کارکن کے ساتھ شعرا کا بھی اہم کردار ہوتا ہے۔انھوں نے ہمیشہ اسلامی تہذیب کا پاس ولحاظ رکھا اور مسلمانوں سے یہی گزارش کی کہ وہ اپنی تابناک تہذیب وثقافت سے کسی بھی صورت میں دستبردار نہ ہوں، کیوں کہ یہ ہمارا تہذیبی ورثہ ہے اور جو شخص اپنی وراثت کو بھول جائے اس کی پہچان ختم ہوجایا کرتی ہے۔وہ شاعری کو داستان گوئی اور افسانہ طرازی کا ذریعہ نہیں تصور کرتے بلکہ اسے تنقید حیات سمجھتے ہیں چنانچہ وہ لطیف طنز کے پردے میں اپنی بات کہتے ہیں تاکہ قارئین پر گراں نہ گزرے۔انھوں نے اپنی بات کو دوسروں تک منتقل کرنے کے لیے آسان اور عام فہم زبان استعمال کی ہے۔

ڈاکٹر رفیق اشفاق نے عبداللہ نصرؔ کے کلام کی ترتیب میں جو عرق ریزی کی ہے، اس سے ان کی تنقیدی صلاحیت اور شعرفہمی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ان کی یہ کاوش قابل ستائش اور قابل صد تحسین ہے۔انھوں نے نصرؔ کے کلام کو مجموعے کی صورت میں جمع کرکے ایک بڑی خدمت انجام دی ہے اور اسے ضائع ہونے سے بچالیا۔

☆☆☆

نام کتاب	: سب رس	مصنف	: سلطان آزاد
صفحات	: 128	قیمت	: 350روپے
سال اشاعت	: 2017ء	مطبع	: ندارد
ناشر	: سلطان آزاد		
تبصرہ نگار	: فیضان حیدر (معروفی)		

سلطان آزاد کی شخصیت اردو داں حلقے میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ان کی نصف درجن سے زائد علمی، ادبی اور تحقیقی کتابیں منظر عام پر آ کر قارئین سے داد وتحسین وصول کر چکی ہیں جن میں 'دبستان عظیم آباد' (تحقیق وتذکرہ) اور 'بہار میں اردو طنز وظرافت' خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔دونوں کتابیں اپنے موضوع پر بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ان کے مطالعے سے موصوف کی تنقیدی بصیرت اور علمی ذہانت کا اندازہ ہوتا ہے۔

'سب رس' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے متنوع اور گوناگوں موضوعات پر لکھی گئی نگارشات کا مجموعہ ہے۔اس کے مشمولات بالترتیب ڈرامے، فیچر، رپورتاژ، خاکے، انٹرویو اور آئینہ آج کا (افسانوی مجموعہ) سے متعلق اہل علم ودانش کی آرا کے چند اقتباسات شامل ہیں۔

ڈرامے کے تحت انھوں نے دو ڈرامے 'قصہ ایک شاعر کا' اور 'نکتہ چینی' کو جگہ دی ہے۔'قصہ ایک شاعر کا' میں انھوں نے ایک شاعر کی انفرادی اور اجتماعی پریشانیوں، ذہنی الجھنوں اور خانگی مشکلات کا تذکرہ کیا ہے۔اس کے مطالعے سے موجودہ دور میں ایک شاعر کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہماری نظروں میں پھر جاتی ہے۔اسی طرح دوسرے ڈرامے 'نکتہ چینی' میں ایک افسانہ نگار اور ایڈیٹر کے درمیان مکالمے کو خوبصورت انداز میں اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ افسانہ نگار کی ذہنی کشمکش کے ساتھ ایڈیٹر کی مشکلات کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

فیچر کے ضمن میں انھوں نے تین اہم اور غیر معمولی شخصیتوں کا فیچر لکھا ہے جن کے عنوانات بہ ترتیب 'لیلائے آزادی کا مجنوں: پیر علی'، 'ساحر ایک فیچر' اور 'جمیل مظہری ایک فیچر' ہیں۔پیر علی کے فیچر کے ضمن میں کہتے ہیں:

''پیر علی لیلائے آزادی کے وہ مجنوں تھے جن میں قومی حمیت، جذبۂ حریت

اور قائدانہ صلاحیت بدرجۂ اتم موجود تھی۔اسی جذبے کے تحت وہ خفیہ انقلابی مشن پر پٹنہ آئے، جہاں انقلاب کی آگ پہلے ہی سے سلگ رہی تھی۔'' (ص ۳۳)

کتاب کے تیسرے حصے میں سات مختلف پروگراموں سے متعلق اہم رپورتاژ کو جگہ دی گئی ہے۔ان رپورتاژوں میں انھوں نے اپنی فنکارانہ مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے۔کہیں کہیں انھوں نے ماضی کے جھروکوں میں تاک جھانک کرنے کی بھی کوشش کی ہے اور ان واقعات کا سرا موجودہ رپورتاژ سے ملا دیا ہے۔

خاکے کے ضمن میں انھوں نے دو خاکے (الف) 'شاعر گر استاذ' اور (ب) 'چچا کی کارگزاریاں' کو جگہ دی ہے۔اول الذکر خاکہ حضرت رمز عظیم آبادی کا ہے۔اس میں انھوں نے رمز عظیم آبادی کی شخصیت، شعر گوئی اور ہم عصروں سے ان کے مراسم کا ذکر کیا ہے۔اسی طرح ثانی الذکر خاکے میں ہاشم عظیم آبادی کی شخصیت کے حقیقی خدوخال نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

پانچویں حصے 'انٹرویو' کے تحت انھوں نے نادم بلخی سے لیے گئے ایک اہم انٹرویو کی روداد قلمبند کی ہے۔یہ انٹرویو اگرچہ مختصر ہے لیکن اس میں نادم بلخی کے حوالے سے بہت سی کارآمد باتیں آگئی ہیں۔یہ انٹرویو 'ذکر نادم بلخی' مرتبہ پروفیسر سید حسن عباس میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

اس کے بعد انھوں نے 'آئینہ آج کا' (افسانوی مجموعہ) سے متعلق اہل علم اور ناقدین کی بیش قیمت آرا سے چند اقتباسات نقل کیے ہیں جن سے خود مصنف کی شخصیت اور ان کی علمی وادبی خدمات کا اندازہ ہوتا ہے۔یہ اقتباسات مصنف کی کثیر الجہات شخصیت کو سمجھنے میں کافی حد تک معاون ہیں۔

کتاب کے بغور مطالعے سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ سلطان آزاد میں بات کو صحیح ڈھنگ سے پیش کرنے کا ہنر موجود ہے۔وہ بات میں بات پیدا کرنے کے ہنر سے بھی واقف ہیں۔تمام مضامین میں انھوں نے معیار ووقار برقرار رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔مختلف موضوعات پر مشتمل یہ کتاب اردو ادب میں ایک اضافہ تصور کی جائے گی اور تشنگان علوم کی سیرابی کا ذریعہ ثابت ہوگی۔مجھے امید ہے کہ اردو کے علمی وادبی حلقے میں اس کاوش کو تحسین کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔

☆☆☆

نام کتاب : یہ زمین — شاعر : انصار احمد معروفی
صفحات : 75 — قیمت : 25روپے
سال اشاعت : 2018ء — مطبع : جے کے آفسیٹ پرنٹرز، دہلی-6
ناشر : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
تبصرہ نگار : فیضان جعفر علی

جناب انصار احمد معروفی کا تعلق دیار پورب کی ایک زرخیز بستی پورہ معروف، ضلع مئو، یوپی سے ہے۔ وہ معلمی کے معزز پیشے سے وابستہ ہیں اور مدرسہ چشمۂ فیض، ادری ضلع مئو میں درس وتدریس کے فرائض کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ مضمون نگاری اور شعروشاعری میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ وہ خوش فکر شاعر ہیں اور فی البدیہ شاعری آپ کا خاص وصف ہے۔ اصلاحی موضوعات، بچوں کی دلچسپی اور ان کی کردار سازی کے تعلق سے خوبصورت اور سبق آموز نظمیں تسلسل کے ساتھ لکھتے رہتے ہیں۔ بچوں کے تعلق سے مختلف معلوماتی، سائنسی وادبی مسائل پر ان کے متعدد مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری وساری ہے۔

انصار احمد معروفی نے زیر نظر مجموعے کو اللہ کی حمد اور نعت پاک سے شروع کیا ہے اور اس میں زمین کی ہیئت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ سطح زمین، چٹانیں، سنگ مرمر، پہاڑ، سطح زمین پر ہونے والی تبدیلیاں، زلزلے اور اس کے اسباب وعلل، زمین کی اندرونی ہلچل پر بڑی خوبصورتی اور سائنسی انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ اسی طرح شاعر نے برف اور اس کے کام، ہواؤں کے عمل، موسم کی تبدیلیوں، ندی کے بہنے وغیرہ کے علل وعوامل کو بھی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے ان تمام چیزوں کے بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی ہدایت دی ہے کہ ماحول سے چھیڑ چھاڑ تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ یہ کتاب ۴۰ر نظموں کے ساتھ ۷۵ رصفحات پر مشتمل ہے۔

☆☆☆

نام کتاب : یہ آب وہوا — شاعر : انصار احمد معروفی
صفحات : 51 — قیمت : 20روپے
سال اشاعت : 2018ء — مطبع : جے کے آفسیٹ پرنٹرز، دہلی-6
ناشر : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
تبصرہ نگار : فیضان جعفر علی

یقیناً انسان کی زندگی میں آب وہوا کا ایک اہم مقام ہے جس کے بغیر انسانی زندگی کا تصور ممکن نہیں ہے۔

آپ کو ہم کو ہوا بس چاہیے — زندگانی کے تصور کے لیے

انصار احمد معروفی نے اپنے اس مجموعے میں آب وہوا کی اہمیت اور اس کے اثرات پر مفصل روشنی ڈالی ہے، ساتھ ہی ہر طرح کی ہوا اور ہر طرح کے پانی کے مفید اور مضر اثرات پر بھی گفتگو کی ہے کہ اچھی اور صاف ستھری ہوا اور اچھے اور صاف ستھرے پانی کے انسانی زندگی پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں اور گندی آب وہوا کے کیسے مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ انہوں نے بچوں کے لیے ہوا میں گیس ہونا، نائٹروجن اور کاربن ڈائی آکسائڈ گیس جیسے سائنسی موضوعات کو بھی بڑے لطیف انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ کتاب ۴۶ر نظموں اور ۵۱ رصفحات پر مشتمل ہے۔

☆☆☆

نام کتاب : یہ پیڑ پودے — شاعر : انصار احمد معروفی
صفحات : 52 — قیمت : 20روپے
سال اشاعت : 2018ء — مطبع : جے کے آفسیٹ پرنٹرز، دہلی-6
ناشر : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
تبصرہ نگار : فیضان جعفر علی

بچوں کے لیے سائنسی نظموں کا ایک دوسرا مجموعہ 'یہ پیڑ پودے' ہے جس میں انصار احمد معروفی نے بچوں کی دلچسپیوں کا پورا پورا خیال رکھا ہے اور ایک ماہر سائنس داں کی طرح باریک بینی سے پودوں کی تعریف، پودوں کی غذا، پودوں کی نسل، ان کے افعال، پودوں کی اہمیت اور ان کے مختلف اقسام کے بارے میں مفصل منظوم معلومات اپنے قاری تک بہم پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

شاعر نے بچوں کی طبیعت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ سمجھایا ہے کہ پودوں پر ہماری زندگی کا بڑا انحصار ہے، اس کے بغیر انسانی زندگی کا تصور ممکن نہیں ہے۔ پودے سے ہی ہم کو گیہوں، چاول، سبزیاں اور تمام طرح کے پھل میسر ہوتے ہیں اور اس کے علاوہ جسم کو ہر قسم کا کپڑا بھی پودوں (کپاس) کی وجہ سے ملتا ہے۔ ہم جس گھر میں رہتے ہیں اس گھر کو بنانے کے لیے لکڑی بھی پیڑوں سے حاصل ہوتی ہے۔ غرض شاعر نے پیڑ پودوں کی مقصدیت اور اس کے فوائد پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب ۳۰ر نظموں کے ساتھ ۵۲ رصفحات پر مشتمل ہے۔

☆☆☆

نام کتاب : یہ مہینے اور موسم — شاعر : انصار احمد معروفی
صفحات : 83 — قیمت : 25
سال اشاعت : 2018ء — مطبع : لاہوتی پرنٹ ایڈز، دہلی-6
ناشر : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
تبصرہ نگار : فیضان جعفر علی

انصار احمد معروفی نے بچوں کی طبیعت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس مجموعے کو بھی بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں عیسوی مہینے کی خصوصیات اور ان مہینوں میں ہونے والی مختلف موسم کی تبدیلیاں اور بعض مہینوں میں پیش آنے والی تاریخی خوشیوں مثلاً اگست میں آزادی وغیرہ کو بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ ٹھنڈک، گرمی، خزاں، بہار، برسات وغیرہ جیسے موسم کی خصوصیات اور اس کے مفید اثرات، موسم اور انسان کا رابطہ، ہندوستانی موسم کی خوبیوں کو بڑے لطیف اور خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ کتاب ۵۵ ؍نظموں کے ساتھ ۸۳ ؍صفحات پر مشتمل ہے۔

☆☆☆

نام کتاب : یہ جسم وجاں — شاعر : انصار احمد معروفی
صفحات : 51 — قیمت : 20روپے
سال اشاعت : 2018ء — مطبع : لاہوتی پرنٹ ایڈز، دہلی-6
ناشر : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
تبصرہ نگار : فیضان جعفر علی

اس کتاب میں انصار احمد معروفی نے اپنے تجربات وتحقیقات کی روشنی میں بدن کے ہر عضو کو باریک بینی سے جانچ کر وسیع مشاہدے کی بنیاد پر اس کے افعال اور اہمیت کو واضح کیا ہے۔ بقول محترمہ رفعت النسا قادری ''ان کی ہر نظم میں ایک پیغام ہے، انداز بیان واضح، سلیس، صاف اور دل کو چھو لینے والا ہے، شاعر نے انسانی جسم کے اندرونی اعضا، پھیپھڑے، دل، غذا کی نالی، معدہ، آنت اور لبلبہ، دماغ وغیرہ کی فعالیت پر روشنی ڈالی ہے۔ تصویر بنانا، پانی پینا، کھانا کھانا یہ سب کام آسان نظر آتے ہیں لیکن ان کاموں میں بھی اعضا کی ہم آہنگی ضروری ہوتی ہے۔'' اسی طرح عمل تنفس کو بھی

سائنسی نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔ یہ کتاب ۲۵ ؍نظموں کے ساتھ ۵۱ ؍صفحات پر مشتمل ہے۔

☆☆☆

نام کتاب : یہ بدن کے حصے — شاعر : انصار احمد معروفی
صفحات : 55 — قیمت : 20روپے
سال اشاعت : 2018ء — مطبع : لاہوتی پرنٹ ایڈز، دہلی-6
ناشر : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
تبصرہ نگار : فیضان جعفر علی

اس کتاب میں انصار احمد معروفی نے انسانی جسم کے اہم اجزا مثلاً ہاتھ، پیر، سر، چہرہ، منھ، آنکھ، کان، ناک، انگلیاں، بال، گردن، گلا، ایڑی، پیشانی، ہتھیلی، ہونٹ، تلوے، ناخن، پنجہ اور ناف وغیرہ کے صفات وکمالات کو نظم کی صورت میں پیش کیا ہے اور ہر ایک عضو کی مفید سرگرمیوں اور کارکردگیوں کی طرف مفصل روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے بیس سے زائد اعضائے انسانی کو موضوع بنا کر 'یہ بدن کے حصے' ترتیب دیا ہے۔ ہر نظم میں ایک پیغام اور غور وفکر کے کئی پہلو مضمر ہیں۔ محاورں کا استعمال بڑی چابکدستی سے کیا ہے۔ انسانی اعضا کے تعلق سے اردو میں مستعمل محاوروں کے استعمال سے زبان کا لطف بھی ملتا ہے اور اعضا کی بدولت پند ونصیحت کی باتیں بھی حاصل ہوتی ہیں۔ یہ کتاب ۳۱ ؍نظموں اور ۵۵ ؍صفحات پر مشتمل ہے۔

☆☆☆

ادارۂ تحقیقات اردو و فارسی بہت جلد 'فیضان ادب' کا **رضا نقوی واہی نمبر** شائع کرنے جارہا ہے۔ قلم کاروں سے گزارش ہے کہ وہ اپنی گرانقدر نگارشات جلد از جلد روانہ فرمائیں تاکہ اس خصوصی شمارے کو دستاویزی صورت بخشی جاسکے۔ مضامین یا تخلیقات ان پیج یا ورڈ میں ٹائپ کر کے بھیجیں۔ (ادارہ)